ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

سالگرہ نمبر

جولائی ۸۸

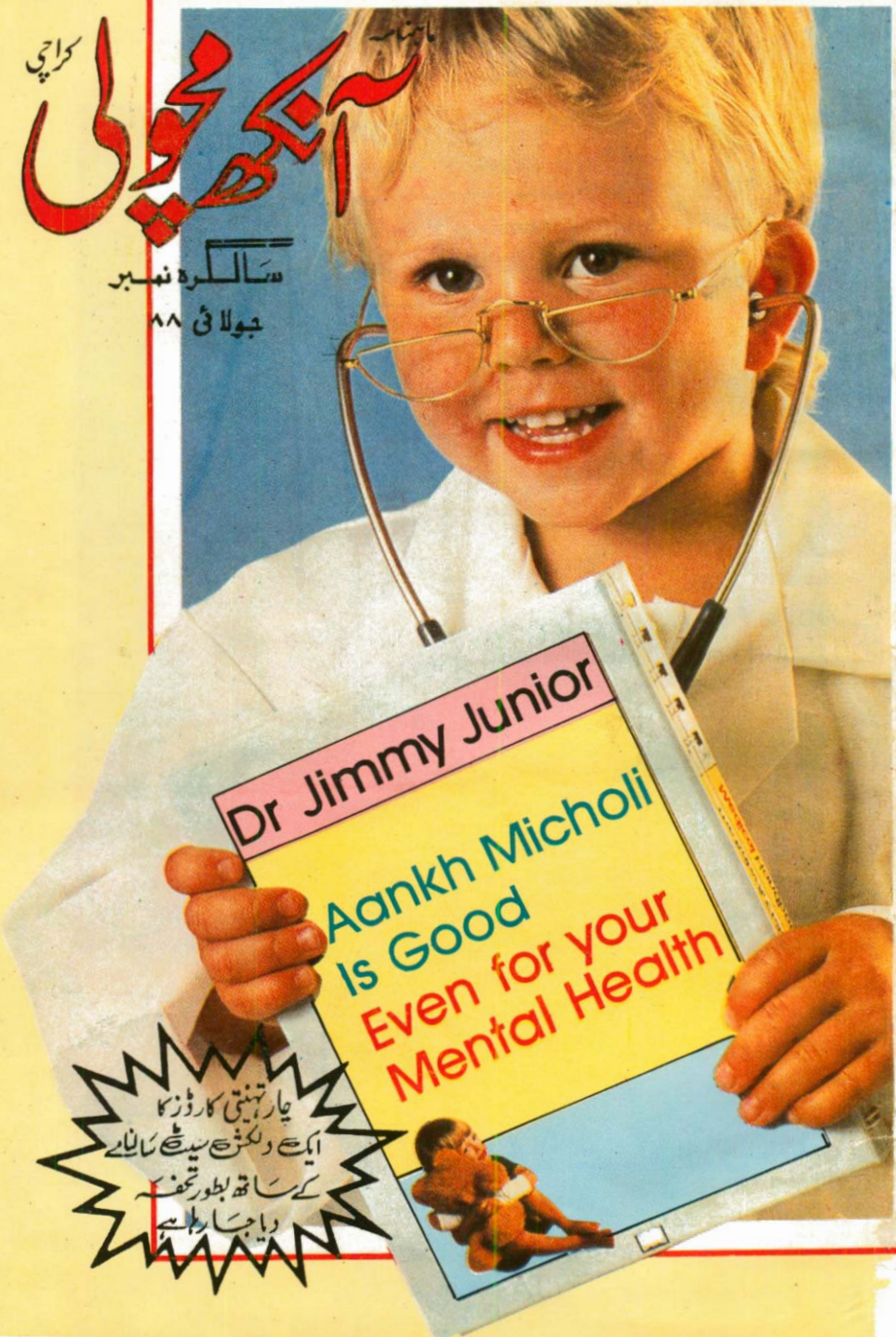

چار تہنیتی کارڈز کا
ایک دلکش سیٹ سالنامے
کے ساتھ بطور تحفہ
دیا جا رہا ہے

لیور برادرز کا
بلوبینڈ مارجرین
اب اور بھی مزیدار!
Blue Band
MARGARINE
لیور برادرز کا
بلوبینڈ مارجرین
لذت ہی لذت ۔ توانائی ہی توانائی

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

مُدیر اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

مُدیرِ مسئول

تجمّل حسین چشتی

مشاورت

مشفق خواجہ، امجد اسلام امجد

مُدیران اعزازی

طاہر مسعود

محمد سلیم مُغل

مجلسِ ادارت

شاہنواز فاروقی۔ سیّد خورشید عالم

خطاطی

عارف سعید

جلد ۳

شمارہ نمبر ۱

جولائی ۱۹۸۸ء

ذیقعدہ ۱۴۰۸ھ

قیمت ۱۲/ روپے

ماھنامہ

آنکھ مچولی میں

شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق

بحق ادارہ محفوظ ہیں، پیشگی

اجازت کے بغیر کوئی تحریر

شائع نہیں کی جاسکتی

گرین گائیڈ اکیڈمی

ادارہ اشاعت برائے

تعلیم و تعمیرِ سیرتِ اطفال

زیرِ سرپرستی

ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن

ماھنامہ

آنکھ مچولی

میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث

پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار

واقعات فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ

مماثلت کی صورت میں

ادارہ ذمہ دار

نہ ہوگا۔

ناشر

ظفر محمود شیخ

طابع۔ زاہد علی، مطبع۔ لاریب

پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ، کراچی

گرین

گائیڈ اکیڈمی

برائے خط وکتابت ۱۱۲۔ ڈی، نورس روڈ

ومقامِ اشاعت سائٹ، کراچی

نشانِ عظمت — ۱۰

خدا دیکھتا ہے نظم — حفیظ جالندھری — ۱۱

ڈاک ڈاک کس کی ڈاک — قارئین کے خطوط — ۱۲

اس ماہ کا نام کیسے پڑا — مولانا محمد شیخوپوری — ۱۵

واپسی — حنا خیری — ۱۷

کرفیو — شاہد جمیل — ۲۳

چراغ تلے — غلام رضا جعفری — ۱۶۲

رابرٹ رپلے — میاں میاں جعفری — ۱۶۹

اماں بشیراں — میرزا ادیب — ۱۷۷

ٹیوٹر نامہ — پروفیسر عنایت علی خان — ۱۸۲

کسی کام میں جی کیوں نہیں لگتا — ڈاکٹر شبیر زمان — ۱۸۷

ہوائی جہاز نظم — شبنم کموڑی — ۱۹۱

سبزیوں کا مشاعرہ — احمد حاطب صدیقی — ۵۹

کھٹے میٹھے — منتخب لطائف — ۶۷

آؤ گھومیں دنیا سفرنامہ — عبیداللہ کیہر — ۷۷

دھماکہ — اظہر نیاز — ۸۱

چور بھاگو — ایم افضل — ۸۸

گرمی نظم — پروفیسر عنایت علی خان — ۹۲

ہمشکل — علامہ قارئین — ۲۲۳

نمک پارے نظم — عارف شیلانی — ۲۲۸

روشنی کی کرن — طاہر قیصر — ۲۲۹

نئی تحریریں مختصر مختصر — ۲۳۵

آؤ ملائیں ہاتھ — مجھی دوستی — ۲۵۱

آمی ابو کا صفحہ — ۲۵۴

حُسنِ ترتیب

اتحاد کی برکت — راغب مراد آبادی — ۱۳۷

محاورے میں کہانی — رفاقت علی — ۱۳۹

تب اور اب — سیدہ خورشید عالم — ۱۴۳

ٹارزن کراچی میں — طاہر مسعود — ۱۴۹

بچی کتنی اچھی — حارث شمیم — ۱۵۹

بچے کی آرزو (نظم) — شفیع الدین نیر — ۱۶۱

چاند کا سفر — محمد سلیم مغل — ۲۹

طارق کہاں چلے؟ (نظم) — ۳۴

معذور کون — ۳۶

وہ مسلمان نہیں — ۴۱

اُف خدایا! — ۴۷

دانشمند کسان — ۵۴

تلاش (سلسلے وار ناول) — ترجمہ: آصف فرخی — ۱۹۳

اعداد اور معلومات — عقیل عباس جعفری — ۲۰۰

ننھے میاں کا چوزہ — ۲۰۵

ثانی میاں نے کہانی لکھی — عالیہ ممتاز — ۲۱۰

سوال در سوال — ابو اُسامہ — ۲۱۳

مجھے ابو سے شکایت ہے — ۲۱۸

بھائی کی محبت — ۹۵

پاکستان (نظم) — ۱۰۳

انوکھے لوگ — شان فاروقی — ۱۰۵

تعاقب — نعیم بیگ — ۱۱۳

انکل جانباز کے کارنامے — شاہد علی سحر — ۱۲۳

سائنس انکوائری — تنویر اقبال — ۱۳۱

manhattan PAKISTAN

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"آنکھ مچولی" سے آپ کی دوستی کا دوسرا سال بھی مکمل ہُوا۔

دوسرا سنگِ میل بھی عبُور ہوگیا۔ خیر سے آنکھ مچولی ۲ سال کا ہوگیا... اور اب اپنی دوسری سالگرہ پر "آنکھ مچولی" رنگوں کی نئی دھنک میں سج کر آپ کے پاس آرہا ہے۔

اسے دیکھیے۔ پڑھیے، موازنہ کیجیے اور پھر اپنے تئیں فیصلہ کیجیے کہ ہم "اچھے معیار" کے دعوے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں...؟ ہمیں اپنے متعلق کچھ اور اس لیے بھی نہیں کہنا کہ اپنی مدح سرائی خود ہمیں زیب بھی نہیں دیتی بلکہ ہم نے تو خود آپ کو دعوت دی ہے کہ آپ ہمیں ہماری خوبیوں اور خامیوں دونوں سے آگاہ کریں۔ تاکہ ہم آنے والے شماروں کو آپ کی آرا کی روشنی میں مزید بہتر بنائیں۔ اس سلسلے کا ایک سوال نامہ اس شمارے کے ساتھ منسلک ہے، ہمیں آپ کی جانب سے ان سوالات کے جوابات کا انتظار رہے گا۔

سالگرہ کے موقعے پر عموماً دوست احباب تحائف دیا کرتے ہیں، مگر دیکھیے، یہاں اس کے برعکس "آنکھ مچولی" آپ کو تحائف دے رہا ہے۔ تہنیتی کارڈز کا خوبصورت تحفہ ہم نے آپ کے لیے یوں بھی پسند کیا کہ ایسے کارڈز دوستوں کو یاد رکھنے اور باہمی محبتوں کو فروغ دینے کا باعث بنتے ہیں۔

نہ چاہتے ہوئے بھی ہم یہ ضرور کہیں گے کہ اس سالنامے میں آرٹ پیپر پر ۲۸ سے زائد رنگین صفحات دے کر ہم اپنا ریکارڈ خود ہی توڑ رہے ہیں، بچّوں کے اُردو جریدوں کی تاریخ میں ایسی کوئی اور مثال ملتی ہو تو ضرور بتائیے۔

آئندہ ماہ سے "آنکھ مچولی" کی قیمت میں معمولی سا اضافہ کر رہے ہیں، اب عام شمارے کی قیمت ۵ر کے بجائے ۶ر روپے ہوگی۔ ایسا اس لیے کرنا پڑا کہ کاغذ کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی قیمت نے ہمارے سامنے صرف دو راستے کھلے چھوڑے تھے (۱) اس کے معیار کو کم کر دیا جائے یا (۲) اس کی قیمت میں معمولی سا اضافہ کر دیا جائے۔ آپ ہی بتائیے، ان میں کون سا فیصلہ بہتر تھا...؟

قیمت کا ذکر آیا تو آپ سے یہ بات ضرور کہوں گا کہ جب بھی آپ ملتی جُلتی قیمت کی کوئی چیز خریدیں تو یہ ضرور دیکھ لیا کریں، کہ کون آپ کو زیادہ دے کر کم لے رہا ہے اور کون ہے جو آپ کو کم دے کر زیادہ لے رہا ہے...؟ یہ موازنہ آپ کو ٹھیک فیصلے تک پہنچنے میں یقیناً مدد دے گا۔

"آنکھ مچولی" سالنامے پر آپ کے بھرپور تبصرے کا انتظار رہے گا

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

نشانِ عظمت

بالآخر نوجوان شکاری نے ہرنی کے بچے کو زندہ پکڑ لیا اور اُسے گھوڑے پر بٹھا کر آگے کو چل دیا۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ ایک ہرنی اُس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ شکاری نے ہرنی کو ایک نظر دیکھا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی سی مسافت طے کرنے کے بعد گھڑسوار پھر رُک گیا اور پلٹ کر دیکھا۔ ہرنی اب بھی اُس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ ہرنی قریب آکر رُک گئی اور نوجوان کو ملتجی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو "میرے بچے کو آزاد کر دو"۔ نوجوان شکاری کو ہرنی کی آنکھوں میں ماں کی محبت نظر آئی۔ اُس نے ہرنی کے بچے کو آزاد کر دیا۔ بچہ رہائی پاکر خوش ہُوا اور چوکڑیاں بھرتا ہُوا ماں کے پاس جا پہنچا۔ ہرنی اپنے محسن کو تشکر آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔ نوجوان اپنے اس عمل پر بہت خوش تھا۔ آج وہ خالی ہاتھ ہی واپس لوٹ آیا تھا۔ مگر اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس نے بہت بڑی دولت پالی ہو۔

یہ نوجوان آگے چل کر غزنی کا حکمران بنا اور اُس نے اپنے کارناموں سے لوگوں کے دِل جیتے۔ ہم سب اس نیک دل حکمران کو سبکتگین کے نام سے جانتے ہیں۔

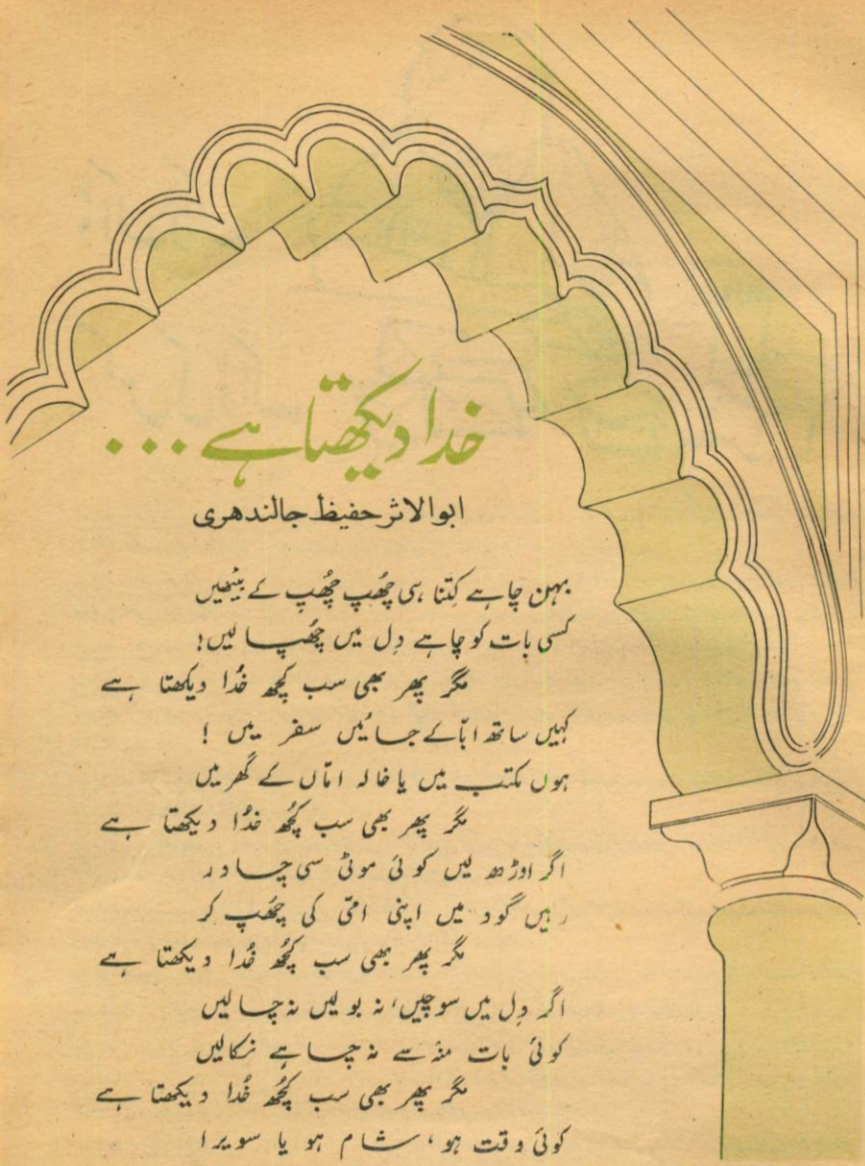

خدا دیکھتا ہے...

ابوالاثر حفیظ جالندھری

بہن چاہے کتنا ہی چھپ چھپ کے بیٹھیں
کسی بات کو چاہے دل میں چھپا لیں!
مگر پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

کہیں ساتھ ابّا کے جائیں سفر میں!
ہوں مکتب میں یا خالہ اماں کے گھر میں
مگر پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

اگر اوڑھ لیں کوئی موٹی سی چادر
رہیں گود میں اپنی امّی کی چھپ کر
مگر پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

اگر دل میں سوچیں، نہ بولیں نہ چالیں
کوئی بات منہ سے نہ چاہے نکالیں
مگر پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

کوئی وقت ہو، شام ہو یا سویرا
ہو دن کا اُجالا کہ شب کا اندھیرا
مگر پھر بھی سب کچھ خدا دیکھتا ہے

ڈاک ڈاک کس کی ڈاک

منیر احمد عامل ، لاہور ،۔ آپ نے آنکھ مچولی کے ساتھیوں کے لیے ایک خوبصورت پھول کاغذ پر بنایا اور فرمائش کی کہ اُسے عید مبارک کے ساتھ شائع کیا جائے۔ عید گزر گئی اور اب جو ہم نے اس پھول کو غور سے دیکھا تو یہ مُرجھا چکا تھا، مرجھائے ہوئے پھول کو کیا چھاپنا۔ رہی نظم تو اس کے بارے میں ابھی فیصلہ نہیں ہُوا۔

سید علی ذوالقرنین جگنو ، علی پور ،۔ جگنو میاں آپ کی نظم اور کہانی کے متعلق تو ہم بعد میں بتائیں گے کہ یہ شائع ہو گی یا نہیں۔ پہلے آپ یہ بتایئے کہ "قہقہہ نمبر" میں آپ کا جو دلچسپ مضمون "جگنو بمقابلہ ویسٹ انڈیز" شائع ہُوا تھا۔ اس کے متعلق بہت سے ساتھیوں نے شکایت کی ہے کہ یہ نقل شدہ ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ سچ سچ بتایئے۔

زاہدہ مون ، لاہور ،۔ مصوری کے لیے علیحدہ سے صفحہ شروع کرنے کی تجویز زیرِ غور ہے۔ اگر اسے شروع کیا گیا تو آپ کی پینٹنگ کو شکریے کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔

عباد علی سحر ناز ، لاہور ،۔ بھئی رسالے کو بہتر بنانے کے لیے آپ کے مشورے اچھے ہیں، لیکن آپ کی یہ شکایت درست نہیں ہے کہ "دائرہ معلومات" میں ہم لاہور والوں کو جان بوجھ کر انعام نہیں دیتے۔ چلیے اب تو یہ سلسلہ ہی ختم کیا جا رہا ہے۔ آپ ان دنوں بہت مصروف ہیں، یہ تو اچھی بات ہے۔ کیا آپ نے نہیں سُنا کہ خالی ذہن شیطان کا گھر ہوتا ہے۔

محمود محمد اشرف ، کراچی ،۔ آپ رسالہ شوق سے پڑھتے ہیں "شکریہ"۔ لطیفے اچھے ہوتے تو ضرور شائع ہوتے۔ اب آپ کا یہ خط چھاپا جا رہا ہے۔ کیونکہ فی الحال آپ کو خوش کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ ہمارے پاس نہیں۔

عمر علی بیگ ، اٹک شہر ،۔ ماشاءاللہ آپ نے بڑی تحقیق کی اور "نئی تحریریں" کی کہانی "ایک گونگا تین بہرے" کو سرقہ قرار دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اپنے لکھنے والوں کو نقل کرنے سے کس طرح روکیں۔ نقل تو وہی لوگ کرتے ہیں جن کے پاس عقل نہیں ہوتی۔

محمد عمران حیدر ، فیڈرل بی ایریا ، کراچی ،۔ بھئی دیکھیے آپ نے رئیس فروغ صاحب کی نظم "کلفٹن کی سیر" ہمیں بھیجی ہے وہ یوں تو ہے بہت اچھی لیکن بہرحال پہلے چھپ چکی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ خود کوئی اچھی سی نظم یا کہانی لکھ کر ہمیں بھیجتے۔

محمد مسعود ، گوجرانوالہ ،۔ مان لیا صاحب! لکھنے کے لیے کاغذ اچھا نہیں ملا تو کیا۔ بہرحال آپ کے خط میں خلوص کی خوشبو تو بسی ہوئی ہے، یہی بہت ہے۔ آپ کو شکایت ہے کہ رسالے میں مزاحیہ نظم نہیں ہوتی اور ہمیں آپ سے گلہ یہ ہے کہ آپ رسالہ غور سے نہیں پڑھتے۔ ہر ماہ کوئی نہ کوئی دلچسپ نظم ضرور شائع ہوتی ہے۔

رانا منصور احمد خان ، گوجرانوالہ ،۔ بھائی آپ کے خط کو ہم نے کئی بار غور سے پڑھا۔ اور ہمارا مشورہ یہ ہے کہ آپ فوری طور پر کسی نفسیاتی معالج سے رابطہ قائم کریں۔

عثمان خالد ، ملیر کینٹ ، کراچی ،۔ آپ کے تینوں سوالوں کے جواب حاضر ہیں (۱) آنکھ مچولی کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۸۶ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ (۲) اسکاؤٹ اسپیشل اپریل ۱۹۸۷ء میں شائع ہُوا تھا۔ (۳) "ٹارزن کراچی میں" یہ کہانی اتنی ہی حقیقی ہے جتنا خود ٹارزن کا کردار۔

نوید اعجاز ، حضرو ، ضلع اٹک ،۔ یہ بھی خوب کہا آپ نے کہ ہم صرف امیر بچوں کی ہی کہانیاں چھاپتے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ کل کلاں کو آپ یہ الزام نہ لگا دیں کہ یہ پرچہ بھی صرف امیر بچوں کے لیے ہے۔ خط کا جواب نہ دینے کی شکایت پر غصے میں ایسے الزامات لگانا بُری بات ہے۔ مگر اب تو آپ کا گلہ ختم ہو گیا ہو گا۔ کیوں!

دلاور زمان خان ، لطیف آباد ، حیدرآباد ،۔ جانوروں، پرندوں اور کیڑوں سے آپ کی محبت قابلِ رشک ہے۔ آنکھ مچولی میں جانوروں اور پرندوں کے بارے میں پہلے ہی باقاعدگی سے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ مشہور لوگوں سے تعارف موقع کی مناسبت سے ہم کراتے رہیں گے۔ اور "آیئے بنیں آرٹسٹ" کی فرمائش بھی جلد ہی پوری کی جائے گی۔

سلطان بشیر۔ اسلام آباد :۔ بہت خوب یہ آپ نے اچھا کہا۔ اے بھائی کیسی غلطی، کہاں کی غلطی۔ ڈھیروں خطوط آتے ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ آپ کو جواب نہیں دیا گیا۔ اداریہ اور دیگر تحریروں کی پسندیدگی کا شکریہ! امجد اسلام امجد تک آپ کی فرمائش پہنچا دی جائے گی۔ اطلاعاً عرض ہے کہ وہ کہانی نہیں، ڈرامہ اور شاعری لکھتے ہیں۔

عزت خان۔ ڈاکخانہ لنڈی ارباب۔ ضلع پشاور :۔ کہانی بھیجنے کے لیے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ اسی خط کے ساتھ کہانی بھی ارسال کر دیتے۔ آنکھ مچولی میں ساتھیوں کی تصویریں صرف "آؤ ملائیں ہاتھ" میں تعارف کے ساتھ شائع ہوتی ہیں۔

شفیق احمد موری۔ مقام نامعلوم :۔ اوہو! آپ تو بہت خفا ہیں۔ جبھی آپ نے یہ الزام بھی ہم پر دھر دیا ہے کہ ہم نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ میرے بھائی! یہی شکوہ پرانے لکھنے والوں کو ہے۔ آپ کی کہانی "پروفیسر" اگر اچھی ہوئی تو جلد شائع ہو جائے گی۔ اور آپ ناراض ہونے کے بجائے ہمیں اپنی نئی تحریریں بھیجیے۔

سید افضل شاہ۔ عزت آباد۔ مردان :۔ آنکھ مچولی کے ساتھیوں کی طرف سے آپ کو بھی جوابی عید مبارک۔ حالانکہ عید تو اب باسی در باسی ہو چکی ہے۔ آپ آنکھ مچولی کے لیے شوق سے لکھیں، لیکن جو بھی لکھیں، محنت سے لکھیں اور اچھا لکھیں۔

امان اللہ۔ لال چند باغ۔ میر پور خاص :۔ آپ البم پر ٹکٹ لگانے کا طریقہ کار معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی مکمل تفصیل آپ کو فروری ۸۶ء کے شمارے میں مل جائے گی۔ یہ شمارہ حاصل کرنے کے لیے آپ ۵ روپے کا منی آرڈر ارسال کر دیجیے ... اور کچھ؟

محمد عادل منہاج۔ نیو کراچی۔ کراچی :۔ آپ کی یہ تجویز کہ ناقابلِ اشاعت مضامین کی نہ سہی، قابلِ اشاعت تحریروں کی ہی فہرست شائع کر دیجیے۔ ایک دُکھے دِل کی صدا معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ تجویز ہے قابلِ غور، اور آپ کے مشورے کے مطابق ہم اس پر ضرور غور کریں گے۔ "انسان نے لکھنا کیسے سیکھا؟" ایک بے تُکی گپ ہے۔ جس میں کچھ سچ بھی ہے اور بہت کچھ گپ بھی ہے۔ انعامی مقابلوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اور ہاں! یہ بتائیے کہ آپ معلوماتی مضامین سے اتنے خوفزدہ کیوں ہیں؟

احسن فیروز۔ سمن آباد، لاہور :۔ جب سے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ ہم سے اور آنکھ مچولی، دونوں سے ناراض ہیں، طبیعت سخت پریشان ہے۔ نہ ہنسنا بولنا اچھا لگتا ہے، نہ گھومنا پھرنا۔ اب آپ کا خط چھاپ رہے ہیں کہ شاید آپ کی ناراضگی اور ہماری پریشانی دُور ہو۔ بھائی! "حق اسکواڈ" میں وہ ساری کہانیاں شائع نہیں کی گئی ہیں، جو آنکھ مچولی کی زینت بن چکی ہیں۔ لہٰذا بقیہ کہانیاں پڑھنے کے لیے آپ "حق اسکواڈ نمبر ۲" چھپنے کا انتظار کیجیے۔

افشاں تبسم۔ وہاڑی :۔ بھئی آپ اپنی لکھائی کے سلسلے میں خواہ مخواہ اتنی سنجیدہ ہو گئیں اور خط میں کوئی غلطی بھی نہیں ہے، لہٰذا ہم معافی کس بات کی دیں؟ یہ آپ نے بڑے راز کی بات پوچھی ہے کہ ٹارزن کی تصویر سچ مچ کے ٹارزن کی ہے یا کسی باڈی بلڈر کی؟ جس طرح ٹارزن ایک خیالی آدمی ہے۔ اُسی طرح یہ تصویر بھی محض خیالی ہے۔

کامران منیر، عمران منیر۔ رانا محمد طاہر۔ لیہ :۔ آپ اپنے خط کا جواب پاکر بہت خوش ہوئے۔ آپ کو خوش پاکر ہمیں بھی خوشی ہوئی۔ لیکن یہ پڑھ کر ہماری خوشی چھپت ہو گئی کہ مضمون "انسان نے لکھنا کیسے سیکھا؟" ایک رسالے میں پہلے شائع ہو چکا ہے۔ آپ از راہ کرم ہمیں فرصت میں اُس رسالے مہینے اور سال سے ہمیں مطلع کیجیے، تا کہ تصدیق ہو سکے۔

جناب یوسف۔ کوٹ سارنگ :۔ ہم نہایت افسوس سے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہیں کہ آپ کی بھیجی ہوئی کہانی "آنکھ مچولی" میں شائع نہیں ہو سکے گی، اور اس کی وجہ قطعی یہ نہیں رہی جیسا کہ آپ نے لکھا ہے، کہ ردّی کی ٹوکری کو آپ کا نام پسند آگیا ہے۔ ردّی کی ٹوکری ہمیشہ انصاف پسند ہوتی ہے۔ اُسے لکھنے والوں سے نہ محبت ہوتی ہے نہ بیزاری۔ وہ تو بس ردّی کی ٹوکری ہوتی ہے۔ ردّی کی ٹوکری سے دُور رہنے کی کوشش جاری رکھیے۔

محمد اسلم۔ نواب شاہ :۔ "نئے چراغ" کے عنوان سے ہم نے جو سلسلہ شروع کرنے کا اعلان کیا تھا، وہ ساتھیوں کی جانب سے معقول تعداد میں تعارف موصول نہ ہونے کی بنا پر اب تک شروع نہیں کیا جا سکا ہے۔ اب یہی سلسلہ "ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند" کے عنوان سے ذرا سی تبدیلی کے ساتھ شروع کیا جا رہا ہے۔ آپ چاہیں تو اس میں حصہ لے سکتے ہیں۔

مظہر لطیف بٹ۔ ادل موسنی :۔ آپ کی پہلی پہلی کہانی جو آپ نے ماشاء اللہ بہت دل لگا کر لکھی ہے اور اس کا عنوان ہے "ملاقات" کافی نہیں ہے۔ کچھ اور قلمی "ملاقاتیں" کیجیے۔

محمد راشد قریشی۔ ملیر۔ کراچی :۔ کہانی "تلاش" عام کہانیوں سے قدرے ہٹ کر ہے۔ شاید اسی لیے آپ کو پسند نہیں آئی۔ بہرکیف اب تو یہ سلسلہ ختم ہونے والا ہے۔ فوٹوگرافی پر معلوماتی مضمون "کرکٹ اسپیشل" اکتوبر ۱۹۸۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

ابو مظہر وڑائچ۔ جھیورانوالی۔ گجرات :۔ بھئی آپ نے جس لیٹر پیڈ پر ہمیں خط لکھا ہے، وہ ہمیں بالکل پسند نہیں آیا۔ اچھے ساتھی ایسے لیٹر پیڈ پر خط نہیں لکھتے۔ باقی آپ کو "دھماکہ" اور "تلاش" ناول پسند تو آئے لیکن ان کی قسطیں چھوٹی محسوس ہوئیں۔ اگر ہم ان کی بڑی قسطیں چھاپتے تو دوسروں کو شکایت پیدا ہوتی۔ بقیہ تحریروں کی پسندیدگی کا شکریہ۔

عبدالہادی۔ نورا ڈنی :۔ آپ ہمیں شوق سے کہانیاں بھجوائیے۔ اس کے بھجوانے کا کوئی خاص طریقہ نہیں ہے۔ بس کہانی لکھیے، کسی لفافے میں بند کیجیے، لفافے پر پتہ لکھیے اور قریبی ڈاکخانے میں ڈال دیجیے۔ کہانی اچھی ہوئی تو چھپ جائے گی۔ کہانیاں دوسری جگہ سے نقل نہیں کی جا سکتیں۔

سعدیہ صدیقی۔ لانڈھی۔ کراچی :۔ آپ کو آنکھ مچولی میں اپنی نظم دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آپ کا خوش ہونا ہمارے لیے باعثِ مسرت ہے۔ اب آپ نے بی بی سی (لندن) سے نشر ہونے والے جو دو نغمے بھیجے ہیں، شاید اُن کے سُننے اور نقل کرنے میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ دونوں نظمیں بے تاثر ہیں۔ اُمید ہے آپ ہمیں کوئی اور نظم ارسال کریں گی۔

شیر بہادر دُرّانی۔ میوا شاہ۔ کراچی :۔ بھئی آپ نے خوب لکھا اور ہم بھی جانتے ہیں کہ آپ کے لفافے بنانے کی کوئی کمپنی نہیں ہے اور آپ اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے ہمیں خط لکھتے ہیں، لیکن ایسی عجلت بھی کیا، ذرا صبر کیجیے۔ آپ کی کہانیاں محفوظ ہیں، لیکن ابھی پڑھی نہیں گئیں۔ اُمید ہے کہ اس جواب سے آپ کا ٹوٹا ہوا دل جُڑ جائے گا۔

سرفراز حسین زیدی۔ مقام نامعلوم :۔ چلیے، آپ کے بھی صبر کا پیمانہ لبریز ہو ہی گیا۔ لیجیے، آپ کے حکم کی تعمیل میں دو سطروں کا جواب حاضر ہے۔ ابھی آپ کو بہت مطالعے

اور مشق کی ضرورت ہے۔ کوشش جاری رکھیے۔ اچھی تحریریں چھاپ کر ہمیں ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔

عامر اعجاز۔ رابعہ بازار، ڈنگہ ،، او ہو! آپ تو بہت دل گرفتہ نظر آتے ہیں۔ آپ کا عید کارڈ موصول ہُوا تھا۔ آپ نے یاد رکھا، بہت بہت شکریہ۔ جہاں تک سوال آپ کی کہانیوں کے نہ چھپنے کا ہے، تو بھئی آپ کے لطیفے اور تراشے تو چھپتے ہی رہتے ہیں۔ کہانی بھی کسی دن چھپ ہی جائے گی، لیکن اُس دن' جب آپ ہمیں محنت سے کوئی بہت اچھی کہانی لکھ کر بھیجیں گے۔

الیسو رفیق زاہد۔ گوادر، مکران ،، آپ نے لکھا ہے کہ آپ چند مہینوں سے اس لیے غائب ہیں کیونکہ ہم آپ کی طرف سے سرد مہری برت رہے ہیں۔ بخدا' ایسا نہیں ہے۔ کراچی میں آج کل گرمی اتنی شدت کی پڑ رہی ہے کہ ہم چاہیں بھی تو سرد مہر نہیں ہو سکتے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ آپ کی تحریریں انتظار فرمایئے کی فائل کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ ان کا فیصلہ باری آنے پر کر دیا جائے گا۔

محمّد رضوان۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی ،، "آنکھ مچولی" کو بہتر بنانے کے لیے آپ کی تجاویز پر ہم نے بہت سنجیدگی سے غور کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر تجویزیں وہ ہیں، جن پر بچوں کے دیگر رسائل میں عمل کیا جا رہا ہے۔ پھر بھی ہمیں خوشی اس بات کی ہے کہ آپ نے نہایت خلوص اور محبّت سے مشورے دیے۔ لطائف کے شعبے میں بہترین لطیفے پر انعام دینے کا سلسلہ شروع کیا جا چکا ہے۔

نور الاسلام سحر۔ مکران ،، اللہ اکبر! کیسا زبردست عزم کیا ہے آپ نے کہ "جب تک میں زندہ ہوں "آنکھ مچولی" پڑھتا رہوں گا"۔ خدا آپ کو خضر کی عمر عطا کرے (آمین) آنکھ مچولی کے نام خط لکھنے کا مکمل پتہ صفحہ ۳ پر درج ہے۔ ہمیں سلسلے وار کہانی بھیجنے کے بجائے کیا ہی اچھا ہو اگر آپ مختصر کہانیاں یا مضامین بھیجیں۔ فی الحال تو آپ سالگرہ نمبر کا مطالعہ کیجیے۔ قہقہہ نمبر ۲، بھی کسی مناسب موقعے پر شائع کر دیا جائے گا۔

رقیہ آرزو۔ کوئٹہ ،، آپ نے سرورق پر اعتراض کیا ہے کہ یہ جاذبِ نظر نہیں ہوتا۔ ہمیں پتہ تھا کہ آپ اعتراض کریں گی۔ گزشتہ شمارے سے آنکھ مچولی کا ٹائیٹل اور اس کا انداز تبدیل کر دیا گیا ہے۔ آپ نے ڈھیر ساری اچھی اچھی باتیں لکھی ہیں' اُن سب پر ہم غور کریں گے اور آپ کے مزید نت نئے مشوروں کا انتظار رہے گا۔

ملکہ مجید، پشاور کینٹ ،، افسوس کہ ڈاک ڈاک میں خط کا جواب پانے کے لیے آپ نے منتیں اور مرادیں مانیں' سجدے کیے، نمازیں پڑھیں، لیکن بقول آپ کے ساری عبادتیں اور دُعائیں بیکار گئیں اور آپ کو جواب نہ ملنا تھا، نہ ملا۔ اچھی سی بہن! ہمیں واقعی بے حد صدمہ ہے۔ کاش! آپ اتنی عبادتیں اور ریاضتیں کسی اور بڑے مقصد کے لیے کرتیں، بہر کیف "مجھے ابو سے شکایت ہے" پر آپ کا یہ اعتراض ہے کہ بہت سے بچّوں کے ابو نہیں ہوتے اس لیے اس کا نام تبدیل ہونا چاہیئے' آپ کا یہ اعتراض درُست نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے بچّے بہت بلند حوصلہ ہوتے ہیں۔ وہ اس تلخ حقیقت کو قبول کر چکے ہوتے ہیں۔

عنبرین گلزار علی۔ کراچی ،، دائرہ معلومات میں اپنا نام نہ دیکھ کر آپ کو مایوسی ہوئی۔ حالانکہ اس میں مایوسی کی تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ قصّہ صرف اتنا تھا کہ اس میں فیصلہ قرعہ اندازی کے ذریعے ہوتا ہے اور اب تو ویسے بھی یہ سلسلہ ختم کیا جا چکا ہے۔

راسلم۔ نواب شاہ ،، بیچارے آپ اپنا تعارف شائع نہ ہونے پر پریشان ہو گئے۔ میرے بھائی۔ ہر مہینے ہمیں سینکڑوں بچّوں کے تعارف موصول ہوتے ہیں۔ سارے تعارف ایک ساتھ شائع نہیں کیے جا سکتے۔ آپ کا تعارف بھی اس طویل قطار میں شامل ہو چکا ہے۔ اب آپ کو صرف انتظار کرنا ہے۔

سنبل حسین، سرگودھا ۔ آنکھ مچولی کے جو شمارے آپ نے بذریعہ وی پی منگوائے ہیں۔ ان کے سلسلے میں عرض یہ ہے کہ ہم رسالہ وی پی نہیں کرتے۔ اس کے لیے آپ کو منی آرڈر بھیجنا ہوگا۔ اسی طرح آپ اپنے مطلوبہ شمارے حاصل کر سکیں گی۔

روبینہ حکیم الدّین قریشی، ملتان ،۔ سچ سچ سچ! سترہ مہینے سے آپ آنکھ مچولی کو کچھ نہ کچھ بھیج رہی ہیں اور ادھر سے کوئی پُرسانِ حال نہیں ہے۔ دوسرے رسالے والے آپ کو آنکھوں پر بٹھلاتے ہیں اور ہم آپ کی تحریروں کو پوچھتے بھی نہیں۔ بہن جی! اب آپ کی ان شکایتوں کا ہم کیا جواب دیں! لکھتی رہیئے کیونکہ لکھتے رہنے سے کچھ اور نہیں تو کم از کم خط تو اچھا ہو ہی جاتا ہے۔

محمّد سعید آفتاب، دوڑ، نوابشاہ ۔ بھئی واہ واہ! امتحان میں اتنی زبردست پوزیشن لانے پر ہماری طرف سے مبارکباد قبول فرمایئے اور ہو سکے تو اپنے خرچ پر ہماری طرف سے مٹھائی کھا لیجیے۔ آنکھ مچولی کے لیے آپ کی تجاویز نوٹ کر لی گئی ہیں، لیکن صرف تجویزیں دیں گے یا کوئی مضمون بھی لکھ کر بھیجیں گے؟

ندیم احمد ثاقب، بہاولنگر ۔ آپ کی تجویز پر انشاء اللہ ہم ہر ماہ کسی نہ کسی معروف شخصیت پر معلوماتی مضمون شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اس سلسلے میں آپ کسی سائنسدان کے بارے میں ہمیں کوئی دلچسپ معلوماتی مضمون ارسال فرمائیں۔

حمیرا عنبرین، محمّد جانس بب، ملتان ۔ ہمیں یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ لوگ سعودی عرب جا رہے ہیں اور یہ سوچ کر دُکھ ہوا کہ آنکھ مچولی سے آپ کا ساتھ چھوٹ جائے گا، لیکن آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ آنکھ مچولی اب سعودی عرب بھی جانے لگا ہے۔ لہٰذا آپ کی اور آنکھ مچولی کی جُدائی عارضی ہے۔

جاوید احمد لیاقت آباد، کراچی ۔ آپ کی کہانی "چھکّے کی کارستانی" ہم تک نہیں پہنچی۔ برائے کرم آپ اُسے دوبارہ بھیج دیجیے اور اپنے دل سے ہمارے سلسلے میں ہر قسم کی بدگمانی دُور کر لیجیے۔

محمد اسلم شیخوپوری

اس مہینے کا نام کیسے پڑا؟

ذی قعد

ذوالعقدہ اسلامی سال کا گیارھواں مہینہ ہے، ذوالعقدہ کے لفظی معنیٰ ہیں، بیٹھنے والا۔ اس ماہ میں عرب لوگ بیٹھ جایا کرتے تھے نہ لڑائی کے لیے نکلتے تھے نہ کسی دوسرے سفر کے لیے اس لیے اس مہینے کا نام ذوالعقدہ پڑ گیا۔ غالب خیال یہ ہے کہ چونکہ ذوالعقدہ سے اگلا مہینہ حج کا ہوتا ہے اس لیے اہل عرب حج کی تیاری اور دُور دراز سے آنے والے حاجیوں کے انتظامات کے سلسلہ میں مصروف ہونے کی وجہ سے اپنے گھروں پر ہی رہتے تھے۔ کیونکہ حاجیوں کی خدمت کو وہ اپنے لیے بڑا اعزاز سمجھتے تھے۔ ویسے بھی جن چار مہینوں میں لڑنا حرام تھا ان میں سے ایک ذوالعقدہ بھی تھا۔ اس لیے وہ اس مہینے میں ہر طرح کے جنگ و جدل سے باز آجاتے تھے۔ جن مہینوں میں لڑائی حرام تھی، ان کو حرمت والے مہینے کہا جاتا ہے، جو کہ یہ ہیں ذوالعقدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب۔ بعض عرب زمانہ جاہلیت میں ان مہینوں میں اُدل بدل بھی کر لیتے تھے، وہ اس طرح کہ اگر انھیں ضرورت محسوس ہوتی تو مثلاً ذوالعقدہ میں لڑائی کر لیتے تھے اور رمضان یا شعبان کے مہینے کو حرمت والا مہینہ بنا لیتے تھے۔ بعض اوقات ان کا سارا سال لڑائی میں گزر جاتا تو اگلے سال چار کے بجائے آٹھ مہینوں کو حرمت والے مہینے بنا لیتے تھے۔

نئی روایتوں کے امین ـــــ آنکھ مچولی کی ایک اور شاندار روایت

حیرت انگیز بچت اسکیم

ماہنامہ "آنکھ مچولی" ـــــ آپ کی علمی ضرورت بھی ہے ـــــ اور آپ کے ادبی ذوق کی تسکین بھی! اُسے باقاعدگی سے پڑھنے اور اس کے حصول کو آسان بنانے کیلئے ہماری **خصوصی بچت اسکیم** میں شامل ہو جایئے

اس میں مالی منفعت بھی ہے اور علمی فائدہ بھی، سب سے بڑھ کر یہ کہ رسالہ ہر ماہ آپ تک بحفاظت پہنچتا رہے گا۔

---

(۱۲) شماروں کی قیمت مع خاص نمبر اور سالنامہ۔ رجسٹرڈ ڈاک سے

۱۲۶ روپے بنتی ہے

مگر خصوصی بچت اسکیم کے تحت آپ کو صرف (۹۰) روپے ادا کرنے ہونگے

رسالہ ہر ماہ رجسٹرڈ ڈاک سے بھجوایا جائے گا۔

اگر آپ اس سالانہ خریداری بچت اسکیم میں شامل ہونے کے خواہشمند ہوں تو نیچے دیے ہوئے کوپن کو بھر کر ہمیں ارسال کر دیجئے

میں ماہنامہ آنکھ مچولی کی **خصوصی بچت اسکیم** میں شامل ہو رہا/رہی ہوں۔ سالانہ خریداری کے لیے مبلغ ۹۰/- روپے کا منی آرڈر ارسال ہے۔ میرے نام سال بھر کے لیے آنکھ مچولی جاری کر دیا جائے۔

نام _____

مکمل پتہ _____

رسالہ کس ماہ سے جاری کیا جائے _____

فون نمبر _____ دستخط _____

"خصوصی بچت اسکیم" ماہنامہ آنکھ مچولی۔ ڈی۔ ۱۱۲۔ نورس روڈ۔ سائٹ۔ کراچی ۱۶

حِنا خیری

واپسی

شبانہ سارے اسکول میں ہر دلعزیز تھی۔ وہ اسکول کی ہیڈ گرل تھی۔ اور میٹرک میں پڑھتی تھی۔ شبانہ کو ساری ٹیچرز بہت پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ نہ صرف پڑھائی میں بہت اچھی تھی بلکہ کھیل کود میں بھی برابر کا حصہ لیتی تھی۔ وہ بڑی خوش مزاج اور زندہ دل لڑکی تھی۔ ہر وقت ہنستی رہتی۔ اس کی باتیں بڑی مزیدار ہوتیں۔ لوگ اس کی سنگت میں بہت خوش رہتے۔ وہ سب کے کام آتی۔ اور ہر کسی کی مدد کرنے کو ہر وقت تیار رہتی۔ انہی خوبیوں کی وجہ سے سب اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ شبانہ کو خاص طور پر کرکٹ اور بیس بال سے لگاؤ تھا۔ جب وہ میدان میں آتی تو سب پہ چھا جاتی۔ چوکے چھکے مار مار کر دوسری ٹیم کا جلوس نکال دیتی۔ اسے نہ صرف اپنے اسکول کی طرف سے کئی انعامات ملے تھے، بلکہ دوسرے اسکولوں سے بھی وہ بے شمار

انعامات حاصل کر چکی تھی۔

چاہے کھیل ہو یا کوئی تقریری مقابلہ، سب میں وہ حصّہ لیتی تھی اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر ہمیشہ اوّل انعام کی مستحق قرار پاتی۔ اس کے کمرے کا سائیڈ بورڈ کپوں اور تمغوں سے بھرا پڑا تھا۔ جب وہ جوش میں بھری تقریر کرتی تو سارے ہال میں سناٹا چھا جاتا۔ خدا نے اسے ان تمام صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اچھی صورت اور اچھی آواز سے بھی سرفراز کیا تھا۔ اسکول میں ہونے والے محفلِ میلاد میں اُس نے کئی مرتبہ نعتیں پڑھیں اور ہر مرتبہ اوّل انعام کی حقدار قرار پائی۔ اس کی سہیلیاں مذاق میں اس سے کہتیں "بھئی شبانہ! تمہاری موجودگی میں انعام کوئی اور لے جائے، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔" ان تمام خوبیوں کے باوجود شبانہ میں نام کو غرور نہیں تھا۔ ورنہ انسان تو ایک نعمت کا بوجھ بھی نہیں سہار سکتا۔ خدا کی طرف سے عطا کی گئی نعمت کو اپنی خوبی سمجھ کر غرور کرنے لگتا ہے اور اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور افضل سمجھنے لگتا ہے۔

اُس روز شبانہ بھائی جان کے ساتھ اپنی سہیلی کے یہاں جارہی تھی کہ گاڑی موڑ سے اچانک سامنے آتے ہوئے ٹرک سے ٹکرا گئی۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ شبانہ دو دن کے بعد ہوش میں آئی تو یہ جان کر اس کی چیخیں نکل گئیں کہ اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی گئی ہے۔ ایکسیڈنٹ بہت شدید ہوا تھا۔ شبانہ کو گہرے زخم آئے تھے۔ اس کی دائیں ٹانگ اس بُری طرح کچل گئی تھی کہ اس کا ٹھیک ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے ڈاکٹروں نے باہمی مشورے کے بعد شبانہ کے گھر والوں کی اجازت سے اس کی ٹانگ کاٹ دی تھی۔ جس دل سے شبانہ کے ماں باپ نے ٹانگ کاٹنے کی اجازت دی، وہ تو وہی جانتے تھے۔ ان کے لئے یہ صدمہ بہت شدید تھا۔ خوش قسمتی سے شبانہ کے بھائی کو معمولی زخم آئے تھے۔ کئی دن اسپتال میں گزارنے کے بعد شبانہ گھر آگئی۔ اس کے ماں باپ، بہن بھائی، سب اس کی دلجوئی میں مصروف رہتے۔

شبانہ بالکل بدل گئی تھی۔ اسے کسی طرح یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا سانحہ پیش آچکا ہے۔ وہ اس طرح بلک بلک کر روتی کہ اس کے ماں باپ کے بھی آنسو نکل آتے۔ .... شبانہ کے سامنے وہ حتیٰ الامکان پرسکون نظر آنے کی کوشش کرتے اور طرح طرح سے اس کا دل بہلاتے لیکن جب شبانہ پر رونے کا دورہ پڑتا تو اُن سے بھی آنسو ضبط نہ ہوپاتے۔ شبانہ کو انہوں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ اُسے بتایا کہ ایسا کرنا بہت ضروری تھا۔ ورنہ اس کی جان کو خطرہ تھا۔ مگر وہ سر پٹخ پٹخ کر روتی اور کہتی "مجھے مر ہی جانا چاہیے۔ میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔"

شبانہ کی ساری بذلہ سنجی، اعتماد اور سوجھ بوجھ رخصت ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک جامد سناٹا چھا گیا

تھا۔ اس کے ہونٹ جو ہر وقت مسکراتے رہتے تھے اب مسکراہٹ سے ناآشنا نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھیں ہر وقت غم میں ڈوبی رہتیں۔ اُس کی پُراعتماد شخصیت ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ وہ حد درجہ چڑچڑی اور بدمزاج ہوگئی تھی۔ اس کے والدین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اُسے کس طرح سمجھائیں۔ جو شبانہ ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی تھی اب زندگی سے بیزار نظر آتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ سسکیاں لینے لگتی۔ اس کا مزاج ایک دم بدل گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر پاتی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی شبانہ ہے جس کی خوش مزاجی کے ہر جگہ چرچے تھے۔ اس کی طبیعت کی یہ تبدیلی ایسی حیران کن بھی نہیں تھی کیونکہ اس کے ساتھ گزرا سانحہ بھی کوئی معمولی نہیں تھا۔ سب لوگ اس کے لئے دُکھی تھے۔ جس کسی کو بھی اس بات کا علم ہوتا وہ یقین ہی نہ کرتا۔ شبانہ نے سب سے ملنا ہی چھوڑ دیا۔ اس نے گھر والوں سے سختی سے کہہ دیا تھا کہ اس سے کوئی ملنے کی کوشش نہ کرے۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔ اُس کے اسکول کی سب ٹیچرز اور سہیلیاں اُسے دیکھنے آئیں۔ لیکن اُس نے سب سے ملنے سے انکار کر دیا۔

کافی دن گزر گئے لیکن شبانہ کے شب و روز میں کوئی فرق نہ آیا۔ البتہ اس نے بات بات پر رونا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ سارا وقت اُداس رہتی۔ وہ کسی سے ملتی جلتی تھی، نہ ہی اسکول جاتی تھی۔ حادثے کے بعد سے تو اس نے اسکول کی کتابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اسکول کا ذکر آتے ہی اس کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی اور اُسے وہ زمانہ یاد آجاتا، جب وہ بے انتہا خوش رہا کرتی تھی۔ سارے اسکول میں بھاگتی پھرتی تھی۔ کبھی ریس میں حصّہ لے رہی تو کبھی چھکا لگا رہی ہے۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں، ہر جگہ اُس کی دُھوم تھی۔

وہ بیچارگی سے اپنے کمرے میں سجے بے شمار کپوں اور تمغوں کو دیکھتی۔ اسے یوں لگتا، جیسے وہ کپ اور تمغے بھی اُس کے دُکھ میں برابر کے شریک ہوں۔ اُسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ اُس کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا ہے اور نہ ہی وہ یقین کرنا چاہتی تھی۔ وہ حقیقت سے فرار چاہتی تھی۔ اُس کا دل اُس ذہن اس بات کو قبول نہیں کر سکے تھے۔ شبانہ کا دل کسی سے ملنے کو نہیں چاہتا تھا۔ وہ سوچتی کہ جب لوگ اُسے دیکھیں گے تو اس کا مذاق اُڑائیں گے۔ اس پر ہنسیں گے۔ اور اُس میں اتنی تاب نہ تھی کہ لوگوں کے تمسخر کا سامنا کر سکے۔

اُس کے والدین اور بہن بھائی اُسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ وہ سوچتی "اے اللہ میاں پہلے تو نے مجھے اتنی نعمتیں دی تھیں کہ لوگ مجھ پر رشک کرتے تھے مگر اے اللہ! اب تو نے کیا کر دیا ہے"۔ اور پھر وہ رونے لگتی۔ اب تو اس کی مصنوعی ٹانگ بھی لگا دی گئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ ہر وقت منہ لپیٹے بستر پر پڑی رہتی اُس نے اپنی امی سے بہت سی کتابیں اور رسالے منگوا لئے تھے۔ زیادہ تر وقت انہیں پڑھنے میں گزارتی تھی۔

ایک دن اُس نے ایک مضمون پڑھا جس میں بہت سے نابینا افراد کی تصویریں تھیں۔ شبانہ کا دل اُن کے لئے دُکھ گیا اُس مضمون میں تفصیل سے لکھا تھا کہ فلاں لڑکا اتنے سال کا ہے اور پیدائشی نابینا ہے مگر وہ پڑھتا بھی ہے۔ اور فلاں آدمی نوکری کرتا ہے۔ ان سبھوں میں یہ بات مشترک تھی کہ وہ کسی نہ کسی کام میں مشغول تھے۔ ہر کسی میں ایک عزم تھا حوصلہ تھا۔ وہ زندگی کی اتنی بڑی نعمت سے محروم ہونے کے باوجود زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے چل رہے تھے۔ اُن میں آگے بڑھنے کی لگن تھی ہمت تھی اور اُن میں سے ہر ایک کا ایک مقصد تھا۔ جوں جوں شبانہ پڑھتی گئی، اُس کا دماغ روشن ہوتا گیا۔ پہلے اُسے اُن کی بیچارگی پر ترس آرہا تھا مگر اب اس کے دل میں اُن کے لئے عزت اور احترام کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ لوگ کتنے عظیم ہیں جو کسی پر بوجھ بننے کے بجائے اپنے راستے پر خود بڑی ہمت اور حوصلے سے چل رہے ہیں اسے ہیلن کیلر کا خیال آیا، جنہوں نے نابینا ہونے کے باوجود ایک قابلِ رشک زندگی گزاری تھی۔ اُسے ایک امید کی کرن جگمگاتی ہوئی نظر آئی اور دل میں ایک سکون سا محسوس ہونے لگا۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ لوگ قابلِ رشک اور باعثِ تقلید ہیں، جو دنیا کو دیکھ نہیں سکتے۔ اس کی رنگینیوں سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے حوصلے نہیں ہارے۔ ان میں ہمت ہے، جوش ہے، ولولہ ہے، آگے بڑھنے کی لگن ہے ..... پھر اُسے اپنا خیال آگیا۔ وہ سوچنے لگی "میں بھی کیسی لڑکی ہوں میں نے اپنے بہن بہن بھائیوں کا کیا حال کر دیا ہے۔ میری وجہ سے وہ لوگ کتنے پریشان ہیں۔ کتنے دُکھی ہیں۔ اگر میں خوش رہوں تو ان کا غم بھی کچھ کم ہو جائے گا۔ گزرا وقت تو لوٹ کر نہیں آتا لیکن یہ تو انسان کے ہاتھ میں ہے کہ آنے والے کل کو اچھا بنائے۔ اس کے لئے محنت کرے۔ جو کچھ میرے ساتھ ہو چکا ہے، میں اس کی سزا اپنے ماں باپ کو کیوں دے رہی ہوں۔ دُکھی تو وہ میرے لئے ہیں ہی لیکن اگر میرا یہی حال رہا ان کا دل مزید پریشان ہو گا۔ اور پھر جب وہ لوگ، جو اس خوبصورت دنیا کو دیکھنے سے قاصر ہیں وہ تک عزم نہیں ہارتے، حوصلہ نہیں کھوتے تو مجھے بھی ہمت کرنی چاہیئے ..... ٹھیک ہے، اگر میں کھیل کود میں حصہ نہیں لے سکتی تو اور چیزوں میں آگے بڑھ سکتی ہوں۔ اپنے علم سے، اپنی تعلیم سے اپنے ماں باپ کا نام روشن کر سکتی ہوں اپنے اخلاق سے، اپنے کردار سے ایک مثالی لڑکی بن کے دکھا سکتی ہوں"۔

یہ فیصلہ کر کے شبانہ کے چہرے پر ایک روشن مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اگلے روز اس کی سہیلیاں اور استانیاں اسکول میں اس کی واپسی پر بے انتہا خوش تھیں اور شبانہ پہلے ہی کی طرح سب سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی۔

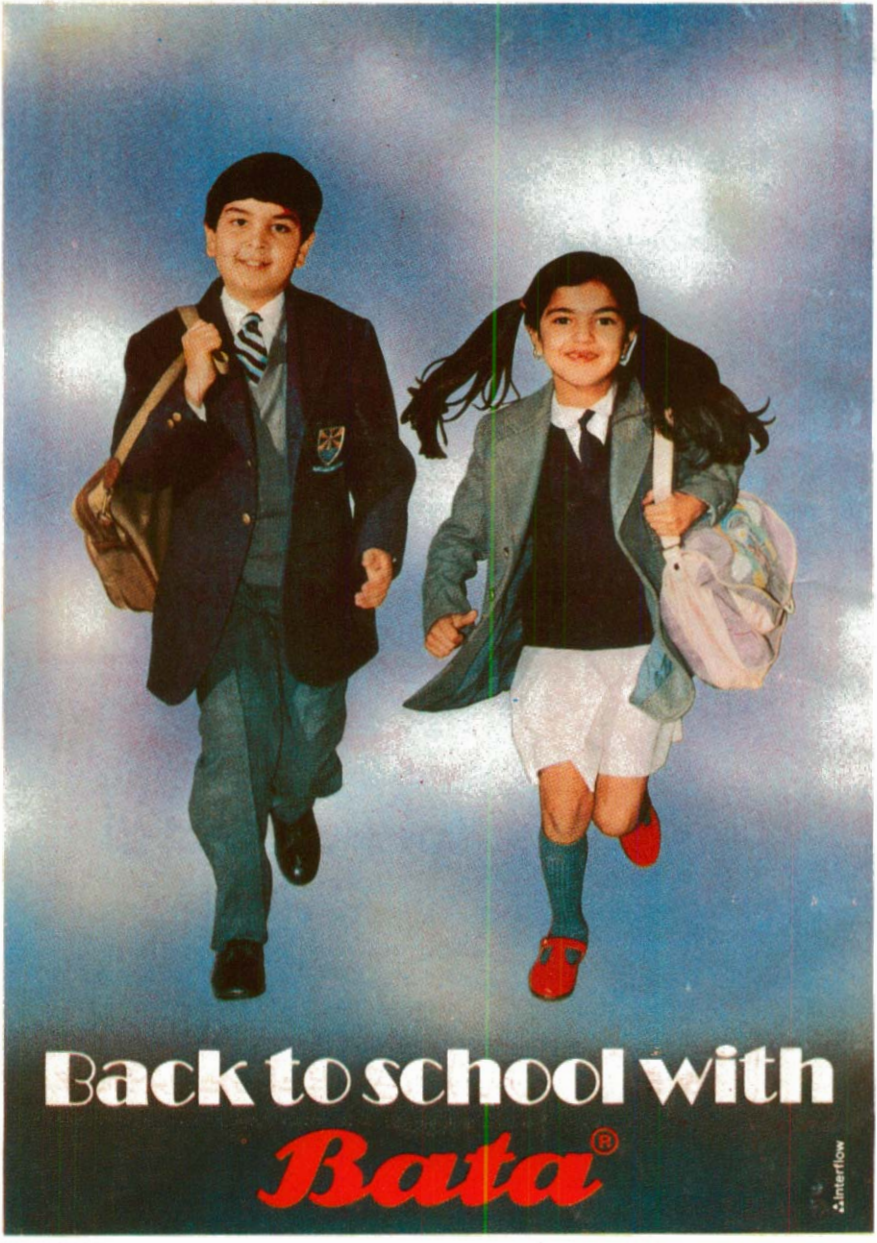
Back to school with
Bata®
Interflow

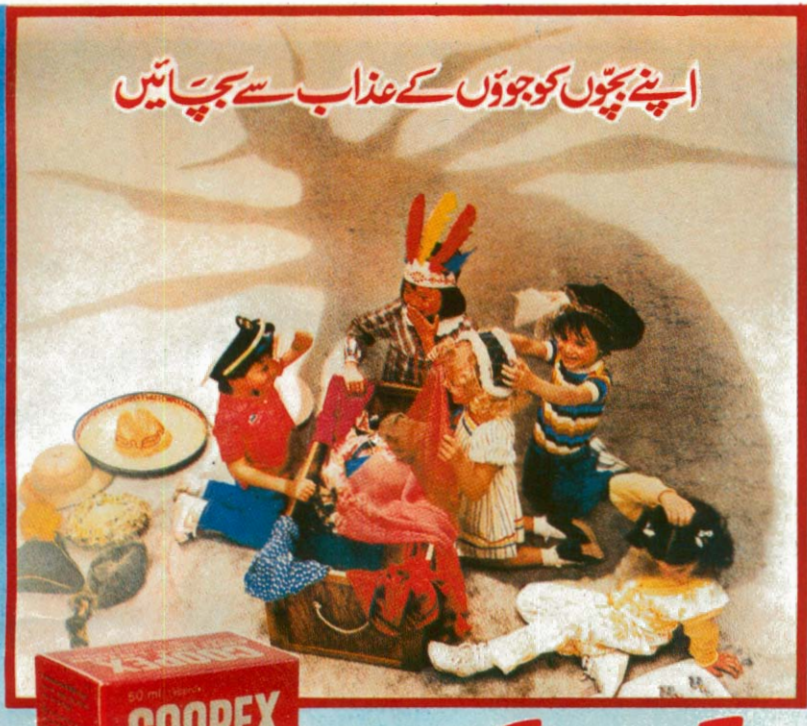

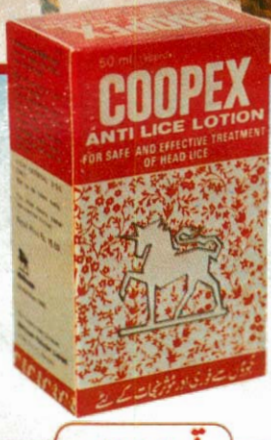

اپنے بچّوں کو جوؤں کے عذاب سے بچائیں
COOPEX
ANTI LICE LOTION
FOR SAFE AND EFFECTIVE TREATMENT OF HEAD LICE
کوپیکس
اینٹی لائس لوشن
استعمال کریں
کوپیکس اینٹی لائس لوشن بچّوں کی جلد اور بالوں کو نقصان نہیں پہنچاتی،
کوپیکس ڈی ڈی ٹی، بی ایچ سی، پروپوکسر، میلاتھیان اور اسی قسم کے
دوسرے مُضرِ صحت اجزاء سے پاک ہے۔
قیمت صرف
15.50
جوؤں اور لیکھوں سے مؤثر نجات کیلئے کوپیکس اینٹی لائس لوشن

شاہد جمیل

کرفیو

صبح کا وقت تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ کیا دکان، کیا مکان سب کے دروازے بند تھے لیکن میرے مکان کے بالکل سامنے جو ہوٹل تھا، اس کا دروازہ کھلا تھا کیونکہ اس کے پاس کرفیو کی نگرانی کرنے والی پولیس بیٹھی تھی۔ اور پولیس کو بھی بھوک لگتی ہے۔ پیاس لگتی ہے۔ اس لئے پولیس نے اس ہوٹل کو اپنے حکم سے کھلوا رکھا تھا اور اندر کی تمام کرسیاں باہر فٹ پاتھ پر بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ چائے پی رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے اور کرفیو لگا ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے مکان کی کھڑکی سے جھانک رہے تھے جھانکنے والوں میں زیادہ تر بچے، نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ پاس کے مکان سے ایک لڑکے نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر پولیس والوں سے پوچھا۔

"بات کرنا تو منع نہیں ہے، سپاہی جی؟"

سب موج میں تو تھے ہی۔ ایک بول اُٹھا۔ "اوئے نہیں بادشاہو! کوئی منع شنع نہیں ہے۔ بولو کیا بات ہے"؟

"آپ خیریت سے تو ہیں نا؟" لڑکے نے پوچھا۔

سپاہی نے پہلے تو آپس میں ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ جب کسی نے کچھ نہیں کہا تو بولا۔ "اوئے! خیر ہی خیر ہے!"

ان میں ایک کڑک مزاج سپاہی جواب تک خاموش تھا، ایکدم کڑک کر بولا۔ "اوئے اندر جاؤ۔ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں ہے!"

"میری بک بک اپنے لئے نہیں، آپ کے بھلے کے لئے تھی۔ آپ کے بھلے کے لئے!" لڑکے نے کہا۔

سب سپاہی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کڑک مزاج سپاہی نے پوچھا "ہمارے بھلے کے لئے کیا جی؟"

لڑکا اپنی گردن کھڑکی سے اچھی طرح نکال کر بولا۔ "میرے پاس ابھی شادمان ٹاؤن سے فون آیا ہے کہ وہاں پر سپاہی نہیں ہیں۔ کوئی پہرہ نہیں ہے۔ بلوائیوں کا زبردست جلسہ ہو رہا ہے۔ اور وہ سب پہلے اسی طرف آنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کے پاس کلاشنکوف بندوقیں، اور بم بھی ہیں۔ آپ کے پاس کوئی تیاری ہے اس محلے کو بچانے کی؟"

"پُتر تو نیچے تو اُتر!"

"کیوں سپاہی جی! کیا آپ مجھے گرفتار کرنا چاہتے ہیں؟"

"اوئے نہیں پُترے! تو نیکی کیتا اے۔ تو اڈے گرفتار؟ توبہ توبہ! نیچے آ تاکہ بات شات مشورہ شورہ ذرا ٹھیک ٹھاک ہو۔ اُتر نیچے۔ تواڈی مہربانی ہوگی۔"

لڑکا اتر کر نیچے آیا۔ سپاہیوں نے ہوٹل سے ایک اور کرسی منگوالی۔ اس پر لڑکے کو بٹھایا۔ اور دوبارہ اسی بات کو پوچھنے لگے۔ لڑکے نے کہا۔ "میرے پاس صرف ایک فون آیا تھا میرے دوست کا جس نے مجھے یہ بتایا ہے۔ میں نے آپ کو پیشگی یہ اطلاع دی ہے کہ آپ چوکس ہو جائیں۔ اور جو دفاعی سامان آپ کے پاس نہ ہو، اسے تھانے سے منگوالیں۔"

"اوئے تُو تو مخبر بہترین ہو سگدا اے بھئی" وہی کڑک سپاہی نرمی سے بولا۔

"دیکھو سپاہی جی! میں ہوں پڑھنے والا اسٹوڈنٹ۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں تمہیں خبریں پہنچایا کروں۔"

"نئیں نئیں! اے گل نئیں۔ تو چنگا پُتر ہے۔" پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "وائرلیس پر شادمان تھانے سے بات کرو۔"

دوسرے سپاہی نے شادمان تھانے سے بات کی تو وہاں سے جواب آیا۔ "ہمیں کوئی ایسی اطلاع نہیں ملی ہے۔ ویسے ہم فوراً معلومات کرکے بتاتے ہیں۔"

لڑکے نے کہا۔ "اچھا جی! اب مجھے پڑھائی کرنی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔"

"اوئے چار پیتا جا پُتر!" کہہ کر کڑک سپاہی نے لڑکے کو روک لیا۔ اور زور سے ہوٹل والے کو آواز دی، "اوئے مالواری! ایک چائے!"

"میں گھر پر چائے پی لوں گا۔ آپ نہ منگوائیں۔ بلکہ آپ کہیں تو آپ لوگوں کے لئے بھی چائے بھجوا دوں" اتنا سنتے ہی سب سپاہی ایک آواز ہو کر بولے۔ "زندہ باد پُتر! زندہ باد!"

لڑکا گھر میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے سے بھری ہوئی پیالیوں کی ایک ٹرے لے کر آیا۔ تو محبت میں سارے سپاہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایک ایک پیالی سب نے اٹھالی۔

اب یوں ہوا کہ دو دو گھنٹے بعد وہ لڑکا ہر سپاہی کو ایک ایک پیالی چائے اس طرح دے جاتا، جیسے مریض کو تھوڑی دیر بعد تیماردار دوا پلا جاتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد کڑک سپاہی نے نیچے سے آواز لگائی۔ "اوئے پُتر!"

لڑکے نے کھڑکی سے گردن نکال کر پوچھا۔ "ہاں سپاہی جی! کیا بات ہے؟"

"نیچے تکلیف کرو جی!" کڑک سپاہی کی آواز تھی، جواب نرمی سے آواز دے رہا تھا۔

لڑکا نیچے آیا ایک سپاہی نے اُسے کرسی دی۔ لڑکا بیٹھا تو کڑک سپاہی سرگوشی میں بولا۔ "شادمان ٹاؤن تھانے سے ابھی میرے پاس جواب آیا ہے۔ وہ کہتے ہیں، پولیس تو ہم نے چاروں طرف لگا دی ہے۔ لیکن اس کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ جلسہ ہو کہاں رہا ہے۔ تو مہربانی کرکے پُتر! یہ تو بتاؤ، جلسہ کہاں ہو رہا ہے؟"

"جی بات یہ ہے کہ مجھے بھی جگہ تو بتائی نہیں گئی"۔ بہت سوچتے ہوئے لڑکے نے کہا۔ "صرف اتنی اطلاع ملی کہ جلسہ ہو رہا ہے۔ اور ان کے ارادے خطرناک ہیں۔"

"اچھا تو ایسا کرو کہ اپنے دوست سے ہماری بات کرا دو فون پر" کڑک سپاہی نے کہا۔

لڑکا جلدی سے بولا۔ "ہاں ہاں آیئے گھر میں۔ میں ڈائل کر دیتا ہوں، آپ بات کریں۔"

کڑک سپاہی دو اور سپاہیوں کے ساتھ وائرلیس ہاتھ میں لے کر لڑکے کے ساتھ مکان کی پہلی منزل پر گیا۔ لڑکے نے فون ڈائل کرکے اپنے دوست سے ملایا۔ اور اپنے دوست کو پہلے بتایا۔ "میں نے تمہاری اطلاع اپنے محلے کے چیف پولیس افسر۔۔۔ کو دی ہے جو اس وقت کرفیو کی نگہبانی پر لگے ہوئے ہیں۔ ان کو تم سے اسی

اطلاع کے بارے میں بات کرنی ہے۔ جو تم نے جلسے کے بارے میں مجھے بتائی تھی۔ لو بات کرلو۔"

کڑک سپاہی نے پہلے تو بہت نرمی سے سلام کیا۔ اس کے بعد پوچھا۔" جی اطلاع کی مہربانی۔ مجھے ذرا یہ بتائیں کہ جلسہ ہو کہاں رہا ہے؟"

وہاں سے جواب ملا۔" جلسہ ختم ہو چکا ہے۔ یہ جلسہ رگھو دودھ والے کی دکان پر ہو رہا تھا۔"

کڑک سپاہی بولا۔" بس جی شکریہ۔ یہی معلوم کرنا تھا۔" پھر لڑکے سے کہنے لگا۔" میں ابھی ہیڈ کوارٹر فون کر دیتا ہوں۔ وہ خود تمام معاملات سے نمٹ لیں گے۔ کیوں جی؟"

"آپ بہتر جانتے ہیں جی!" لڑکے نے جواب دیا۔ اور لڑکے کے چھوٹے بھائی منّے نے تین کپ گرم چائے کے ساتھ نمک پارے لا کر سپاہیوں کے سامنے رکھ دیئے۔

کڑک سپاہی نے اپنی نوکیلی مونچھوں کو چٹکیوں سے مروڑتے ہوئے خوش ہو کر کہا۔" پُتر اس کی کیا ضرورت تھی؟"

لڑکے نے برجستہ جواب دیا۔" کرفیو کی کیا ضرورت تھی؟ اب کرفیو بھی تو لگا ہوا ہے نا؟"

اس پر کڑک سپاہی نے آسمان پھاڑ دینے والا ایسا قہقہہ لگایا کہ لڑکے کا منّا دودھ پیتا بھائی جو پاس کی مسہری پر سویا ہوا تھا، ڈر سے چیخ کر روتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ لڑکے نے بات جوڑتے ہوئے کہا۔" تو ضرورت سے پہلے تو حالات پیدا ہوتے ہیں۔ حالات سے پھر ضرورت پیدا ہو جاتی ہے۔"

یہ بات کڑک سپاہی کو پہلے پسند آئی۔ اس کے بعد دونوں سپاہیوں کو پسند آئی۔ کیونکہ نمک پارے کے ساتھ چائے کا گھونٹ پہلے کڑک سپاہی نے لیا تھا۔ اس کے بعد دونوں سپاہیوں نے۔ چائے اتنی زیادہ گرم تھی کہ تینوں بہت آہستہ آہستہ پی رہے تھے۔

لڑکا بولا۔" کرفیو میں چاروں طرف سناٹا ہو جاتا ہے۔ ایسے میں آپ لوگوں کے دل نہیں گھبراتے؟"

"کیوں نہیں جی؟ کیوں نہیں گھبراتے۔ تو علاج بھی تو اس کا ہمارے پاس ہوتا ہے۔" کہہ کر کڑک سپاہی نے اپنی جیب سے تاش نکال کر دکھایا۔

اسی دوران میں لڑکے کا چھوٹا بھائی گیند اور بلا گھماتا ہوا آیا اور کڑک سپاہی سے اپنی باریک آواز میں کڑک کر بولا۔" سپاہی جی! میں کرکٹ کھیل سکتا ہوں؟"

کڑک سپاہی پہلے تو کچھ نہیں سمجھا۔ پھر اپنے موٹے ذہن پر زور دے کر پوچھا۔" کہاں کھیلو گے؟ اس وقت تو کرفیو لگا ہوا ہے۔"

بچے نے کہا۔" میں نیچے والے کمرے میں کھیلوں گا۔ کرسی کا وکٹ فٹ پاتھ پر بناؤں گا۔ کمرے سے بولنگ کروں گا۔

آپ بیٹنگ کریں گے۔"

کڑک سپاہی کی شخصیت کے اندر جو بچہ سویا ہوا تھا، وہ جاگ گیا۔ اس کو جوش آگیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "جی تو میرا بھی چاہتا ہے پُتر! لیکن کیا کہ اس وقت میں ڈیوٹی پر ہوں۔"

"تو میں آپ کو ڈیوٹی چھوڑنے کے لئے تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔" بچے نے کہا۔

"پھر؟" کڑک سپاہی بچے کی طرح بے بس نظر آرہا تھا۔

"میں تو کہہ رہا ہوں، آپ کی کرسی ہے نا؟" بچے نے سمجھاتے ہوئے کہا، "اسی کرسی کو ہم وکٹ بناتے ہیں۔ آپ اس پر بیٹھے ہی بیٹھے چھکا لگا سکتے ہیں۔"

کڑک سپاہی نے دوڑ کر بچے کو بنے سمیت گود میں اٹھا لیا۔ اور تیزی سے لے کر نیچے آیا۔ اور سپاہیوں سے بولا۔ "دیکھو تم ادھر جاؤ۔ تم اُدھر جاؤ۔ اور جونہی سارجنٹ آتا دکھائی دے، سیٹی بجا دو۔ ٹھیک ہے؟" یہ کہہ کر اس نے دو سپاہیوں کو سڑک کے دونوں طرف سامنے نظر آنے والے چوراہوں پر بھیج دیا۔ جہاں سے کڑک سپاہی اور باقی سپاہی صاف نظر آرہے تھے۔ اس کے بعد وہ بچے کو لے کر سڑک پر آگیا۔ اس نے کرسی رکھ کر وکٹ بنائی۔ اور بچے کا بیٹ لے کر وکٹ پر کھڑا ہو گیا۔ بچہ گیند لے کر بھاگتا ہوا گیا۔ واپس دوڑتے ہوئے اس نے تیزی سے گیند پھینکی، کڑک سپاہی نے جوش میں آکر جو ہٹ لگائی تو گیند ایک مکان کی بالکونی میں جا گری۔ فوراً ہی اس مکان کے مرد، عورتیں اور بچے سب بالکنی میں پہنچ گئے۔ نیچے جھانک کر دیکھا تو عجیب سماں تھا۔ ایک بچہ بولنگ کے موڈ میں تو ایک سپاہی بلّا لئے بیٹنگ کے موڈ میں کرسی کو وکٹ بنائے کھڑا ہنس رہا ہے۔ بچے نے چیخ کر بالکنی والوں سے کہا۔

"میری گیند آپ کے ہاں گئی ہے۔ پھینک دیجئے۔!"

بالکنی والوں میں سے ایک نے چیخ کر خوشی سے کہا "ایک شرط ہے، تب گیند پھینکوں گا۔"

بچے نے پوچھا۔ "کیا شرط ہے؟"

دوسرے بچے نے کہا "میں بھی کھیلوں گا۔"

تیزی سے، جیسے اختیار اسی کا ہو، پہلا بچہ بولا۔ "کیوں نہیں کھلائیں گے۔ آجاؤ گیند لے کر نیچے۔"

یہ سننا تھا کہ دائیں بائیں آمنے سامنے سب بالکونیوں سے بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

"ہم بھی کھیلیں گے۔ ہم بھی کھیلیں گے۔!"

کڑک سپاہی نے بلند آواز میں جواب دیا۔ "آجاؤ! آجاؤ"

پھر تو فیلڈنگ بھی ہونے لگی اور باقاعدہ کرکٹ میچ شروع ہو گیا۔ ایک بچہ آنکھوں دیکھا حال بتا

رہا تھا۔ تو دوسرا بچہ سیاہ تختے پر اسکور لکھنے مصروف تھا۔ اور وہ دونوں سپاہی جن کو سڑک کے اگلے اور پچھلے چوراہے پر کھڑا کیا گیا تھا کہ سارجنٹ آتا ہوا تو سیٹی بجا کر اس کی آمد کی اطلاع دیں۔ دور سے ہی کرکٹ میچ کا مزا لے رہے تھے۔ اسی میں انہوں نے نہیں دیکھا کہ سارجنٹ آرہا ہے اور اچانک سارجنٹ پہنچ گیا۔ اور سپاہی سیٹی نہ بجا سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دور سے ہی اس نے سارا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا... اور تیزی سے گاڑی لے کر کرٹک سپاہی کے پاس پہنچ گیا۔ اور کرٹک سپاہی نے بلا پھینک کر جلدی سے سیلوٹ کیا۔ بچے بڑے خاموش ہو گئے۔ سکتے میں سب اپنی اپنی جگہ کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ کوئی وہاں سے نہیں ہٹا۔ سارجنٹ گاڑی سے نیچے اترا۔ کرٹک سپاہی سمیت جتنے سپاہی تھے، سب کی سانسیں اندر کی اندر اور باہر کی باہر تھیں۔ چپ کھڑے تھے۔ اتنے آدمی سڑک پر اور ایک دم سناٹا تھا۔ بالکل ویسا ہی، جیسا کرفیو کے دوران تھا۔ سارجنٹ بہت نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا کرٹک سپاہی کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر اس کا چہرہ غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بہت دھیمی آواز میں بولا۔

"تم کرکٹ کھیل رہے تھے۔"

کرٹک سپاہی نے اسی دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "یس سر!"

سارجنٹ نے پھر کہا۔ "میں تم کو کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ یہ کھیل قائد اعظمؒ کو بھی پسند تھا۔"

کرٹک سپاہی کے چہرے پر تازگی آنے لگی۔

پھر ایکدم سارجنٹ تیز بلند آواز میں بولا۔ "لیکن تم نے اپنی ڈیوٹی کے دوران یہ کیا ہے، اس لئے تمہیں سزا دی جا سکتی ہے۔"

کرٹک سپاہی کا چہرہ.... زرد ہونے لگا۔ پھر سارجنٹ دھیمے لہجے میں بولا۔ "لیکن جس طرح جھگڑا پیدا کرنے والے سچ سے امن پھیلانے والا جھوٹ اچھا ہوتا ہے اسی طرح اگر امن قائم کرنے والی کوئی بات قانون سے ہٹ کر بھی ہو تو اچھی لگتی ہے۔" اتنا کہہ کر سارجنٹ رک گیا۔ پھر آگے بولا۔ "لیکن مجھے پھر بھی افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ تم نے بہر حال قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ کرفیو کو توڑا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس سلسلے میں تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔" یہ کہہ کر سارجنٹ گاڑی پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

لڑکوں نے سپاہی کی طرف بیچارگی سے دیکھا، جس کا سر جھکا ہوا تھا۔ پھر سپاہی نے جانے کیا سوچ کر لڑکوں سے کہا۔ "آؤ جی۔ آؤ دوبارہ کھیلتے ہیں۔ اس سے امن قائم ہوتا ہے اور میری ڈیوٹی بھی یہی ہے۔"

تھوڑی دیر میں سارا علاقہ خوشی اور جذبات سے بھرپور نعروں اور آوازوں سے گونج رہا تھا۔ کرفیو سے جو خوف کی فضا پیدا ہوئی تھی وہ کب کی ختم ہو چکی تھی۔

چاند کا سفر

محمد سلیم مغل

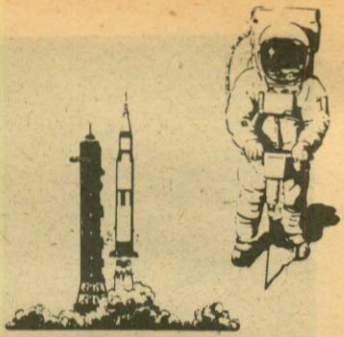

جب کوئی چیز انسان کی سمجھ میں نہ آئے تو اس کے متعلق کہانیاں بننا شروع ہو جاتی ہیں ۔ یہی کچھ بے چارے "چاند" کے ساتھ بھی ہُوا ۔ چاند کے متعلق بہت سارے حقائق منظرِ عام پر آنے سے قبل ہم سُنا کرتے تھے کہ چاند پر ایک دادی اماں رہتی ہیں جو ہر وقت چرخہ کاتتی رہتی ہیں ۔ ہندو دھرم میں تو زمین کو "ماں" یعنی "دھرتی ماں" اور چاند کو زمین کا بھائی یعنی "چندا ماما" آج بھی کہا جاتا ہے ۔ شاعروں نے بھی چاند کو ہمیشہ خوبصورتی سے تشبیہہ دی اور قصّہ گو اور کہانی نویسوں

یہ پُر عزم بچّہ بالآخر چاند پر پہنچا ۔ نیل آرمسٹرانگ کا بچپن

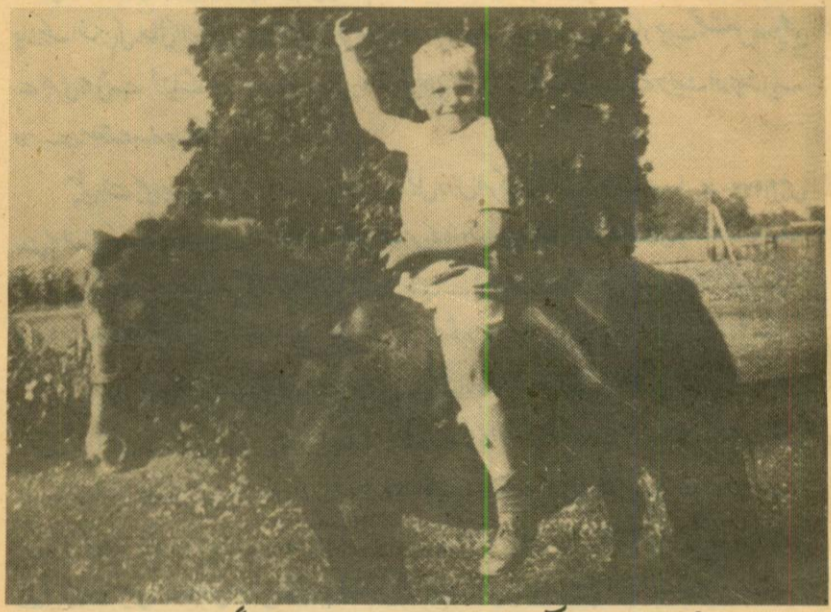

ذہین طالب علم ایلڈرن ۔ چاند پر قدم رکھنے والے دوسرے سائنسدان کا بچپن

نے بھی "چاند" کو ہمیشہ اپنا موضوع بنایا، لیکن چاند کیا ہے ؟ یہ حقیقت تو اس وقت سامنے آئی جب ۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء کو امریکی خلانورد نیل آرمسٹرانگ نے چاند کی سطح پر قدم رکھا اور دُنیا کو یہ بتایا کہ "چاند کی سطح تو جلے ہوئے کوئلے کی طرح ہے"۔ چاند تک انسان کی رسائی، انسانی تاریخ کا ناقابلِ فراموش واقعہ ہے، ایک ایسا واقعہ جس کی رُوداد حیرت تجسّس اور دلچسپی سے بھری ہوئی ہے۔ دُنیا کے دو بڑے ممالک روس اور امریکہ خلائی سائنس میں ایک دوسرے کے حریف اور ہمیشہ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں رہے ہیں۔

سچّی بات بھی یہ ہے کہ چاند پر انسان کی رسائی سے قبل روس، امریکہ سے ایک قدم آگے ہی رہا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں روس کا خلائی راکٹ لونا ۹، چاند پر اُتر چکا تھا، لیکن اس میں کوئی انسان یا جاندار نہ تھا۔ خلا میں جانے والا پہلا انسان یوری گیگارین بھی رُوسی تھا۔ خلا میں جانے والی سب سے پہلی عورت والنس تینا نیکولائیوا ترشکوا اور خلا میں جانے والی پہلی کُتیا "لائیکا" کا تعلق بھی روس ہی سے تھا مگر چاند پر پہنچنے والا پہلا انسان ایک امریکی تھا۔

۱۶ جولائی ۱۹۶۹ء کو کیپ کینیڈی سے خلائی جہاز اپالو گیارہ کو ایک طاقت ور راکٹ کی مدد سے فضا میں دھکیلا گیا۔ اس یادگار خلائی سفر کو دیکھنے کے لیے دس لاکھ سے زائد افراد سو ممالک سے زائد نمائندے اور ہزاروں سائنسدان کیپ کینیڈی میں موجود تھے۔ زمین کے مدار سے نکلنے کے بعد راکٹ پوری دنیا کو حیرت اور اضطراب میں ڈال کر چار ہزار دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے منزل کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس سفر کے علاوہ عملے کی حرکات زمین کے کنٹرول اسٹیشن کے ذریعہ لاکھوں لوگ اپنے ٹیلی ویژن سیٹ پر دیکھ رہے تھے

اِس خلائی سفر کے تین مسافروں میں پہلا نام نیل آرمسٹرانگ کا ہے جبکہ دوسرے ایڈون ایلڈرن اور تیسرے مائیکل

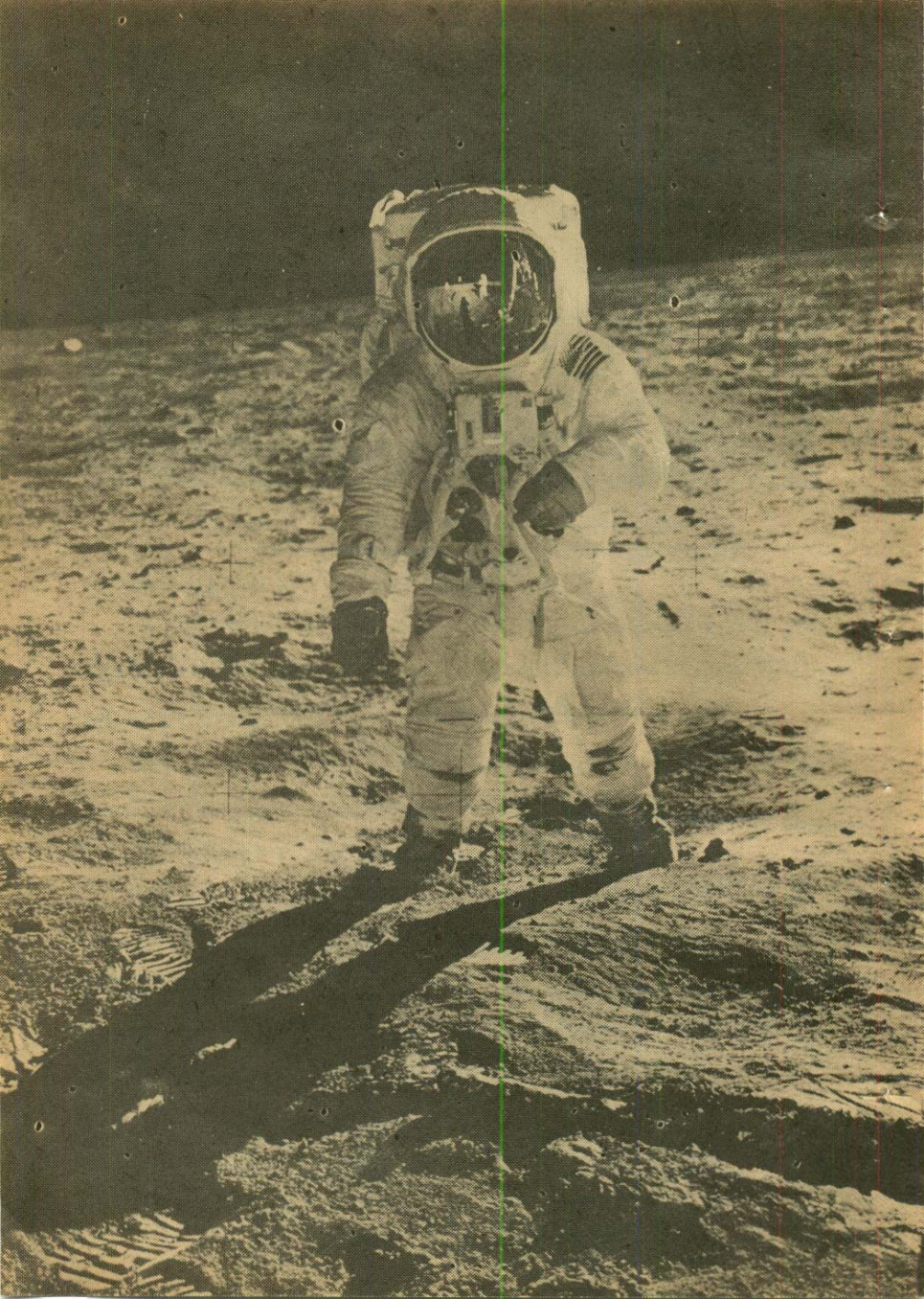

نیل آرمسٹرانگ اوران کے اسکول کے میوزک کلب کے ساتھی

کولنز تھے۔ یہ خلاباز آرام کرنے لگتے تو اپالو کا کنٹرول زمین پر کمپیوٹر سنبھال لیتے۔

۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء کی صبح خلائی جہاز اپالو کے راکٹ سے علیحدہ ہو کر چاند کے گرد چکر لگانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایگل نامی قمری گاڑی بھی راکٹ سے علیحدہ ہوئی اور جہاز سے آملی اور خلاباز قمری گاڑی میں منتقل ہو گئے۔ گاڑی کا جہاز سے ملنا اور خلابازوں کی منتقلی کا منظر زمین پر موجود لوگ حیرت اور خوشی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔

قمری گاڑی ۲۰ جولائی کی صبح چاند پر اُتر گئی۔ گاڑی اُترنے کے ٹھیک دس گھنٹے بعد یعنی ٹھیک گیارہ بج کر پانچ منٹ پر نیل آرمسٹرانگ نے چاند کی سطح پر قدم رکھا اور اپنے احساسات کو ان الفاظ کے ساتھ ادا کیا۔

"حقیر انسان کا اُٹھایا ہُوا یہ معمولی قدم نوعِ انسان کے لیے ایک جست ثابت ہوگا"

اس تاریخی واقعے کے ساتھ ہی زمین پر کروڑوں اربوں انسانوں کے منہ ناقابلِ یقین حیرت کے ساتھ کھلے رہ گئے۔

دوسرا خلاباز ایڈون ایلڈرن بھی ۲۰ منٹ بعد چاند کی سطح پر آیا جبکہ تیسرا خلاباز خلائی جہاز ہی میں رہا۔ دونوں خلابازوں نے ڈھائی گھنٹے تک چہل قدمی کی، امریکی پرچم لہرایا۔ دنیا کے سربراہان کے پیغام کی تختی نصب کی، پتھروں کے نمونے جمع کیے اور دیگر چند تجربات کے بعد قمری گاڑی کے ذریعہ واپس خلائی جہاز سے آملے۔ یوں واپسی کا سفر شروع ہوا، تینوں خلاباز پانچ ہزار پانچ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دو لاکھ چالیس ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے بخیریت بحرالکاہل میں اُتر گئے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ جس وقت اپالو گیارہ زمین کے کرۂ ہوائی میں داخل ہُوا اس وقت اس کی رفتار ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ تھی۔

بچّوں نے صدر ضیاالحق کو پہچان لیا!

واقعی ہمارے ساتھی بہت ذہین ہیں پچھلے شمارے میں ہم نے صدر ضیاءالحق کے بچپن کی ایک تصویر شائع کی تھی اور بچوں کو اُسے پہچاننے کی دعوت دی تھی۔ ساتھیوں کی اکثریت نے اس کا بالکل دُرست جواب دیا۔ البتہ کچھ ساتھی ایسے بھی تھے جو شخصیت کو نہیں بُوجھ سکے۔ اُنھوں نے اس تصویر کو علامہ اقبال اور حکیم محمد سعید کی تصویر قرار دیا۔ کچھ ساتھی اسے انڈونیشیا کے صدر سوہارتو اور تُرکی کے کمال اتاتُرک بھی سمجھ بیٹھے۔ درست جوابات بھیجنے والوں میں سے بذریعہ قرعہ اندازی جو ساتھی مُنتخب ہوئیں اُن کا نام ہے۔

بُشریٰ بشیر۔۔۔ آفیسرز فلیٹ، پولیس ہیڈ کوارٹر۔ حیدر آباد۔

ادارہ آنکھ مچولی کی طرف سے انعام حاصل کرنے پر آپ کو بہت بہت مبادکباد۔

شاہنواز فاروقی

طارق میاں

ابّو کی گود چھوڑ کے طارق میاں چلے
مشکل ہے اُن سے پوچھنا طارق کہاں چلے
پُوچھا تو منہ بسور کے رونے لگیں گے وہ!
دھپ سے پھر اُس کے بعد زمیں پر گریں گے وہ
ڈکرائیں گے وہ لیٹ کے پھر اتنے زور سے
مُردے بھی جاگ جائیں گے قبروں میں شور سے
رو رو کے پھر کہیں گے کہ مارا مجھے گیا
اللہ میاں ضرور تمھیں دیں گے اب سزا
سو اُن سے پوچھ گچھ کی کسی میں نہیں مجال
کہ اِس میں ہے ہزار بلاؤں کا احتمال
وہ جن کو بات بات پہ آتا ہے اشتعال!
آئیں سنائیں آپ کو اُن کی مہم کا حال

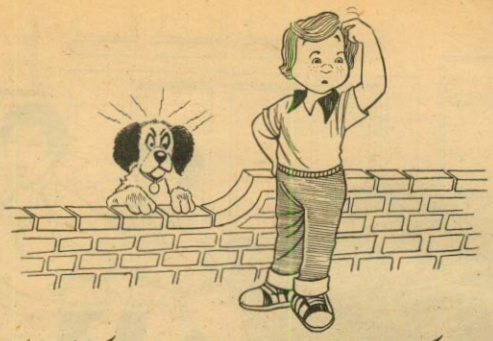

رُخ سے تو لگ رہا ہے کچن جائیں گے حضور
توڑیں گے وہ کچن کی ہر اک چیز کا غرور

پہلے کچن کی چیزوں کو دیکھیں گے سرسری
اُلٹیں گے اُس کے بعد پیازوں کی ٹوکری

پھر لے کے اک پیاز وہ ماریں گے تھال پر
اور ہنس پڑیں گے زور سے اپنے کمال پر

پوچھیں گے اُس کے بعد پلیٹوں کا حال چال!
چمچے کو مُنہ میں ڈال کے فرمائیں گے خلال

دہلیز پر کچن کی مگر رک گئے ہیں وہ!!!
گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے ذرا جھک گئے ہیں وہ

آئی ہے اُن کے جسم میں زوروں سے تھرتھری
یعنی کہ لال بیگ پہ اُن کی نظر پڑی

گھبرا کے کچھ پٹختے ہوئے اپنے پیر کو!
وہ چل پڑے ہیں خیر سے کمرے کی سیر کو

وہ یہ بھیے پہاڑ گرا دادی جان پر
اُن کی نظر پڑی ہے ابھی پاندان پر

چُونے کو پاندان کے چڑھنے لگا بخار
رونے لگا ہے خوف سے کتھا بھی زار زار

بی چھالیہ کے پیٹ میں اُٹھنے لگا ہے درد
تمباکو مارے خوف کے پڑنے لگا ہے سرد

لیکن گلی میں زور سے کتّوں نے بھونک کر
طارق میاں کے کھیل کو پہنچا دیا ضرر

سُنتے ہی بھونک حضرتِ طارق پلٹ گئے
یعنے سے ابّو جان کے آکر لپٹ گئے

عمران غیور

معذور کون؟

زاہد، راشد، اکرم اور راحیل چاروں گلی میں کرکٹ کھیل رہے تھے ادھر ایک لڑکا جو کہ اپنے ایک ہاتھ سے معذور تھا کھڑا تھا اس لڑکے کا نام مسرور تھا اس کا ایک ہاتھ ایکسیڈنٹ میں کٹ گیا تھا وہ انہیں کھیلتا دیکھ کر خود بھی خیالات میں ڈوب گیا اُسے وہ دِن یاد آ گئے جب وہ بھی گلیوں میں کھیلا کرتا تھا۔

"ارے وہ دیکھو مسرور آ گیا" زاہد نے مسرور کو دیکھ کر کہا "آؤ اُسے تنگ کرتے ہیں"۔ راشد بولا

"یہ بہت غلط بات ہے کیوں تنگ کرتے ہو اُس بیچارے کو۔ آخر کیا بگاڑا ہے اس نے تمہارا" راحیل بولا

"تم تو ہر وقت لیکچر جھاڑتے رہتے ہو۔ ہماری مرضی تمہیں کیا۔ اگر تمہیں بُرا لگتا ہے تو ہمارے ساتھ نہ آؤ" اب اکرم بھی بولا۔

"مگر خود سوچو کہ وہ کیا ہماری عمر کا نہیں ہے۔ کیا اُس کا دِل بھی ہماری طرح کھیلنے کو نہیں چاہتا ہو گا مگر بجائے اس کے کہ ہم اُسے اپنے ساتھ کھِلا کر اُس کا دِل خوش کریں ہم اُسے تنگ کر کے اس کا دِل توڑ دیتے ہیں"

"راحیل زیادہ لیکچر جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم اُس کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہو تو کھیل سکتے ہو۔ ہماری طرف سے اجازت ہے ہم نے تمہیں پکڑا ہوا تو نہیں" اکرم نے راحیل کو گویا خبردار کیا۔

"ارے جلدی چلو نا اُسے تنگ کرتے ہیں بڑا مزا آئے گا" راشد بولا اور اکرام اور زاہد بھی اس کے ساتھ ہو لئے۔ مگر راحیل وہیں کھڑا کچھ سوچنے لگا۔

وہ تینوں مسرور کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ مسرور اپنے خیالات میں گم صُم کھڑا تھا۔ اکرام نے پاس پڑا ہوا ایک چھوٹا سا پتھر اُٹھا کر مسرور کے مارا۔ مسرور فوراً اپنے خیالات کو توڑ کر اُن کی طرف متوجہ ہوا تو انہوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ "مسرور لُولا۔ مسرور لُولا۔ مسرور لُولا۔ لُولا ہا ہا ہا ہا" قہقہہ لگا کر وہ تینوں بھاگ گئے۔

مسرور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس کا دِل چھلنی ہو گیا۔ اچانک اس کے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا اُسنے پلٹ کر دیکھا تو یہ راحیل تھا۔ راحیل مسرور سے بولا "ان کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ یہ لوگ نادان ہیں اس لئے یہ ظاہری شکل پر جاتے ہیں سیرت کو نہیں دیکھتے"

"مگر یہ میری معذوری کا مذاق کیوں اُڑاتے ہیں اس لئے کہ انہیں اس چیز پر غرور ہے کہ معذور نہیں" مسرور نے روتے ہوئے کہا۔

"نہیں دوست یہ بھی معذور ہیں! ذہنی معذور۔ دِل کے مریض ان کے دِل میں دوسروں کے لئے کسی ہمدردی کا جذبہ نہیں ان کے ذہن انسانیت کی عظمت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مگر سب ایک سے تو نہیں ہوتے۔ میرے دِل میں تمہارے لیے جگہ ہے اگر وہ تمہارے ساتھ نہیں کھیلتے تو میں کھیلوں گا" راحیل مسرور سے بولا۔

"کیا تم کھیلو گے" مسرور کے روتے ہوئے چہرے پر اب مسکراہٹ آ گئی مسرور حیرت سے بولا۔

"ہاں دوست میں کھیلوں گا۔ اچھا تو پھر آج ٹھیک شام ۵ بجے ملیں گے" راحیل بولا۔

ابھی پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے مسرور اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا اور اسی جگہ کھڑے ہو کر راحیل کا انتظار کرنے لگا۔

مگر اُسے کھڑے کھڑے آدھا گھنٹہ ہو گیا مگر راحیل کا کہیں نام و نشاں تک نہ تھا وہ سوچ رہا تھا کہ "کیا راحیل نے بھی اس کے ساتھ جھوٹ بولا ہے؟ کیا راحیل بھی ایسا ہو سکتا ہے؟" مگر اس کا دل کہتا تھا کہ راحیل ایسا نہیں ہے۔

اچانک کسی نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ راحیل تھا۔ اس کے چہرے پر

مسکراہٹ آگئی۔

"تمہیں اتنی دیر کیوں ہوگئی۔ میں آدھے گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں" مسرور نے گویا راحیل سے شکوہ کیا

"کیوں دیر کیوں ہوگئی ابھی تو پانچ بجنے میں بھی پانچ منٹ ہیں"۔

راحیل ہنستے ہوئے بولا۔

"مگر میری گھڑی میں تو پانچ بجکر پچیس (۵ر بجکر ۲۵) منٹ ہوئے ہیں" مسرور بولا۔

"تمہاری گھڑی غلط ہوگی دوست میں تو ابھی ٹائم دیکھ کر آیا ہوں"۔ راحیل بولا۔

"چلو خیر میری گھڑی غلط ہوگی چلو کھیل شروع کرتے ہیں" مسرور راحیل سے بولا۔

"چلو ٹھیک ہے، جلدی سے وکٹ بناؤ" راحیل بولا اُسنے پاس پڑے ہوئے تین پتھر اٹھائے اور انہیں ایک مخصوص فاصلوں سے رکھ دیا گیند اور بلا راحیل اپنے ساتھ لے آیا لہٰذا کھیل شروع ہوا تو مسرور سے صحیح بیٹنگ نہ ہوسکی مگر وہ اچھی خاصی بولنگ کر رہا تھا کیونکہ اس کا سیدھا ہاتھ صحیح سلامت تھا آج وہ بہت خوش تھا کیوں کہ آج وہ دو تین سالوں کے بعد کھیل رہا تھا اور اُسے ایک اچھا دوست مل گیا تھا۔ خیر آج کا کھیل ختم ہوا اور راحیل اور مسرور اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔

اب روزانہ وہ دونوں شام کو اسی طرح کھیل کھیلتے۔ شروع شروع میں مسرور سے صحیح کھیل نہ کھیلا جاسکا اب وہ راحیل کی تیز بولوں پر بھی عمدہ شاٹ مارنے لگا تھا۔ آج راحیل کھیل کھیلنے نہیں آیا تھا کیونکہ کل اس کا امتحان تھا۔ لہٰذا آج پھر مسرور تنہا تھا۔ مسرور آج گھومتا ہوا اُسی جگہ آکر کھڑا ہوگیا جہاں آج سے پہلے وہ راشد، راحیل، اکرام اور زاہد کو کھیلتا دیکھتا تھا۔ آج بھی راشد، زاہد اور اکرام کرکٹ کھیل رہے تھے۔ مسرور اکیلا کھڑا اُن تینوں کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک اُونچا کیچ اُچھلا اور اکرام کیچ لینے کیلئے پیچھے بھاگا بھاگتے بھاگتے اکرام مسرور کے پاس پہنچ کر رُک گیا۔ وہ کیچ لینے میں اتنا مصروف تھا کہ اُسے یہ خبر نہ ہوئی کہ پیچھے سے کوئی گاڑی بھی آرہی ہے۔ وہ کیچ لینے ہی میں مگن تھا کہ مسرور بولا اکرام بچو!" مگر اب گاڑی اکرام کے بہت قریب آچکی تھی کہ اس کا بچنا مشکل تھا اچانک اُسے کسی نے زور دار ٹکر ماری اور وہ فٹ پاتھ پر جا گرا اور اسی وقت ایک دلخراش چیخ فضا میں بلند ہوئی اس نے پلٹ کر دیکھا تو مسرور گاڑی کے نیچے آچکا تھا۔ مسرور نے اکرام کی جان بچانے کے لئے اپنی جان قربان کردی تھی کیوں کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے کسی کو معذور ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اکرام فوراً مسرور کے پاس جا پہنچا اور بولا "مسرور بھائی مجھے معاف کردو میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی" جواب میں مسرور نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور مُسکرا کر ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

امریکہ کی ریاست ورجینیا کے رہنے والے جیرالڈ آرمینگ کے پاس دنیا کی سب سے طویل کار "شیورلیٹ" موجود ہے۔ جس کی لمبائی ۳۲ فٹ ۹ انچ ہے۔

دلچسپ ورلڈ ریکارڈز

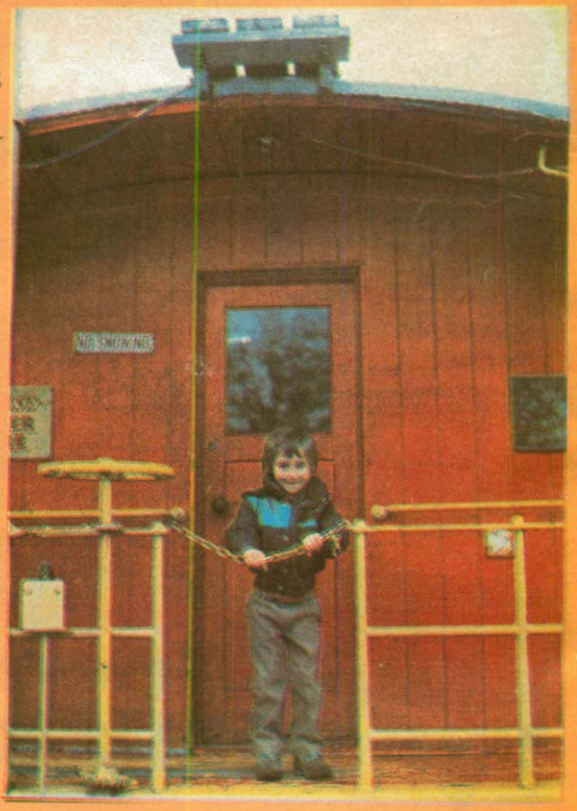

۹ سالہ جارج چیونسی انڈیانا (امریکہ) کا رہنے والا ہے۔ جارج چیونسی ۵ سال کی عمر میں دُنیا کے ۱۴۴ ملکوں کا دورہ کر چکا تھا جو ایک عالمی ریکارڈ ہے

The Perfect Combination
AHMED'S
Tomato Ketchup
AHMED
Taste of the tastiest tomatoes
—Ahmed Tomato Ketchup.

وہ مسلمان نہیں

محمد جاوید خالد

وہ جولائی ۱۹۴۳ء کی ایک گرم سہ پہر تھی۔ دن بھر کی گرمی کا زور اگرچہ ٹوٹ چکا تھا مگر دیوار و در اب بھی تپ رہے تھے اور کمروں میں بیٹھنا سخت دشوار تھا۔ حامد صاحب گھر پر ہی تھے۔ صحن میں چھڑکاؤ کرنے کے بعد انہوں نے چارپائی وہیں ڈال لی۔۔۔ اور نیم دراز ہو گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی گھر کے دوسرے افراد بھی وہیں جمع ہونا۔۔۔ شروع ہو گئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

"ارشد کہاں ہے؟" حامد صاحب نے سب پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "آج پھر اس کا کوئی میچ ہو گا۔ پتہ نہیں کتابوں سے کیوں چڑ ہے اسے، کھیل کے پیچھے تعلیم بھلائے بیٹھا ہے۔"

"وہ تو ٹاؤن ہال گیا ہوا ہے۔ آج جلسہ ہے نا!! اس کے انتظامات میں مصروف ہے۔" بیگم حامد نے جواب دیا۔

جہانگیر خان اور آنکھ مچولی

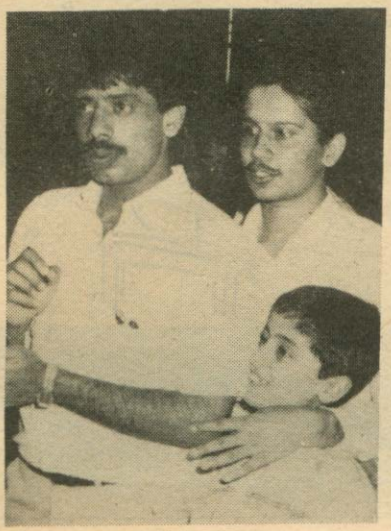

وہ جو، مسلسل چھ سال تک عالمی چیمپئن رہا۔
جو ناقابلِ شکست تھا ... اور ہے۔
فخرِ پاکستان ... فرزندِ پاکستان ... جہانگیر خان!

جہانگیر خان اب بچپن کی حدوں سے نکل کر دورِ جوانی میں داخل ہو چکے ہیں۔ مگر اپنا بچپن وہ بھولے نہیں ہیں۔ بچپن کا زمانہ بھلایا بھی نہیں جا سکتا۔ جہانگیر خان سے جب کوئی بچہ ملاقات کرتا ہے تو جہانگیر خان اپنے بچپن کے زمانے میں لوٹ جاتے ہیں اور بچے سے بچہ بن کر ملتے ہیں۔ اس تصویر میں بھی جہانگیر خان ایک بچے سے ملاقات کر رہے ہیں۔ بچوں سے انھیں کتنی محبت اور اپنائیت ہے، اس کا اظہار اس تصویر سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ وحید ظفر اور عارف سے انھوں نے نہ صرف دوستانہ ماحول میں گپ شپ کی، بلکہ "آنکھ مچولی" کے ٹائیٹل پر آٹوگراف بھی دیا۔ یہ آٹوگراف "آنکھ مچولی" اپنی طرف سے قارئین کو پیش کر رہا ہے۔ جہانگیر خان کا یہ تحفہ آپ کو یقیناً پسند آئے گا!

نازیہ رمضان

اُف خدایا

ہمیں ٹیچر بننے کا بہت شوق ہے اور یہ شوق اس وقت انتہا کو پہنچ جاتا ہے جب کلاس میں ہماری ٹیچر پڑھا رہی ہوتی ہیں۔ اور ہمارے دل سے ایک آہ نکلتی ہے جو کچھ اس نوعیت کی ہوتی ہے۔ "کاش! اے کاش۔ ہم بھی ٹیچر ہوتے۔ بچوں پر خوب رُعب جھاڑتے مگر کسی کو ہوم ورک نہ کرنے پر کبھی ڈانٹتے، نہ مارتے، اُف! کتنا مزہ آتا ... ہم بھی ان کے ساتھ کھیلتے ....."

ہمارے خیالوں کا تسلسل اُس وقت ٹوٹ جاتا، جب ٹیچر ہم سے سوال پوچھ لیتیں۔ ساتھیو! سن لیجئے کہ اس وقت ہمیں غصہ تو بہت آتا ہے اور ہم دل ہی دل میں عہد کرنے لگتے ہیں کہ ہم ٹیچر بننے کے بعد کبھی اپنی شاگرد سے بے وقت سوالات کرکے اس کے خوبصورت سپنوں کو چکنا چور نہیں

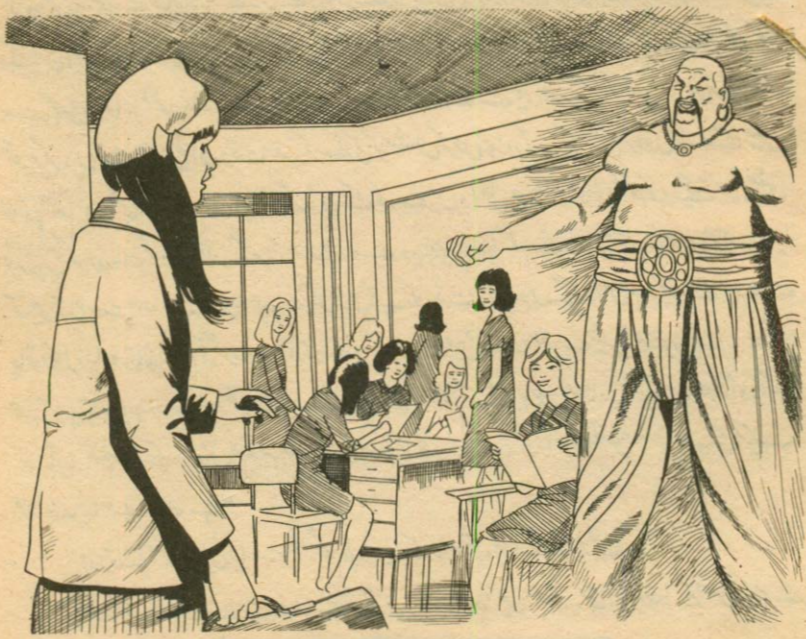

بیگم حامد کو علم تھا کہ اخبار گھنٹہ بھر سے پہلے نہیں آئے گا اور اسٹیشن پر آئے گا تو گھر میں بھی آجائے گا مگر انہیں کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی، خاموش رہیں۔

حامد صاحب دن چڑھے بہت دیر بعد لوٹے تو ان کے چہرے پر اطمینان تھا اور ہونٹوں پر "اللہ تیرا شکر ہے۔" ان کے یہ کلمات سُن کر گھر کے ہر فرد نے بے ساختہ کہا "اللہ تیرا شکر ہے۔"

"آپ نے دیر کر دی۔" آسیہ آپا نے پوچھا۔

"ہاں بھئی!" انہوں نے کہا۔ "میں اسٹیشن پہنچا تو کچھ ہی دیر بعد مرزا صاحب بھی آگئے۔ پھر شیخ صاحب پہنچ گئے۔ اسی طرح بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ اخبار آیا تو لوگ ٹوٹ پڑے۔ انہیں سمجھایا بجھایا۔ خبر پڑھی، تفصیل سنائی قائدِ اعظم ٹھیک ہیں اُن کا بیان بھی ہے۔ نماز تو خیر ہم لوگوں نے پہلے پڑھ لی تھی لیکن دوبارہ مسجد گئے اور شکرانہ ادا کیا۔"

"چلیں شکر ہے اللہ کا۔ اب ہمیں بھی تفصیل بتائیے۔" بیگم حامد بولیں۔

"ہاں ہاں!! کیوں نہیں!!" حامد صاحب نے جھٹ کہا۔ سب لوگ ان کے گرد بیٹھ گئے اور اُنھوں نے پڑھنا شروع کیا۔ "قائدِ اعظم بمبئی میں تھے کہ دوپہر کے وقت ایک اجنبی مکان میں داخل ہوا اور کہا کہ وہ قائدِ اعظم سے ملنا چاہتا ہے۔ بڑے دروازے پر پٹھان چوکیدار اجنبی کو لے کر قائدِ اعظم کے سیکریٹری کے پاس آیا۔ اجنبی نے سیکریٹری سے بھی یہی کہا کہ وہ قائدِ اعظم سے ملنا چاہتا ہے۔ سیکریٹری نے اجنبی کو بہت سمجھایا کہ قائدِ اعظم پہلے سے وقت مقرر کر کے لوگوں سے ملتے ہیں اور یہ کہ اگر آپ اپنی آمد کا مقصد تحریر کر دیں تو میں تاریخ اور وقت مقرر کرنے کی کوشش کروں گا اور آپ کو مطلع کروں گا۔ اتنے میں قائدِ اعظم کسی فائل کی تلاش میں اپنے سیکریٹری کے کمرے میں داخل ہوئے۔ قائدِ اعظم کو دیکھتے ہی اجنبی چیخ چیخ کر ان سے کہنے لگا کہ مجھے چند منٹ دے دیجیے۔ قائدِ اعظم نے انتہائی نرم لہجے میں جواب دیا کہ "میں آج بہت مصروف ہوں۔ میرے سیکریٹری آپ کو وقت دے دیں گے۔" اس پر اجنبی نے جیب سے چاقو نکال لیا اور قائدِ اعظم کی گردن پر حملہ کرنے کی نیت سے جھپٹا۔ قائدِ اعظم کے سیکریٹری اور چوکیدار نے اگرچہ حملہ آور پر قابو پا لیا تاہم قائدِ اعظم کے چہرے اور گردن پر زخم آئے۔ پولیس کو طلب کیا گیا اور حملہ آور کو گرفتار کر لیا گیا۔ تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ حملہ آور کا نام محمد رفیق ہے اور اس کا تعلق مسلم لیگ کی ایک مخالف جماعت سے ہے۔"

"اور قائدِ اعظم کا بیان کیا ہے؟" بیگم حامد اُن کے خاموش ہوتے ہی بولیں۔

"قائدِ اعظم نے اپنے بیان میں فرمایا ہے کہ اگرچہ یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ تاہم خدا کے فضل و کرم سے

مجھے کوئی شدید زخم نہیں آیا۔ میں اس وقت کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مگر مسلمانوں سے پُرامن رہنے کی اپیل کرتا ہوں۔ ہم سب کو شکر کرنا چاہیئے کہ میں معجزانہ طور پر بچ گیا ہوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ مجھ پر یہ بزدلانہ حملہ ایک مسلمان نے کیا ہے۔"

"ابّا جان!! اس بات کا کیا مطلب ہے کہ مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ مجھ پر یہ بزدلانہ حملہ ایک مسلمان نے کیا ہے۔" ارشد نے سوال کیا۔

"ہاں بیٹے یہی تو وہ سوچ ہے جس نے قائدِ اعظم کو قائدِ اعظم بنا دیا ہے۔" حامد صاحب نے کہا۔

"دیکھو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے کہ "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔" اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ نہ رہیں تو گویا اس نے مسلمان ہونے کا حق ادا نہیں کیا۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق سارے مسلمان خواہ وہ کہیں کے رہنے والوں ہوں اور کوئی زبان بولتے ہوں، ایک کنبے کی طرح ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ گھر میں کسی ایک کی تکلیف سے سارا گھر پریشان ہو جاتا ہے اور کسی ایک فرد کا نقصان ہو تو گھر بھر کو تکلیف ہوتی ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ جب مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروق رضؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا تو ہوش میں آنے پر انہوں نے کیا کہا تھا؟"

"جی ہاں!!" ارشد نے جواب دیا۔ "انہوں نے حملہ آور کا نام پوچھا تھا۔"

"اور نام سن کر انہوں نے کیا ارشاد فرمایا تھا؟" حامد صاحب نے پوچھا۔

"انہوں نے فرمایا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھ پر کسی مسلمان نے حملہ نہیں کیا۔" ارشد نے کہا۔

"بالکل" حامد صاحب پُرجوش لہجے میں بولے "یہی وہ سوچ ہے جس نے قائدِ اعظم کو ایک بڑا آدمی بنا دیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے۔" بیگم حامد بولیں۔ "کل جو میں نے سلیم کی امّی کو جلی کٹی سنائیں بُرا کیا۔"

"آپ نے ایسا کیا تو بہت بُرا کیا۔" حامد صاحب بولے۔ "آپ کو پہلی فرصت میں جا کر ان سے معافی مانگنا چاہیئے۔"

"مگر اوّل تو زیادتی انہوں نے کی تھی۔" بیگم حامد نے صفائی پیش کی۔

"کیا آپ کی بچی یا آپ کی حقیقی بہن ایسی ہی زیادتی کرتیں تو آپ انہیں ایسا ہی کہتیں؟"

حامد صاحب نے سوال کیا۔ بیگم حامد کچھ دیر خاموش رہیں۔ پھر وہ اٹھیں۔ برقعہ سنبھالا اور یہ کہتے ہوئے چل پڑیں کہ "جب میں نے غلطی کی ہے تو تلافی کے لئے پہلی فرصت کا انتظار کیوں کروں ابھی جاتی ہوں۔"

بچے بے ساختہ ہنس پڑے اور حامد صاحب کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان کے قیام کی قرارداد منظور ہو چکی تھی اور دوسری طرف مسلمانوں کے دشمن بھی کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ ان کی پوری پوری کوشش تھی کہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھے۔ اور مسلمان اپنے مقصد یعنی پاکستان کے حصول میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اِدھر مسلمانوں نے اس مقصد کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ اِن کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ تھی۔ جو پورے ہندوستان میں جلسے جلوس کر کے مسلمانوں کو منظم کر رہی تھی۔

حامد صاحب کو بیٹھے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ارشد ہانپتا ہوا گھر میں داخل ہوا اسکے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کچھ گرمی کی شدت سے اور کچھ اس کے دوڑتے آنے سے اس کا چہرہ لال سُرخ ہو رہا تھا۔"... وہ .... حملہ ہو گیا.... قائدِ اعظم".... بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں اس کے منہ سے بے ترتیب الفاظ نکل رہے تھے حامد صاحب ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"پہلے آرام سے بیٹھ جاؤ، اپنے اوسان ٹھیک کرو۔ پھر پوری بات بتاؤ۔ تم نے تو پریشان کر دیا۔" انہوں نے کہا۔

ارشد کی سانسیں ابھی تک درست نہیں ہوئی تھیں۔ لیکن اس نے رُک رُک کر اپنی بات پوری کر دی ——
—— بات کیا تھی بم کا دھماکہ تھی۔ حامد صاحب اچھل کر کھڑے ہو گئے بلکہ گھر کا کوئی فرد بھی بیٹھا نہ رہ سکا۔ ارشد نے جو بات بتائی وہ یہ تھی کہ —— "قائدِ اعظم پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے" "کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ قائدِ اعظم کیسے ہیں؟ مجرم کون تھا؟" حامد صاحب نے ایک سانس میں کتنے ہی سوال کر ڈالے مگر ارشد کے پاس کسی بات کا جواب نہ تھا۔

"مجھے بس اتنی ہی بات پتہ چلی ہے۔ تفصیل کا کسی کو بھی علم نہیں ہے۔" اس نے ندامت سے کہا۔

"اللہ خیر کرے.... اللہ انہیں اپنی امان میں رکھے.... میری ٹوپی دینا بھئی جلدی سے...." آخری الفاظ حامد صاحب نے اپنی بیگم سے مخاطب ہو کر کہے —— "میں مرزا کے ہاں معلوم کرتا ہوں۔ تم ایسا کرو۔" وہ ارشد کی طرف گھومے —— "شیخ صاحب کے ہاں چلے جاؤ ان کے پاس ریڈیو ہے دیکھو ان سے کچھ تفصیل پتہ چلے۔"

مرزا صاحب سے حامد صاحب کی ملاقات راستے ہی میں ہو گئی۔ انہیں بھی یہ خبر ابھی معلوم ہوئی تھی اور تحقیق کے لئے وہ حامد صاحب کے ہاں جا رہے تھے۔ دونوں دوستوں کو پریشان کھڑے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ارشد آتا نظر آیا۔

"ہاں بھئی! کیا خبر ہے؟" دونوں اس کی طرف لپکے۔

"شیخ صاحب کا ریڈیو خراب ہے۔ انہیں یہ اطلاع مجھ ہی سے ملی۔ وہ بھی بہت پریشان ہوئے ہمارے ہاں ہی آنے کا کہہ رہے تھے۔"

"ہاں میاں! پریشان کیوں نہ ہوں گے۔ پریشانی کی بات ہی ہے" مرزا صاحب آہستہ سے بولے۔

حامد صاحب نے کچھ نہ کہا اور ہولے ہولے قدم اٹھاتے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ مرزا صاحب بھی ساتھ تھے۔ گھر پہنچ کر ابھی بیٹھے ہی تھے کہ شیخ صاحب آ گئے۔ گفتگو کے لئے تینوں کے پاس ایک ہی موضوع تھا اور تینوں کو تفصیل کا کچھ علم نہ تھا تفصیل انہیں اس وقت کہیں سے بھی نہ مل سکتی تھی۔ چھوٹا سا قصبہ تھا شہر تک جانے ہی میں رات آدھی ہو جاتی۔ پھر سواری کا انتظام ندارد۔ بس ایک اُداسی تھی کہ چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ اندھیرا پھیلنے لگا نیند کسی کو بھی نہیں آ رہی تھی۔ سو طرح کے وسوسے تینوں کے دلوں میں اٹھ رہے تھے۔

"تم لوگ اب جا کے سو رہو" حامد صاحب بولے۔ "اللہ سے دعا مانگو کہ وہ اپنا فضل کرے۔ صبح کے اخبار سے ساری بات کا پتہ چل جائے گا" نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی مگر مرزا صاحب اور شیخ صاحب کا گھر پہنچنا بھی ضروری تھا۔ تینوں بے چینی میں خدا کو یاد کرتے جُدا ہوئے۔

حامد صاحب کو نیند ایک پل کے لئے بھی نہیں آ رہی تھی کبھی اس کروٹ ہوتے کبھی اس کروٹ۔ خاموشی میں بس چارپائی کے چُرمُرانے کی آواز آ رہی تھی۔ اس خاموشی کو بیگم حامد کی آواز نے توڑا۔ "اتنے پریشان تو آپ اس وقت بھی نہ ہوئے تھے جب آپ کے حقیقی بھائی حادثے میں زخمی ہو گئے تھے" انہوں نے کہا۔

"ہاں بیگم!! آپ ٹھیک کہتی ہیں" حامد صاحب بولے "میں اس وقت اتنا پریشان نہ تھا۔ اس کا معاملہ تو ایک شخص کا معاملہ تھا مگر بیگم!! قائدِ اعظم کا معاملہ پوری قوم کا معاملہ ہے۔ خدانخواستہ، خدانخواستہ اس وقت کچھ ہو گیا تو پوری مسلمان قوم افراتفری اور انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ مسلمانوں کا مقابلہ اس وقت دو قوموں سے ہے ایک انگریز دوسرے ہندو۔ ایک عیار ہے دوسری مکار۔ اور دونوں جی جان سے چاہتے ہیں کہ پاکستان نام کی کوئی چیز عالمِ وجود میں نہ آئے۔ قائدِ اعظم نے ان دونوں قوموں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ ان کی فطرت کو جانتے ہیں، ان کی چالاکیوں کو سمجھتے ہیں اور مسلمانوں میں اس وقت فقط وہی رہنما ہیں جو ان کی چالوں کا بہترین جواب دے سکتے ہیں اور اس نازک وقت میں جب پاکستان کے قیام کی قرارداد منظور ہو چکی ہے۔ قوم کو قائدِ اعظم کی سخت ضرورت ہے۔ اے اللہ!!... ان کی آواز بھرا گئی "اے اللہ!! قائدِ اعظم کو سلامت رکھ، میری عمر انہیں دے دے، اے اللہ..."

صبح کا اُجالا ابھی پوری طرح نہ پھیلا تھا بلکہ ابھی مؤذن نے نمازِ فجر کے لئے اذان بھی نہ دی تھی کہ حامد صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ شیروانی پہنی، ٹوپی سر پر رکھی، چھڑی سنبھالی اور چل دیئے۔

"کہاں چلے؟؟" بیگم حامد پیچھے پیچھے لپکیں۔

حامد صاحب نے رُکے بغیر جواب دیا "ریلوے اسٹیشن جا رہا ہوں اخبار دیکھنے کے لئے"

کریں گے۔

ہماری امی کہتی ہیں اگر ٹیچر بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو پڑھاؤ مگر جناب دو تین بھائی بہنوں کو پڑھانے میں وہ لطف کہاں جو ایک پوری کلاس کو پڑھانے میں ہے۔ (یہ اور بات ہے کہ چھوٹے بھائی کو پڑھانا ہمیں پوری کلاس کو پڑھانے سے کہیں زیادہ مشکل لگتا ہے۔)

آخر کار بڑی منتوں سے گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران اسکول میں پڑھانے کی اجازت حاصل کی۔ ایک قریبی اسکول میں دو مہینے کی عارضی ملازمت کے لئے درخواست دی۔ جب اس کے جواب میں ہمیں انٹرویو کے لئے بلایا گیا تو خوشی کے مارے ہمارے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ ساری رات ہم نے آنکھوں میں کاٹی۔ خوب سنیے دیکھیے کہ جب ہم کلاس میں داخل ہوں گے تو تمام بچے ہمارے احترام میں کھڑے ہو جائیں گے جیسے ہم اپنی مس کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر ہم سب بچوں سے باری باری ان کے نام پوچھیں گے اور پھر کیا کریں گے۔؟ .... ارے ہاں ہمیں ان سے یہ بھی تو پوچھنا ہوگا کہ انہوں نے کتنا کورس پڑھا ہے۔ اچانک اس کیس کے تاریک پہلو.... کی طرف ہمارا ذہن چلا گیا اگر.... اگر ہمیں ملازمت نہ ملی تو.... نہیں نہیں ایسے بُرے خیالات کو ذہن میں جگہ نہیں دینی چاہیئے۔ انشاءاللہ ہماری خواہش ضرور پوری ہوگی۔

آخر ہم دوسرے دن انٹرویو کے لئے پرنسپل کے کمرے میں پہنچے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ بات کس طرح شروع کی جائے۔ ہم دیوار سے لگے کھڑے رہے پرنسپل نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا "جی فرمایئے؟" ہم اس غیر متوقع سوال پر گھبرا گئے اتنے نروس تو کبھی ہم کلاس میں اپنی ٹیچر کو جواب دیتے ہوئے بھی نہ ہوئے تھے۔ اپنی بات کا جواب نہ پا کر وہ دوبارہ گویا ہوئیں "آپ کس سلسلے میں تشریف لائیں ہیں۔؟"

ہم نے اپنی تمام تر قوتِ ارادی کو جمع کیا اور کہنے لگے "جی وہ میڈیم....! ہمیں آج انٹرویو کے لئے بلایا گیا ہے۔!"

"انٹرویو! ٹیچنگ کے لئے انٹرویو.... آپ ٹیچنگ کریں گی۔؟" انہوں نے سر تا پیر تک ہمارا جائزہ لیا۔ ان کی معنی خیز مسکراہٹ نے ہمارے شوق کی چنگاری کو ہوا دے کر شعلہ بنا دیا۔

"میڈم.... میں انٹرویو کے لئے حاضر ہوئی ہوں.... مجھے یقین ہے کہ میں بچوں کو بہتر طور پر پڑھا سکوں گی۔"

"اچھا ... تشریف رکھیے" میڈم نے کہا اور ہماری فائل پر جھک گئیں کچھ دیر بعد کہنے لگیں۔
"یہ تو آپ اپنی رپورٹ کارڈ لے آئی ہیں آپ کے پاس تو میٹرک کا سرٹیفکیٹ تک نہیں ہے پھر آپ کو کیسے یہ ملازمت مل سکتی ہے؟ ٹیچنگ کوئی بچوں کا کھیل تو نہیں ہے!"
اپنے خوابوں کو یوں ٹوٹتے دیکھ کر ہمارے لہجے میں دردمندی آگئی۔ "میڈم میں بڑی آرزوؤں کے ساتھ آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ لوگ صرف بڑی ڈگریوں کو دیکھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات ڈگری یافتہ بھی حقیقتاً بالکل جاہل ہوتے ہیں ..... "
پرنسپل نے کہا" دیکھئے آپ کو عارضی ملازمت چاہیئے اور ویسے بھی آپ کلاس میں مضامین نہیں پڑھا سکتیں ..... آپ کا تقرر عارضی ٹیچر کی حیثیت سے کیا جاتا ہے آپ کو مختلف کلاسوں میں فری پیریڈ کے دوران بچوں کو کنٹرول کرنا ہوگا۔" مارے خوشی کے ہماری چیں نکل آئی۔ جیسے جلدی سے اندر کرنے کے بعد ہم نے پرنسپل صاحبہ کا شکریہ ادا کیا۔

خیر جناب! اگلے دن وقت سے پہلے ہی اسکول پہنچ گئے (گھڑی آگے ہونے کے کی وجہ سے نہیں، بلکہ خوشی کی وجہ سے) جس وقت اسکول کا گیٹ کھلا ہم باہر کھڑے سوکھ کر کانٹا ہو چکے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ڈھانچہ بن چکے تھے جبھی تو قریب سے گزرنے والی ایمبولینس میں موجود لوگوں نے ہمیں لاد کر لے جانا چاہا جس پر ہم نے قسمیں کھا کھا کر انہیں بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ ہم ہنوز زندہ ہیں اور اس اسکول میں ٹیچر ہیں۔ تب کہیں جا کر ہماری جان چھوٹی مگر وہ ہمیں یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے جیسے ہم ٹیچر نہیں دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہیں۔
ہمارا پہلا پیریڈ پہلی جماعت میں تھا۔ ہم پہلے ہی نڈھال ہو چکے تھے۔ مگر یہ سوچ کر اپنی ہمت بندھائی کہ ہماری زندگی کا بہترین دن ہے! ہم خراماں خراماں کلاس کی جانب چل دیئے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ہماری کلاس کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ ہمارے قدم تیز تیز اٹھنے لگے تاکہ بچوں کو اس قدر شور مچانے پر سزا دے سکیں ..... مگر اگلے ہی لمحے ہمیں اللہ میاں سے کئے ہوئے وہ وعدے یاد آنے لگے جو ہم نے اپنی کلاس میں کئے تھے۔ ہمارا غصہ رفتہ رفتہ ٹھنڈا ہوتا چلا گیا اور ہم سوچنے لگے "بچے ہیں نا! انہیں آداب کا زیادہ پتا نہیں ہے۔ یقیناً ہماری محبت میں رہ کر یہ بچے لائق اور باادب بن جائیں گے۔ ہم ان کی بہت اچھی طرح تربیت کریں گے!"
جب ہم کلاس میں نزدیک پہنچے تو ہمارے قدموں کی چاپ سن کر مانیٹر لاؤڈ اسپیکر

دانشمند کسان

سیما
عروج
صدیقی

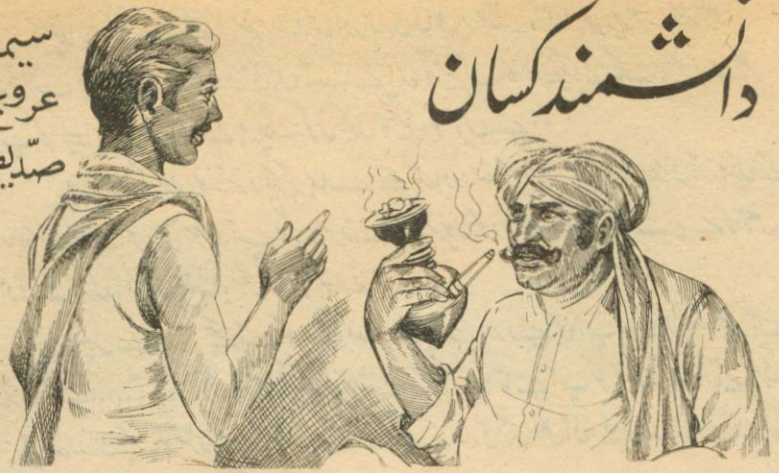

زمیندار جابر خان اپنے نام کی طرح انتہائی جابر اور ظالم تھا۔ ساتھ ہی وہ جاہل اور پرلے درجے کا بے وقوف بھی تھا۔ وہ اپنی زمینوں پر کسانوں سے زیادہ کام کراتا اور پیسے کم دیتا اور آئے دن احمقوں کی سی حرکتیں بھی کرتا رہتا تھا۔ گاؤں والے جابر خان سے ناخوش تھے لیکن کوئی بھی اُس کے ظلم کے خلاف کچھ بول نہیں سکتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ہر شخص نے گاؤں کے زمیندار سے کچھ نہ کچھ قرضہ لے رکھا تھا۔ اس لئے سب لوگ ہی اُس سے دَب کر رہتے تھے اور اس کے اِشاروں پر چلتے تھے۔ جابر خان کے گھر ایک نوکر تھا جسے جابر خان کے باپ نے مرتے وقت اُس کی نمک حلالی اور ایمانداری کی وجہ سے اپنی زمینوں میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا زمین کا بخش دیا تھا۔ اب اس زمین کا مالک نوکر کا اکلوتا بیٹا رحیم کسان تھا وہ اکیلا ہی اپنی زمینوں پر ہل چلاتا اور اپنی زمین پر فصل کے لئے جان توڑ محنت کرتا۔ جابر خان اس کی زمین کو دیکھ دیکھ کر کُڑھتا تھا اگر اباّ رحیم کے باپ کو یہ زمین نہ بخشتا تو آج میری دولت میں تھوڑا اور اضافہ ہو جاتا۔ جابر خان کئی ایکڑ زمینوں کا مالک ہونے کے باوجود للچائی ہوئی نظروں سے رحیم کی چھوٹی سی زمین کو دیکھا کرتا تھا۔

ایک روز جابر خان زمینوں سے لوٹ رہا تھا کہ راستے میں اُسے رحیم کسان مل گیا۔ رحیم نے جابر خان کو سلام کیا۔ لیکن جابر خان نے جواب دیئے بغیر بڑے تکبّر سے کہا "رحیمو کیسی ہے تیری زمین؟" رحیم نے جواب دیا "بس جناب آپ کی دعاؤں سے سونا اُگل رہی ہے" جابر خان سمجھا کہ شاید رحیم کسان کی زمین میں سونا دبا ہوا ہے۔ جبھی تو روز بروز کسان امیر ہوتا جا رہا ہے اور مجھے تو مسلسل زراعت میں نقصان ہو

رہا ہے" یہ خیال آتے ہی زمیندار جابر بہانہ کر کے چلتا بنا لیکن اس بے وقوف کا ذہن کسان کا جملہ سُن کر مُسلسل منصوبے بنا رہا تھا۔ وہ گھر جا کر سوچنے لگا کیوں نہ رات کو کسان کی زمین کھود کر سارا دبا ہوا سونا نکلوا لوں کسی کو معلوم بھی نہیں ہو سکے گا" چنانچہ اس نے فوراً اپنے وفادار نوکروں کو کسان کی زمینوں پر بھیج دیا اور انہیں حکم دیا کہ "رحیم کسان کی زمین کو کھود کر جلدی سے تمام سونا نکال لاؤ کیوں کہ مجھے پتہ ہے اس کی زمین میں سونا دبا ہوا ہے اور دیکھو صبح ہونے سے پہلے کام ہو جانا چاہیئے اور خیال رکھنا کسی کو کانوں وکان اس بات کی خبر نہ ہو" زمیندار کے نوکر تمام رات کسان کی زمینوں کو کھودتے رہے لیکن انہیں کچھ ہاتھ نہ آیا۔ البتہ کسان کی فصل کو نقصان ضرور پہنچا۔ زمیندار کے نوکر جب خالی ہاتھ لوٹے تو بے وقوف زمیندار نے نوکروں کو سخت سُست کہا اور اپنی قسمت کو کوسنے لگا صبح جب رحیم کسان نے اپنی زمین کی حالت دیکھی تو اُسے بہت افسوس ہوا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اُس کی فصل کو کس دشمن نے تباہ کیا ہے۔ کسان ایک وفادار آدمی تھا۔ وہ جابر خان کے متعلق ایسی حرکت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ خود جابر کے باپ نے ہی اس کے والد کو یہ زمین کا ٹکڑا انعام میں دیا تھا اس لئے وہ زمیندار کا بھی بہت احترام کرتا تھا۔ لیکن اس کی حرکتیں اسے پسند نہ تھیں آخر کسان رو دھو کر بیٹھ گیا۔ لیکن زمیندار کو اب بھی چین نہیں آیا وہ مسلسل انہی کوششوں میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح کسان سے معلوم کرے کہ آخر اس کی زمین سونا کیسے اُگل رہی ہے اور وہ سونا کہاں ہے۔

ایک روز زمیندار نے کسان کو بڑی عزت و احترام سے اپنے گھر بُلایا۔ کسان دوڑا دوڑا زمیندار کے گھر گیا زمیندار نے کسان سے پہلے تو بڑی چاپلوسی سے باتیں کیں اور آخر کار وہ اصل مقصد کی طرف آگیا۔ اور بولا۔

رحیم اب تو تم ہمارے نوکر کے بیٹے نہیں بلکہ دوست ہو۔ تم نے بڑی جلدی ترقی کی ہے۔ شائد اس وجہ سے کہ تمہاری تھوڑی سی زمین سونا اگل رہی ہے۔ لیکن .... لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ آخر تمہاری زمین سونا کیسے اُگل رہی ہے۔ رحیم مجھے بھی کچھ بتاؤ"۔ زمیندار نے رازداری سے کہا۔

رحیم جابر خان کی بات سنتے ہی سمجھ گیا کہ ضرور اس کی زمینوں کو اسی بے وقوف زمیندار نے تباہ کیا ہو گا۔ رحیم بہت سمجھدار اور ذہین تھا۔ اس نے سوچا اگر میں اس کو سیدھی سیدھی بات سمجھا دوں تو یہ کم عقل اور لالچی مجھے جھوٹا کہے گا اور سمجھے گا کہ شاید میں اسے سونا نکالنے اور حاصل کرنے کی ترکیب نہیں بتانا چاہتا۔ اس طرح کہیں جابر اس وجہ سے میرا دشمن نہ ہو جائے۔ آخر بہت سوچ کر رحیم کے ذہن میں

پر ہمیں بہت ہنسی آئی بچے ہمیں ہنستے دیکھ کر حیران تھے کہ آخر اس میں ہنسی والی کون سی بات ہے۔ اچانک ہمیں خیال آیا کہ ہم تو ٹیچر ہیں ہمیں بچوں کے سامنے نہیں ہنسنا چاہیے۔ بس جی! ہم سنجیدہ ہو کر کہنے لگے "اچھا اب ایک بالکل آسان سوال۔ اس کا جواب ہر بچے کو دینا چاہیے۔ بتاؤ ہٹلر کہاں پیدا ہوا تھا۔؟"

قریباً ساری کلاس کے ہاتھ اُٹھے ہوئے تھے اور ہر لڑکی کہہ رہی تھی "مس میں بتاؤں!" ہم بہت خوش ہوئے کہ یہ بچے بہت ذہین ہیں آخر ایک ننھی منی سی بچی کو بتانے کا اشارہ کیا وہ کہنے لگی "مس!... ہسپتال میں!" یہ جواب سنتے ہی کلاس میں تالیاں بجنے لگیں جوان کے خیال کے مطابق درست جواب تھا۔ ہمارا گلا اب بیٹھ چکا تھا۔ بڑی مشکل سے میز پر مکے مار مار کر انہیں خاموش کرایا۔

ہمارا سر بُری طرح درد کرنے لگا تھا۔ مگر پیریڈ ختم ہونے تک ہمیں یہیں رہنا تھا ہم نے ایک اور سوال کر دیا۔ "بتاؤ، شکر کس کام آتی ہے؟"

ایک بچی نے جلدی سے اُٹھ کر کہا "مس! مس.....! آپ کو پتا ہے، کل میری امی نے میٹھے چاول پکائے تھے"۔

ایک اور لڑکی کھڑی ہوگئی۔ اس کی بات ایک اور لڑکی نے کاٹی۔ پھر تو صاحب کلاس میں وہ بھگدڑ مچی کہ توبہ ہی بھلی۔ ہم نے "آرڈر! آرڈر!" کہنا چاہا مگر آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ ہمیں ڈر تھا کہ پرنسپل نہ آجائیں۔ اس نازک لمحے میں ہمیں یکایک انگوٹھی کے جن کا خیال آیا فوراً انگلی سے انگوٹھی اتارنی چاہی مگر یہ کیا انگوٹھی غائب تھی یا خدا! اب کیا ہوگا؟ انگوٹھی اس ہنگامے میں نجانے کہاں گر گئی تھی خدایا میری مدد کر اب کسی دیو ہیکل جن کو نہیں تو کسی چھوٹے موٹے بھوت ہی کو بھیج دے۔ ایسی حالت میں ہم نے اپنے لاکٹ اور طاپس کو بھی اچھی طرح رگڑا تاکہ اگر کوئی لاکٹ یا طاپس کا جن ہو تو وہی ان آفت کے پرکالوں سے نمٹے مگر کسی جن کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ اب ہم نے اسی میں عافیت جانی کہ کسی طرح یہاں سے نکل چلیں ہم جلدی سے دروازے کی طرف بھاگے اور اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگے لیکن یہ کیا! کسی شریر بچے نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ اُف خدایا! یقیناً ہمارا ہارٹ فیل ہو جائے گا!۔ یہ خیال آتے ہی ہم نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ ہماری حالت غیر ہو رہی تھی۔ اچانک کسی نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"ہائیں یہ کیا.... دروازہ کیسے کھلا.... اور ہم یہاں کیسے؟" ہم آنکھیں ملتے ہوئے حیرت کے عالم میں اپنے اردگرد جمع گھر کے افراد کو دیکھ رہے تھے۔

"کیا کوئی خواب دیکھا ہے! اور یہ تم سائڈ ٹیبل کو زور زور سے تھپ تھپا کر کیوں کہہ رہی تھیں کہ دروازہ کھولو" امی حیرت سے بولیں۔

اس وقت تک ہماری سمجھ میں ساری بات آچکی تھی۔ مگر پھر بھی تصدیق کرنے کے ہم نے اپنی انگوٹھی کو رگڑا، کوئی جن نہیں آیا اب ہمیں یقین ہوگیا کہ جو کچھ ہم نے دیکھا، وہ محض خواب تھا۔ ہم نے اس "پرخطر وادی" سے واپس آجانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور یہ ارادہ کرلیا کہ فی الحال ہم اپنی پڑھائی پر زیادہ توجہ دیں گے اور اپنے اس شوق کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد پورا کریں گے کیونکہ ہر کام اپنے وقت پر ہی اچھی طرح انجام دیا جاسکتا ہے۔

●●

۴ حصے

اسلام کی بنیادی معلومات

جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا کارِ ثواب ہے

تالیف: مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب

تعلیم الاسلام کے چاروں حصے مفت منگوانے کے لیے

صرف ۲/ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کردیجئے۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کا مقبول ترین سلسلہ تحریر

اخلاق احمد کی مہماتی کہانیوں کا دلچسپ مجموعہ

- برائیوں سے برسرِپیکار ۴ کمسن مجاہدوں کے کارنامے
- ذہانت اور شجاعت سے بھرپور حیرت انگیز واقعات
- خوبصورت اسکیچز — بہترین تصاویر — اعلیٰ طباعت

حسین سرورق اور ۱۰۰/ سے زائد صفحات

"حق اسکواڈ" حاصل کرنے کے لیے ۱۰/ روپے کا منی آرڈر بھجوادیں

کی طرح اعلان کرنے لگی "مس آگئیں" اور ساری کلاس میں خاموشی چھا گئی۔ ہم بے حد خوش ہوئے کہ بچے ہمارا اس قدر احترام کرتے ہیں۔ یہ بچے بہت اچھے ہیں بس انہیں رہنمائی کی ضرورت ہے۔ دروازے کے پاس آکر اکڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ تمام بچے جو مس کے آنے کی خبر سن کر چپ سادھ کر بیٹھے تھے ہمیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر کورس کے انداز میں چیخنے لگے "مس نہیں آئیں ... مس نہیں آئیں!" اور اس کے ساتھ ہی جیسے زلزلہ آگیا بچوں کے شور سے کلاس روم کی دیواریں لرزنے لگیں۔

ہم شش و پنج میں پڑ گئے کہ ان شیطانوں کا شور کیسے روکا جائے، سب سے زیادہ غصہ تو ہمیں اس بات پر تھا کہ ان بدتمیز بچوں کو ہم ٹیچر نہیں تو کیا پاگل دکھائی دے رہے تھے ہم نے حلق پھاڑ کر چلانا چاہا مگر ہماری آواز اس ہنگامے میں ایسے تحلیل ہوگئی، جیسے پانی کے جگ میں نمک کی چٹکی اور ویسے بھی نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے بچے اچھل کود میں ایسے مصروف تھے کہ اگر اس وقت ایٹم بم بھی گرتا تو اس کی آواز اس ہنگامے میں دب جاتی۔ ہم نے یاس و بے چارگی کے عالم میں روشندان کی طرف نگاہ اٹھائی کاش! خدا اس وقت ہماری مدد کے لئے کسی فرشتے کو بھیج دے یا پھر کم از کم کہانیوں والا رحم دل بونا ہی اس مشکل وقت میں ہماری مدد کے لئے روشندان سے کود پڑے مایوسی کے عالم میں ہاتھ ملتے ملتے اچانک ہمارا ہاتھ انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی سے ٹکرایا اور ہم افسوس کے مارے اسے ہی مسلنے لگے۔

اچانک ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک دیو ہیکل جن نمودار ہوا اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگا "کیا حکم ہے ٹیچر آقی!" یہ سن کر ہم بے حد خوش ہوئے کہ کسی نے تو ہمیں ٹیچر سمجھا۔ ہم نے جیسے ہی اس کی طرف دیکھا کہ، ہمارے ہاتھوں کے سارے طوطے اور مینا وغیرہ اڑ گئے ہم بے ہوش ہونے کی تیاری کرنے لگے تھے مگر یہ سوچ کر ہوش میں آگئے کہ شاید خدا نے اسے ہماری مدد کے لئے بھیجا ہے۔ ہمیں پہلے جن کی موجودگی کے بارے میں اس لئے علم نہ ہوسکا کہ گڑگڑاہٹ تو شور کی وجہ سے سنائی نہ دی تھی۔ جن نے ہماری پریشانی کی وجہ بھانپ کر کلاس کا راؤنڈ لگانا شروع کردیا۔ اچھل کود میں مصروف بچوں نے جو اس خوفناک بلا کو دیکھا تو سب کی گھگھی بندھ گئی اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ ہم اپنی اس کامیابی پر بے حد خوش ہوئے اور بچوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا کر کے ہم نے جن کو غائب ہوجانے کے لئے کہا۔

بچے جن کے خوف سے ابھی تک دُبکے بیٹھے تھے۔ اسی وقت پرنسپل صاحبہ راؤنڈ لگاتے ہوئے کلاس تک آ پہنچیں انہوں نے جب بچوں کو خاموش اور باادب بیٹھے تھے دیکھا تو ستائشی انداز میں کہنے لگیں "بہت خوب! تم نے کلاس کو بہت اچھی طرح کنٹرول کیا ہے۔ پہلے تو میں سمجھی تھی کہ ٹیچنگ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے مگر اب تم نے خود کو اس کا اہل ثابت کر دیا ہے۔"

ہم نے مسکرا کر انکساری سے کہا "تھینک یو میڈم" ہم حیران تھے کہ یہ ہمارا کارنامہ ہے یا جن کا؟ بہرحال اب ہمیں اس سے کیا! بچے ہمارے رُعب میں آ چکے تھے اس کے علاوہ ہمیں کیا چاہیئے۔!

ہم نے سب سے پہلے تو سہمے ہوئے بچوں کو یقین دلایا کہ ہم ہی ٹیچر ہیں اور آئندہ سے آپ کے فری پیریڈ لیا کریں گے۔ ہم نے سختی سے بچوں سے کہہ دیا کہ ہم کلاس میں شور شرابا پسند نہیں کرتے اس لئے آپ لوگوں کو سنجیدگی سے اپنی پڑھائی پر توجہ دینی ہوگی کیونکہ کبھی کبھی کورس کے انداز بھی سوالات پوچھے جائیں گے۔ ہم نے سوچا کہ اب پیریڈ ختم ہونے میں کچھ ہی دیر باقی ہے کیوں نہ بچوں سے کچھ معلوماتی سوال پوچھ کر ان کی ذہانت کا امتحان لیا جائے۔

ہم نے لیکچر دینے والے انداز میں کہا "بچو! ہم ملک پاکستان میں رہتے ہیں۔ اس کے بانی قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ آپ اس اسکول میں پڑھتے تھے، یہ بھی آپ کے لئے اپنے وطن اور گھر کی طرح ہے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ اسکول کس نے بنایا ہے۔؟"

ایک بچے نے جواب دینے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ ہم نے ساری کلاس کو ایک نظر دیکھ کر اس سے کہا "ہاں! آپ بتایئے۔"

لڑکی نے جواب دیا "مس! .... مزدوروں نے!" اس کے ساتھ ہی ساری کلاس میں قہقہے گونجنے لگے ہم نے پوری قوت سے چلا کر کہا "خاموش" اور سب کو بریک لگ گئے۔ پتا نہیں یہ ہماری ڈانٹ کا اثر تھا یا جن صاحب کے خوف کا!

ہم نے دوسرا سوال کیا "بچو! اب میں آپ لوگوں سے ایک مشکل سوال کرتی ہوں۔ دیکھوں تو کس کو آتا ہے۔ سوال ہے کہ دیوانِ غالب کب لکھا گیا۔؟"

ایک لڑکی کھڑی ہو کر کہنے لگی "مس جب غالب دیوانے ہو گئے تھے!" اس کے اس بھولپن

ایک ترکیب آئی۔ وہ کہنے لگا "زمیندار جی، سونا حاصل کرنے کے لئے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ اور اس کو سونا ملتا ہے جو خود اپنے ہاتھ سے زمین کا سینہ چیرتا ہے۔ اور زمیندار جی ایک خاص بات یہ کہ صرف میری زمین میں ہی سونا نہیں چھپا ہے بلکہ آپ کی زمین میں بھی سونا دبا ہوا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو سونا نکالنے کا طریقہ بتا دوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کو خود وہ سونا حاصل کرنے کے لئے زمین کو کھودنا ہوگا"

پہلے تو زمیندار محنت کرنے سے زمین کھودنے سے گھبرایا لیکن جلد ہی سونے کے لالچ نے اُسے رحیم کی بات پر عمل کرنے سے آمادہ کر دیا۔

پھر رحیم نے سونا نکالنے کا طریقہ بتانا شروع کیا "دیکھو زمیندار جی سب سے پہلے تم اپنی زمین کے اتنے حصّے پر ہل چلا کر فصل اگاؤ جتنی زمین پر تم روزانہ محنت کر سکتے ہو اور جتنی محنت ہو گی اُس قدر سونا زمین اگلے گی۔ پھر اس فصل کو کاٹ کر بازار میں بیچ آنا اور جو پیسے حاصل ہوں۔ میرے پاس لے آنا"۔ چنانچہ زمیندار نے دوسرے ہی دن سے اپنی زمینوں کے ایک حصّے پر خود ہی محنت و مشقت کرنا شروع کر دی۔ زمیندار کو زمین پر یوں کام کرتے دیکھ کر گاؤں والے حیرت میں مبتلا ہو گئے۔ اِدھر زمیندار کو اب احساس ہو رہا تھا کہ بے چارے کسان کو کس قدر محنت کرنی پڑتی ہے وہ انہیں ان کی محنت کے کتنے کم پیسے دیتا تھا۔ آخر کار فصل پک کے تیار ہو گئی جس روز وہ فصل فروخت کر کے آیا وہ بے تحاشا خوش تھا۔ وہ دوڑا دوڑا رحیم کے پاس آیا اور کہنے لگا "لو یہ چالیس ہزار روپے فصل بیچ کر حاصل ہوئے ہیں" رحیم کسان چُپ چاپ اسے لے کر ایک سُنار کی دکان پر گیا جو شہر میں تھی وہاں سے اُس نے زمیندار کے چالیس ہزار روپوں سے ایک سونے کی ڈلی خریدی اور کسان کو دیتے ہوئے بولا "یہ ہے وہ سونا جو تمہاری زمین نے اگلا ہے تم نے محنت کی۔ فصل اُگائی جتنی محنت کی اسی قدر فصل اُگی اُسی قدر پیسے حاصل ہوئے اور ان پیسوں سے یہ سونا حاصل ہوا۔ دیکھا تمہاری زمین بھی سونا اگل سکتی ہے۔

"بشرطیکہ تم محنت کرو نہ کہ دوسروں کی زمینوں کو کھود کر سونا تلاش کرو" کسان کی یہ بات سُن کر زمیندار بہت شرمندہ ہوا اور معافی مانگتے ہوئے بولا "اب میری آنکھیں کھل گئیں ہے اب میں ہمیشہ محنت کو ترجیح دوں گا۔ اور اپنے کسانوں پر ظلم بھی نہیں کروں گا۔ مجھے معاف کر دو میں اب سب سمجھ گیا ہوں کہ محنت میں کتنی برکت ہے اور حلال روزی میں کتنا سکون ہے۔ اب میں کبھی لالچ نہیں کروں گا اور خود کماؤں گا خود کھاؤں گا۔

a great new taste
mayfair
Fruta Chew
Chew it, you'll love it.
Fruta Chew
Fruta Chew
mayfair
– the sweet favourites

ADARTS

یہ تصویر امریکی ریاست کیلی فورنیا کے ایک تفریحی پُول کی ہے۔ جہاں ایک ماہرِ حیوانیات ڈاکٹر ڈوانا رائیس ڈولفن کے رویّے اور رابطے کے سِلسلے میں ایک تجربے کے دوران اِسے ایک مچھلی کھِلا رہی ہیں۔ دوسری تصویر میں جینیفر لی لیک اور کیلی جونز نامی دو بچیاں اس انتظار میں گیند لیے بیٹھی ہیں کہ ڈاکٹر صاحبہ آئیں تو وہ ڈولفن سے کھیلیں۔

"ڈولفن" وھیل خاندان سے تعلق رکھنے والی انسان دوست مچھلی جس کی دوستی ضربُ المثل بن چکی ہے۔ یہ مچھلی صرف سرکس اور تفریح گاہوں میں کھیل کرتب ہی نہیں دکھاتی بلکہ کھُلے سمندروں میں بھٹک جانے والی کشتیوں اور جہازوں کی رہنمائی بھی کرتی ہے اور محبّت کرنے والے انسانوں سے بے پناہ محبّت بھی کرتی ہے۔ ڈولفن پاکستان کے دریائے سندھ میں بھی بہت کم تعداد میں پائی جاتی ہے، مگر گدلے پانی میں مسلسل رہنے کی وجہ سے اپنی بینائی کھو چکی ہے۔ اسی لیے پاکستان میں پائی جانے والی ڈولفن کو اندھی ڈولفن بھی کہا جاتا ہے۔

احمد حاطب صدیقی

کُل سبزی منڈی یادگاری مشاعرہ

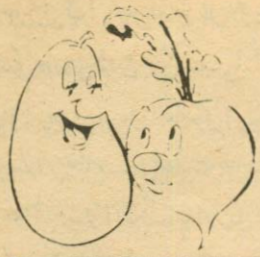

ایک دلچسپ رنگارنگ مشاعرہ جسے احمد حاطب صدیقی نے آپ کے لیے تحریر کیا۔ اس مشاعرے کو آپ اسکول کی تقریب یا کسی بھی فنکشن میں ایک خوبصورت آئٹم کے طور سے پیش کر سکتے ہیں۔

"صبح سویرے پانچ بجے تمھیں اُٹھنا ہے اور ابّو کے ساتھ سبزی منڈی جا کر پھل اور سبزیاں خرید کر لانی ہیں۔" امّی نے اُسامہ سے کہا جو لہک لہک کر مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے اشعار پڑھ رہا تھا۔

"جی اچھا! امّی میں ضرور جاؤں گا!" اسامہ نے جواب دیا اور پھر نظمیں پڑھنے لگا۔

"اب تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ ورنہ صبح اُٹھ نہیں سکو گے۔" امّی نے حکم دیا اور اسامہ کو مجبوراً بستر کا رُخ کرنا پڑا۔ بستر پر لیٹے لیٹے وہ کچھ دیر دل ہی دل میں نظمیں گنگناتا رہا۔ پھر اُسے نیند آ گئی۔

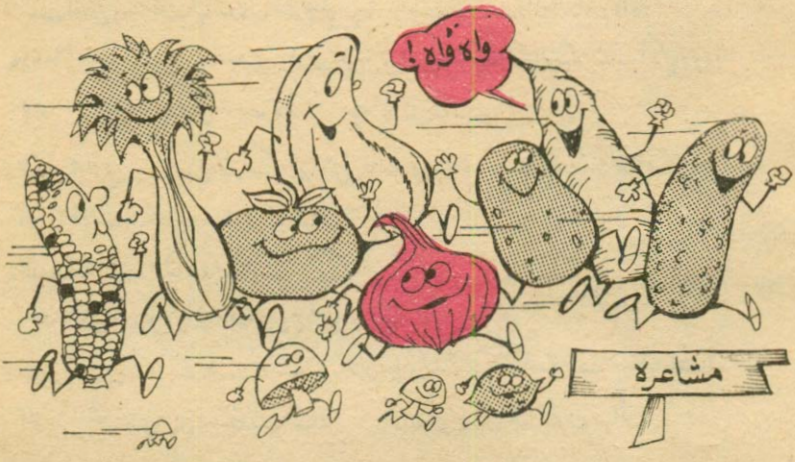

اُسامہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک بہت بڑا سا پنڈال سجا ہُوا ہے۔ اسٹیج پر کئی پھل اور سبزیاں تشریف فرما ہیں۔ سامعین میں پھُول، پھل اور سبزیاں وغیرہ اپنی اپنی کرسیوں پر براجمان ہیں۔ بڑا رنگارنگ ماحول ہے۔

اچانک جلسہ کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ پیاز اُٹھ کر آنچل سنبھالتی ہے اور مائک پر آکر اعلان کرتی ہے۔

پیاز :۔ حاضرین! پیاز آنسو گیسوی آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتی ہے۔ "انجمن شاعرانِ نباتات" کے زیرِ اہتمام آج کے اس مشاعرے کی صدارت ہمارے ممتاز شاعر محترم تربوز شربتی کر رہے ہیں، میں جنابِ صدر کی اجازت سے آج کے مشاعرے کا آغاز کرنا چاہوں گی۔"

تربوز :۔ (اپنا بڑا سا سر ہلاتے ہوئے باریک سی رسیلی آواز میں) "اجازت ہے، اجازت ہے!"

پیاز :۔ "ایک غزل کے دو شعر عرض ہیں!"

(مختلف آوازیں :۔ "ارشاد، ارشاد!")

پیاز :۔ "مری داستانِ قیمت، وہ سُنا سُنا کے روئے
مجھے گھر منگانے والے، مجھے گھر منگا کے روئے"

(مختلف آوازیں :۔ "آئے ہائے ہائے"۔۔۔ "کیا رُلایا ہے ظالم نے"۔۔۔ "واہ واہ")

پیاز :۔ "آداب ... آداب، اگلا شعر عرض ہے۔
مجھے ساتھ لائے خوش خوش وہ دُکان سے مکاں تک
جو چھُری سے مجھ کو کاٹا تو کچن میں جل کے روئے"

(مختلف آوازیں :۔ "اُف کیا دردناک نقشہ کھینچا ہے"۔۔۔ "ہائے ہائے مار ڈالا"۔۔۔ "واہ واہ")

پیاز :۔ "آداب ... آداب ... اب میں زحمتِ کلام دیتی ہوں، جناب آلو کچالوی کو، جناب آلو کچالوی!"

آلو :۔ "میرا بستر ہے مٹّی، ریت بالو ۔ ہے مجھ میں خاکساری میں ہوں آلو"

(مختلف آوازیں :۔ "سبحان اللہ"۔۔۔ "بڑی رتیلی خاکساری ہے"۔۔۔ "بہت اچھے"۔۔۔ "واہ واہ")

آلو :۔ "آداب ... آداب ... عرض کیا ہے!"

(مختلف آوازیں :۔ "ارشاد! ارشاد!")

آلو :۔ "نہیں سالن، کباب اور چپس پہ بس بناتے ہیں میرا بھرتا ۔۔۔ کچالو"

(مختلف آوازیں :۔ "اوئے ہوئے ہوئے"۔۔۔ "بڑی زیادتی کرتے ہیں"۔۔۔ "ہائے ہائے"۔۔۔ "کیا کہنے")

آلو :۔ "شکر قندی مری رشتے میں خالہ مگر اروی کا میں لگتا ہوں خالو"

(مختلف آوازیں :۔ "اچھا تو یہ بات ہے !..." بہت اچھے خالو میاں !..." کیا بات ہے صاحب !")

پیاز :۔ "آلو جناب ... معافی چاہتی ہوں ... عالی جناب آلو کچالوی کے بعد تشریف لاتی ہیں محترمہ مٹر پلاؤ نگری !"

مٹر :۔ "عرض کیا ہے !"

مختلف آوازیں :۔ ("ارشاد ! ارشاد !")

مٹر :۔ " جہاں بھی پلاؤ پکایا گیا ہے مجھے ڈالنے کو بُلایا گیا ہے "

(مختلف آوازیں :۔ "تو کیا یہاں بھی مٹر پلاؤ پکایا جائے گا ؟..." بھئی بہت خوب !")

مٹر :۔ "آداب ! آداب ۔

کبھی مجھ سے آلو کو بخشی ہے لذّت کبھی بُھون کر یونہی کھایا گیا ہے"

مختلف آوازیں "ارے کہیں آلو بھائی نہ جل بُھن جائیں ..." آپ کا جواب نہیں ..." کیا کہنے !")

مٹر :۔" آداب، آداب ۔

مجھے نرم پھلیوں کی پیکنگ میں رکھ کر بڑے قاعدے سے سجایا گیا ہے

(مختلف آوازیں :۔ "بجا ارشاد" ... "قدرتی پیکنگ ہے" ... "سبحان اللہ !")

پیاز :۔ "اب تشریف لارہے ہیں جناب سیب چترالی !

سیب :۔ "عرض کرتا ہوں !"

مختلف آوازیں :۔ "ارشاد ! ارشاد !"

سیب :۔ " مجھے چترال سے آنا پڑا ہے مگر آکے ، بک جانا پڑا ہے"

(مختلف آوازیں :۔ "کیا کریں بھائی !..." یہ تو ہم سب کی مجبوری ہے"۔۔ "حقیقت بیان فرمائی ہے")

سیب :۔" آداب ، آداب" مربّہ ، جام ، جیلی ، جُوس ، سب میں مجھے تبدیل ہو جانا پڑا ہے"

(مختلف آوازیں :۔" اوہو ، ہو ہو ..." سچ کہا ..." واہ واہ ..." سبحان اللہ !)

سیب :۔" آداب ، آداب :۔ کسی نے روز اگر اک مجھ کو کھایا طبیبوں کو کھسک جانا پڑا ہے"

(مختلف آوازیں :۔" بالکل ٹھیک ہے ..." ایک سیب روز کھاؤ ، ڈاکٹر کو بھگاؤ ..." واہ واہ" ،

پیاز :۔" جناب سیب چترالی کے بعد تشریف لاتی ہیں ، محترمہ گاجر گجریلا !

گاجر :۔ " شعر عرض ہے !"

مختلف آوازیں :- "ارشاد ! ارشاد !"

گاجر :- "زمین سے تو ذرا مجھ کو نکلوا دکھاؤں پھر میں تجھ کو اپنا جلوہ"

(مختلف آوازیں، زمین سے نکلوانا ضروری ہے ؟"... "ظاہر ہے، زمین کے اندر کس کو جلوہ دکھائیں گی ؟... "خوب کہا !")

گاجر :- "آداب ... آداب جو کچّا کھائے لذّت پائے ایسی کہ جیسے مل گیا ہو منّ و سلویٰ"

مختلف آوازیں :- "بڑی خوش فہمی ہے"... "نہیں نہیں، آپ نے سچ کہا، خفانہ ہوں"... "آگے ارشاد کیجیے" -)

گاجر :- "اچار اچھا، مُربّہ حد سے اچھا مگر سب سے سُپر ہے میرا حلوہ"

(مختلف آوازیں :- "یہ بات تو ماننی پڑے گی"... "واہ، واہ"... "منہ میں پانی آگیا")

پیاز :- "اب میں دعوتِ کلام دیتی ہوں، محترم ٹماٹر سُرخ کو... محترم ٹماٹر سُرخ !"

ٹماٹر :- "عرض کیا ہے"

مختلف آوازیں :- "ارشاد ! ارشاد !"

ٹماٹر :- "کبھی سالن میں بُھنوایا گیا ہوں کبھی کچّا ہی کھا جایا گیا ہوں"

(مختلف آوازیں :- "ارے ارے ایسا ظلم ؟"... "اوہو ہو ہو"... "آئے ہائے ہائے")

ٹماٹر :- "سلادوں میں ہُوا ہوں ٹکڑے ٹکڑے تو چٹنی میں بھی چٹوایا گیا ہوں"

(مختلف آوازیں :- "کیا چٹخارے دار شعر ہے"... "واہ واہ"... "درست فرمایا")

ٹماٹر :- "آداب عرض ... آداب عرض :

فنا ہو کر "جہانِ چٹ پٹاں" میں ٹمیٹو ساس کہلایا گیا ہوں"

(مختلف آوازیں :- "کیا کہنے ؟"... "جہانِ چٹ پٹاں کا جواب نہیں"... "کس کی ساس کہلائے گئے ہیں ؟")

ٹماٹر :- "کسی کی ساس نہیں، ٹماٹو ساس ! اگلا شعر عرض ہے" -

(مختلف آوازیں :- "ابھی کتنے شعر اور ہیں"... "نہیں نہیں ارشاد کیجیے"... "اچھی غزل ہے آپ کی")

ٹماٹر :- "اسی پر لال ہوں غصّہ میں اب تک کہاں بویا، کہاں کھایا گیا ہوں"

(مختلف آوازیں :- "ارے ارے آپ تو غصّہ ہو گئے"... "غصّہ تھوک دیجیے"... "سب کے ساتھ یہی ہوتا ہے")

ٹماٹر :- "بہت سے بور جلسوں میں تو اکثر مقرّر پر بھی برسایا گیا ہوں"

(مختلف آوازیں :- "او ہو، ہم پر تو نہ برسیں"... "اتنا غصّہ اچھا نہیں"... "غصّہ میں کئی شعر پڑھ گئے"...

آپ پر کس کو برسائیں"

پیاز :۔" اب تشریف لاتی ہیں، محترمہ بھنڈی سبز ڈریس !"

بھنڈی :۔" شعر عرض ہے !"

مختلف آوازیں :۔" ارشاد، ارشاد !"

بھنڈی :۔" نرم و نازک کس قدر ہوں چھو کے دیکھو "ہینڈ" سے جیسے آئی ہو یہاں بے بی کوئی "ہالینڈ" سے"

(مختلف آوازیں :۔" ہمیں تو خود آپ ہی ہالینڈ سے آئی ہوئی لگتی ہیں"۔۔" کیا انگلش کا بھوت سوار ہو گیا ہے"۔۔۔۔

"ویری گڈ")

بھنڈی :۔" تھینک یو تھینک یو ۔۔۔ نیکسٹ شعر عرض ہے :"

(مختلف آوازیں :۔" پلیز ! پلیز !")

بھنڈی :۔" کتنی "بیوٹی فل" ہے میری سبز مخروطی شکل میرے جیسی کوئی شے اُگتی نہیں ہے "لینڈ" سے"

(مختلف آوازیں :۔" ویری نائس"۔۔" ونڈر فل"۔۔" ویری گڈ")

بھنڈی :۔" تھینکس اے لاٹ !

آپ کہتے ہیں مجھے " بھنڈی" تو کچھ پروا نہیں "لیڈی فنگر" کا لقب مجھ کو ملا " انگلینڈ" سے"

(مختلف آوازیں :۔" اوہو تو یہ چکر تھا"۔۔" جبھی آدھی انگریز ۔۔۔ ہو گئی ہیں"۔۔" بڑی ماڈرن شاعرہ ہیں")

پیاز :۔" مس بھنڈی سبز ڈریس کے بعد تشریف لاتے ہیں معتبر شاعر جناب شلجم شکر الوی"

شلجم :۔" دو شعر عرض ہیں !"

(مختلف آوازیں :۔" بڑی مہربانی"۔۔" ارشاد ! ارشاد !")

شلجم :۔" تھوڑا تھوڑا میٹھا ہوں، میں بات بھی میٹھی کہتا ہوں چہرہ سُرخ و سفید ہے میرا، ہر دم خوش خوش رہتا ہوں

(مختلف آوازیں :۔" اچھا کرتے ہیں"۔۔" کیا کہنے"۔۔" تبھی تو اس عمر میں بھی تر و تازہ ہیں")

شلجم :۔" آداب ۔ آداب، !

" شوربے والا سالن ہو، یا بھجیا ہو، یا بنوں اچار لوگوں کی خدمت کی خاطر سارے دُکھ میں سہتا ہوں"

(مختلف آوازیں :۔" پھر تو آپ کو دُکھی ہونا چاہیئے"۔۔" بہت مخلص ہیں آپ"۔۔" کیا بات ہے !")

پیاز :۔" اب تشریف لاتی ہیں، محترمہ رنگین نارنگی صاحبہ !"

نارنگی :۔" عرض کیا ہے کہ ؎ دل لبھاتی ہے میری خوش رنگی پھر بھی کہتے ہیں لوگ " نارنگی"

(مختلف آوازیں :۔ "بڑے افسوس کی بات ہے"۔۔ "بہت غلط کہتے ہیں"۔ "آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ برداشت کر رکھا ہے")

نارنگی :۔ "کوئی بڑھیا بھی گر پڑے بیمار   میرا رس پی کے ہو بھلی چنگی"

(مختلف آوازیں :۔ "بالکل ٹھیک ہے"۔ "واہ واہ"۔ "لیکن صرف بڑھیا ہی پر اتنی مہربانی کیوں؟")

پیاز :۔ "اب تشریف لاتے ہیں جناب بینگن تھالی آبادی! آپ حیدر آباد دکن سے تشریف لائے ہیں!"

بینگن :۔ "شعراں عرض کیا ہوں!"

(مختلف آوازیں :۔ "کتنے شعراں ہیں؟"۔۔۔ "کیجئے کیجئے"۔۔ "ارشاد ارشاد!")

بینگن :۔ "آسمان سے اپن اُتارا گیا   حیدر آباد میں بگھارا گیا"

(مختلف آوازیں :۔ "اے! آسمان سے کیوں اُترنا پڑ گیا؟"۔۔ "واہ واہ"۔۔ "بگھارے بینگنوں کا لطف آ گیا")

بینگن :۔ "آداب عرض کیا ہوں ؎ مجھ کو کہتے ہیں تھالی کا بینگن   کتنی عزّت سے میں پکارا گیا!"

(مختلف آوازیں :۔ "اوہو، تو آپ اسے عزّت سمجھتے ہیں"۔۔ "کیا بات ہے جناب"۔۔ "واہ واہ")

بینگن :۔ "میرے بھُرتے کو کیا ملی لذّت   بس اسی غم میں آلو مارا گیا"

(مختلف آوازیں :۔ "ارے ارے"۔۔ "آلو بھائی! یہ کیا کہہ دیا انھوں نے؟"۔۔۔ "بہت خود پسند ہیں")

آلو :۔ (غصہ میں اُچھل کر) "کالا کلوٹا۔۔۔ بینگن لوٹا"

پیاز :۔ "حضرات! مشاعرے کے آداب کا خیال رکھیں۔ ایک دوسرے پر چوٹ کرنے سے گریز کریں۔ اب میں دعوت دیتی ہوں محترمہ پھول گوبھی صاحبہ کو۔۔۔ بیگم پھول گوبی!"

گوبھی :۔ "شعر عرض ہے!"

مختلف آوازیں :۔ "ارشاد! ارشاد!"

گوبھی "میرے پھول جیسے چہرے پہ حسین سبز آنچل   کہیں موتیوں پہ جیسے کہ لگا ہو سبز مخمل"

(مختلف آوازیں :۔ "واہ واہ"۔ "کیا حُسن ہے؟"۔۔ "اپنی تعریف آپ!")

گوبھی :۔ "نہیں اتنی نرم و نازک کہ ہوا سے اُڑ ہی جاؤں   کوئی تول ہی نہ پائے، نہ میں اس قدر ہوں بوجھل"

(مختلف آوازیں :۔ "جی ہاں، ہیوی ویٹ ہیں"۔۔ "ماشاءاللہ خاصی صحت مند ہیں"۔۔ "سبحان اللہ!")

گوبھی :۔ "آداب۔۔۔ آداب۔

مری۔۔۔ اور اک بہن ہے، جسے بند گوبھی کہیے   بڑی شرم کی ہے پُتلی، نہیں شوخ اور چنچل"

(مختلف آوازیں :۔ "تو کبھی ملوائیے نا!"۔۔ "چلیے کسی اور کی تعریف تو کی"۔۔ "واہ واہ")

پیاز :۔ "اب تشریف لاتے ہیں، محترم پالک پکوڑوی"

پالک :۔ "شعر عرض کرتا ہوں!"

(مختلف آوازیں :۔ "ارشاد! ارشاد!")

پالک :۔ "مرے دم سے ہیں مزے کے، یہ گرم گرم پکوڑے مرے ساگ میں وہ لذت، کوئی مجھ سے منہ نہ موڑے"

(مختلف آوازیں :۔ "واہ واہ"۔۔۔ "گرما گرم پکوڑے یاد دلا دیے"۔۔۔ "سبحان اللہ")

پالک :۔ "آداب ۔۔۔ آداب

کوئی آلوؤں میں ڈالے، کوئی گوشت میں ملائے مری سب سے دوستی ہے، مجھے کوئی بھی نہ چھوڑے"

(مختلف آوازیں :۔ "یہ بڑی اچھی بات ہے"۔۔۔ "بہت عمدہ ہے"۔۔۔ "بہت خوب")

پالک :۔ "میں ذرا سا ایک پتا ہوں ہرا ہرا سا لیکن ہیں ذخیرے "آئرن" کے بھرے مجھ میں تھوڑے تھوڑے"

(مختلف آوازیں :۔ "ارے صاحب! پوری اسٹیل مل لگی ہوئی ہے"۔۔۔ "کیا کہنے"۔۔۔ "واہ واہ")

پیاز :۔ "اور اب آرہے ہیں حضرت لیموں چٹنارو ی!"

لیموں :۔ "عرض کرتا ہوں!"

(مختلف آوازیں :۔ "ارشاد، ارشاد!")

لیموں :۔ "مرا ذائقہ ہے کھٹا، مرا روپ خوش نما ہے چکھی جس نے میری "نمکی" وہ لبوں کو چاٹتا ہے"

(مختلف آوازیں :۔ "اُفوہ! منہ میں پانی بھر آیا"۔۔۔ "واقعی لیموں کے اچار کا جواب نہیں"۔۔۔ "کیا بات کہی ہے!")

لیموں :۔ "ہو اچار یا کہ چٹنی، مرے دم سے سب کی لذت یونہی سبز چائے میں بھی، مرا لطف آگیا ہے"

(مختلف آوازیں :۔ "واہ واہ"۔۔۔ "سبحان اللہ"۔۔۔ "سچ کہا ہے!")

لیموں :۔ "آداب، آداب"

مرا "اسکویش" پی کر، ہوئی پیاس سب کی رخصت جو بنے ڈرائنس میرے تو مزا ہی آگیا ہے"

(مختلف آوازیں :۔ "واقعی مزا آگیا"۔۔۔ "واہ واہ"۔۔۔ "سبحان اللہ")

پیاز :۔ "اب میں زحمت دے رہی ہوں محترم گنا گنڈیری صاحب کو۔۔۔ محترم گنا گنڈیری!"

گنا :۔ چند اشعار عرض ہیں

مختلف آوازیں :۔ "ارشاد! ارشاد!"

گنا :۔ "اگر میری "بوائی" ہی نہ ہوتی تو دنیا میں مٹھائی ہی نہ ہوتی"

(مختلف آوازیں: "بالکل صحیح فرمایا"۔۔ "آپ ہی کی عنایت ہے"۔۔ "واہ واہ")

گنا :- "آداب۔۔۔ آداب نہ بنتا گُڑ نہ دانے دار، چینی دکاں میں رس ملائی ہی نہ ہوتی"

(مختلف آوازیں :- "یقیناً۔۔۔ یقیناً"۔۔ "بالکل ٹھیک کہا"۔۔ "واہ واہ")

گنا :- "گنڈیری چوس کر، پی کر مرا رس جو پائی ہے خوشی، پائی نہ ہوتی

(مختلف آوازیں :- "سچ ہے"۔۔۔ "یہ خوشیاں آپ ہی نے عطا فرمائی ہیں"۔۔ "واہ واہ")

پیاز :- "اور اب آخر میں، میں درخواست کرتی ہوں صدر مشاعرہ محترم تربوز شربتی سے"!

تربوز :- "سر بڑا سردار کا، یوں میں بھی سرداروں میں ہوں میٹھا میٹھا ذائقہ رکھتا ہوں، رس داروں میں ہوں"

(مختلف آوازیں :- "جی ہاں تبھی تو آپ سے مشاعرے کی بھی سرداری کروائی گئی ہے"۔۔ "واہ واہ"۔۔ "سبحان اللہ")

تربوز :- "آداب۔۔۔ آداب

مجھ کو کھائیں یا پئیں میں پھل بھی ہوں شربت بھی ہوں اس لیے مقبول بیحد، پیاس کے ماروں میں ہوں"

(مختلف آوازیں :- "ہم بھی پیاس سے مَر رہے ہیں"۔۔ "مشاعرے کے بعد آپ کو کھائیں پئیں گے"۔۔ "سبحان اللہ")

تربوز :- "میرا چھلکا سبز، گُودا سُرخ، پر کالے ہیں بیج یعنی رنگا رنگ ہوں، قدرت کے شہ پاروں میں ہوں

(مختلف آوازیں :- "اس میں کیا شک ہے"۔۔ "بجا فرمایا جناب نے"۔۔ "اور کچھ فرمائیے!")

تربوز :- "موسم گرما میں میری قدر و قیمت پوچھیے جس طرف بھی دیکھیے، موجود بازاروں میں، ہوں!

(مختلف آوازیں :- "کتنی قیمت ہے"؟۔۔۔ "بازار میں چلئے تو پوچھیں گے"۔۔ "کیا کہنے")

پیاز :- "حاضرینِ محترم "انجمن شاعرانِ نباتات" کا یہ مشاعرہ اب اختتام کو پہنچتا ہے۔ پیاز آنسو گیسوی کو اجازت دیجیے"۔

" اُسامہ بیٹے اُٹھیے آپ کو سبزی منڈی جانا ہے۔ بس اُٹھ جائیے"۔

اُسامہ میاں یہ سمجھ رہے تھے کہ آخری فقرے بھی پیاز آنسو گیسوی نے کہے ہیں۔ لیکن آنکھ کھُلی تو دیکھا کہ امّی جان ان کو جگا رہی تھیں۔

"حق اسکواڈ" ایک بار پھر میدانِ عمل میں!

طویل غیر حاضری کے بعد "حق اسکواڈ" کے چار ننھے ارکان اس بار کون سا کارنامہ انجام دے رہے ہیں؟

سنسنی خیز کارنامے کی تفصیلات کے لیے آئندہ شمارے کا انتظار کیجیے

ہماری رہنمائی کیجئے

ساتھیو، ہم نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ ہم آنکھ مچولی کے معیار اور حسن میں مسلسل اضافہ کرتے رہیں گے۔ ہم مطمئن ہیں کہ ہم نے اپنا وعدہ نبھانے کی ہر ممکن کوشش کی بلکہ ابھی تک کر رہے ہیں۔ آنکھ مچولی کو بہتر بنانے کے لیے ہم نے موجودہ شمارے میں بھی بعض تبدیلیاں کی ہیں۔ اُمید ہے یہ تبدیلیاں آپ کو پسند آئیں گی۔

آنکھ مچولی کو خوبصورت سے خوبصورت تر بنانے کی اس مُہم میں آپ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جایئے۔ ممکن ہے آپ کے زرخیز ذہن میں کوئی اچھی تجویز، کوئی اچھوتا خیال ایسا آجائے جس کے باعث اس کے حُسن میں مزید اضافہ ہو جائے۔ ہم ایک سوال نامہ آپ کے مطالعہ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ آپ تمام سوالوں کے جوابات ڈاک کے ذریعہ پہلی فرصت میں ہمیں بھجوا دیجئے۔ ہم آپ کے جوابات اور تجاویز کی روشنی میں آنکھ مچولی کے رنگ رُوپ کو مزید نکھارنے کی کوشش کریں گے۔ ہماری خواہش، کوشش اور دُعا ہے کہ آپ کے تعاون سے ہم آنکھ مچولی کے معیار کو بلند سے بلند تر کر سکیں۔

(۱) کیا آپ آنکھ مچولی باقاعدگی سے پڑھتے ہیں؟ _____

(۲) آنکھ مچولی آپ خود خرید کر لاتے ہیں یا امّی، ابّو، بہن بھائی یا کوئی دوست؟ _____

(۳) آنکھ مچولی (آپ کا ذاتی شمارہ) کو آپ کے علاوہ آپ کے کتنے بہن بھائی یا دوست پڑھتے ہیں؟ _____

(۴) آپ کے خیال میں آنکھ مچولی کی سب سے نمایاں خوبی کیا ہے؟ _____

(۵) آنکھ مچولی کی سب سے بڑی خامی آپ کی نظر میں _____

(۶) آنکھ مچولی میں کیا تبدیلیاں لائی جائیں کہ یہ آپ کو مزید اچھا لگنے لگے دو مشورے دیجئے۔ _____

(۷) "امّی ابّو کا صفحہ" کیا آپ کے امّی ابّو یا سرپرست پڑھتے ہیں ؟ _____ ہاں / نہیں _____

(۸) "امّی ابّو کا صفحہ" اگر آپ کے بزرگ پڑھتے ہیں تو انھیں کیسا لگتا _____
ہے ؟ پوچھ کر لکھیئے۔ _____

(۹) آپ کے خیال میں آنکھ مچولی کا سب سے دلچسپ سلسلہ وار ناول اور _____
سب سے غیر دلچسپ ناول۔ _____ دلچسپ / غیر دلچسپ _____

(۱۰) آنکھ مچولی میں شائع ہونے والا آپ کا پسندیدہ ادیب _____

(۱۱) اسکول کے طلبہ کے لیے آنکھ مچولی سے بہتر رسالہ آپ کسے کہیں گے ؟ _____

(۱۲) آپ آنکھ مچولی خاص نمبر کے ساتھ مناسب مالیت کا کون سا تحفہ لینا _____
پسند کریں گے۔ دو منفرد تحفے تجویز کرنے پر آپ کو انعام بھی مل سکتا ہے۔ _____

(۱۳) "آؤ ملائیں ہاتھ" کا سلسلہ بند کر دیا جائے تو ؟ _____

(۱۴) "قلمی دوستی" کے سلسلے کو بہتر کس طرح بنایا جائے ؟ _____

(۱۵) آنکھ مچولی کے سرورق کا انداز ؟ _____ اچھا ہے / بُرا ہے / ٹھیک ٹھاک ہے

(۱۶) آپ آنکھ مچولی کا سرورق کس انداز کا دیکھنا پسند کریں گے ؟ _____

(۱۷) آپ آنکھ مچولی سے قبل کون سا رسالہ پڑھا کرتے تھے ؟ _____

(۱۸) آنکھ مچولی میں کہانیوں کا تناسب زیادہ ہونا چاہیئے یا مضامین کا ؟ _____

(۱۹) کیا آنکھ مچولی کا سائز بدلنا مناسب ہوگا ؟ اگر "ہاں" تو کون سا سائز ؟ _____

(۲۰) آپ کے خیال میں ایک شمارے میں کتنی سلسلے وار کہانیاں شائع _____
ہونی چاہئیں ؟ _____

(۲۱) اگر آپ آنکھ مچولی کے ایڈیٹر بنا دیے جائیں تو سب سے پہلے آپ _____
کون سا انقلابی قدم اُٹھائیں گے ؟ _____

نام _____ عمر _____ کلاس _____

پتہ _____

کھٹ مٹھے

منتخب لطائف

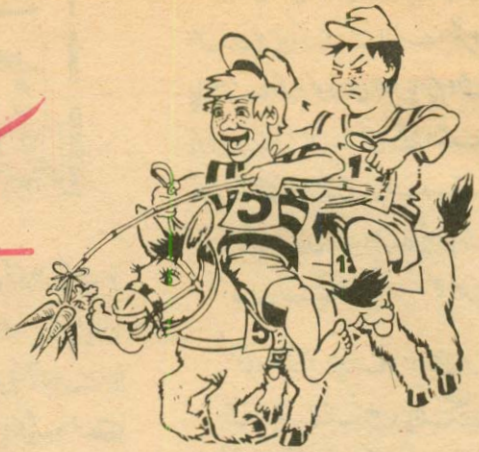

اس ماہ کا انعامی لطیفہ

ایک روسی باشندہ سرِ بازار حکومت کو گالیاں دے رہا تھا کہ کیا واہیات حکومت ہے ایک پولیس افسر نے اسے پکڑ لیا۔ روسی گھبرا کر بولا۔ "مگر میں تو امریکی حکومت کے خلاف بول رہا تھا" افسر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہمیں بیوقوف سمجھتے ہو کیا ہمیں نہیں معلوم کہ کونسی حکومت واہیات ہے۔"

محمد عمران بھٹی ——— کاچھا روڈ، کاہنہ نو

ایک شخص پہلی بار تقریر کر رہا تھا۔ تقریر کاغذ پر لکھی ہوئی تھی۔ جب پہلا صفحہ ختم ہوا تو اُس کے الفاظ تھے "شیر جیسا بہادر انسان" لیکن جب اُس نے دُوسرا صفحہ اُلٹنا چاہا تو گھبراہٹ میں دو صفحے اُلٹ گیا اور تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا "انڈے سے نکلتا ہے!"

کاشف علی - رفیع محمد — لانڈھی، کراچی

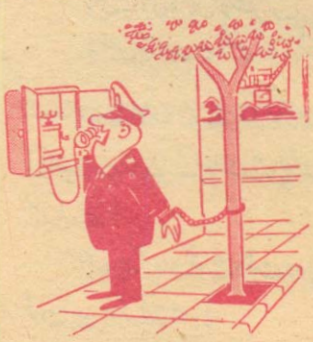

سزا مجرم کو میں نے گرفتار کر لیا ہے۔

ایک صاحب کا نیا جوتا اُنھیں بُری طرح کاٹ رہا تھا اور وہ سڑک پر لنگڑا کر چل رہے تھے۔ ان کی پریشانی دیکھ کر ایک راہگیر نے پوچھا "آپ کو یہ جوتا کہاں سے ملا؟" اُن صاحب نے جل کر جواب دیا "ایک درخت سے توڑا تھا"۔

راہ گیر نے برجستہ جواب دیا۔
"آپ کو اس کے پک جانے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔"

حامد علی شاھد ـــ لاوہ، چکوال

ڈاکٹر کے پاس ایک مریض آیا اور کہنے لگا "ڈاکٹر صاحب! آپ نے مجھے پہچانا؟"
ڈاکٹر: "جی نہیں"
مریض: "ڈاکٹر صاحب! میں وہی مریض ہوں، جسے دو سال پہلے نمونیا ہو گیا تھا اور آپ نے نہانے سے منع کیا تھا۔ میں یہ پوچھنے حاضر ہوا تھا کہ کیا میں اب نہا سکتا ہوں؟"

ولی محمد ـــ لانڈھی کراچی

امی: "نعیم تم کتے کی دُم کیوں کھینچ رہے ہو؟"
نعیم: "امی میں نے تو صرف دُم پکڑ رکھی ہے کھینچ تو وہ خود رہا ہے"۔

صائمہ نیم

"آپ کا بچہ حساب میں کمزور ہے۔ میں نے کل اس سے پوچھا کہ میں تین انڈے اشرف کو دوں، چار انڈے اکرم کو دوں اور پانچ انڈے تمھیں دوں تو بتاؤ، میں نے کُل کتنے انڈے دیے؟ آپ کے بچے نے صحیح جواب دینے کے بجائے شرما کر کہا "نہیں آپ انڈے نہیں دے سکتے!"

محمد اصغر خان ـــ گولارچی (سندھ)

مُنّی: "امی ذرا پولک تو دیجیے"
امی: "بیٹا، پولک نہیں پالک کہتے ہیں"
مُنّی: "امی مجھے پالک کہنے نہیں آتا"۔

محمد علی ـــ مہاجر کیمپ کراچی

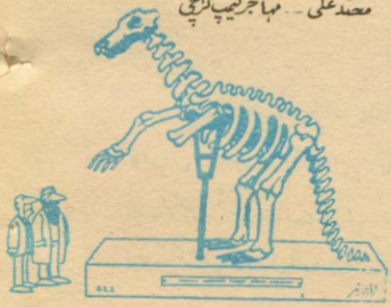

بائیں بازو کی ہڈیاں تلاش کرنے پر بھی نہ ملیں تو ہمیں بیساکھی لگانا پڑی ـــ

"حادثے کا شکار ہونے والے موٹر کار والے، حادثے کی تفصیلات بتانے کے معاملے میں پولیس کی مدد کیوں نہیں کر سکتے؟"
"اس لیے کہ حادثے کے وقت وہ اپنی آنکھیں خوف سے بند کر لیتے ہیں!"

عالیہ اعجاز ـــ ڈنگہ گجرات

پہلا دوست :"اگر بادشاہی مسجد کے مینار پر میں
پہلے پہنچ گیا تو اس پر ایک نشان بنا دوں گا۔"
دوسرا دوست :"اور اگر میں پہلے پہنچ گیا تو تمھارے
بنائے ہوئے نشان کو مٹا دوں گا۔"
انیلا تسلیم احمد ۔۔۔ ملتان

ارے بیگم! میں اس طرف ہوں بھئی

شوہر :"ارے بیگم، تم ایک گھنٹے سے دروازے پر
کس سے باتیں کر رہی تھیں؟"
بیگم :"اپنی سہیلی سے! اس بے چاری کے پاس
اندر آنے کا وقت نہیں تھا۔"
سید یوسف شاکر رضی اللہ ۔۔۔ کراچی

کپتان اپنی ٹیم کی فیلڈنگ سے سخت مایوس تھا۔
ہر میچ میں وہ کیچ پہ کیچ گراتے رہے آخر تنگ آکر اُس
نے تمام کھلاڑیوں کو جمع کیا اور بولا "ہم سب مچھلی کے
شکار پر چل رہے ہیں!"
"آخر کیوں؟" کھلاڑیوں نے احتجاج کیا۔
"میں چاہتا ہوں کہ اس سیر میں تم کچھ نہ کچھ
پکڑ لو۔"
محمد سرمد خان ۔۔۔ ماڈل کالونی، کراچی

ایک بڑا سا کتا ایک چھوٹے بچے کے ہاتھ پیر چاٹنے
لگا۔ بچہ ڈر کے مارے چیخ اُٹھا اس کی ماں دور سے
بولی۔ کیا ہوا؟ کتے نے کاٹا تو نہیں؟"
بچہ معصومیت سے بولا "نہیں امی! ابھی
تو چکھ رہا ہے۔"
کامران خالد ۔۔۔ بڑا بورڈ، کراچی۔

ایک صاحب کا تکیہ کلام تھا "آپ کی دُعا
سے!" ایک دن وہ شہر اپنے دوست سے ملنے گئے۔
دوست نے پوچھا کیا حال ہے؟"
تو بولے۔"بہت اچھا حال ہے، آپ کی دُعا
سے میرا بیٹا پاس ہوگیا، آپ کی دُعا سے میری ترقی
ہوگئی، آپ کی دُعا سے۔ اور آپ کی ماں مرگئی، آپ
کی دُعا سے۔"
محمد تنویر خان ۔ محلہ چانڈیہ والا، ضلع لیہ

بیٹا: "ابّا جان! میں ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہوں۔"
باپ: "وہ کیسے؟"
بیٹا: "ناممکن کا "نا" مٹا کر۔"
محمد رضوان ۔۔۔ اورنگی ٹاؤن کراچی

یہ میرا بڑا وفادار ہے۔ اب ذرا مجھے پنچ لگا کر تو دکھاؤ

ایک آدمی حجام سے بال کٹوا رہا تھا۔ اچانک حجام اُس کے سر پر مقناطیس پھیرنے لگا۔ اُس آدمی نے حیران ہوتے ہوئے کہا "تم میرے سر پر مقناطیس کیوں پھیر رہے ہو؟" "تمہارے بالوں میں میری قینچی گم ہو گئی ہے۔" حجام نے جواب دیا۔

عائشہ خالد ـــ پی ای سی ایچ ایس کراچی

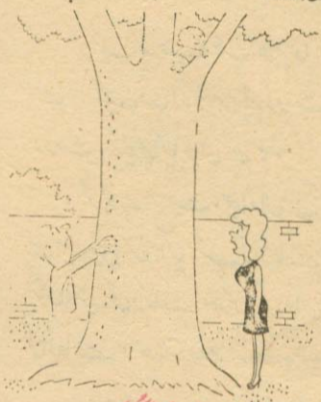

آگے آگے دیکھئے کیا گل کھلاتا ہے

باپ: "بیٹے تم کتاب کی جلد کو صابن سے کیوں دھو رہے ہو؟"

بیٹا: "اس لئے کہ صابن جلد کی حفاظت کرتا ہے"

محمود الضاری ـــ ملیر کالونی ۔ کراچی

دو بیوقوف گلاس خریدنے کے لئے بازار گئے۔ دکان پر گلاس اُلٹے رکھے ہوئے تھے گلاس دیکھ کر ایک کہنے لگا۔ "یہ گلاس تو اوپر سے بند ہیں" دوسرے نے گلاس اُلٹ کر دیکھا اور بولا "ان کے پیندے بھی ٹوٹے ہوئے ہیں۔"

محمد مشتاق ـــ غوثیہ پارک، لاہور

موٹا آدمی (ایک دُبلے پتلے آدمی سے) "آپ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے مُلک میں قحط پڑ گیا ہو..."

دُبلا پتلا آدمی: "اور آپ کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس قحط کا سبب آپ ہیں۔"

ظفر اقبال سومرو ـــ قادر بخش ساند

"ڈاکٹر صاحب، مچھر مارنے کا طریقہ بتائیے۔"

ڈاکٹر صاحب: "پہلے مچھر کو پکڑ کر اس کے گدگدی کریں اور جب وہ منہ کھولے تو دوائی ڈال دیں۔"

محمد ارشد ادبی عادل ـــ قصبہ کالونی کراچی

بچوں کو سستی پر مضمون لکھنے کے لیے دیا گیا دوسرے دن کاپیاں چیک کرتے وقت ایک کاپی ایسی بھی آئی جس میں پہلی سطر سے آخری سطر تک صفحہ خالی تھا، البتہ سب سے نیچے درج تھا "جناب! یہ ہے سستی۔"

عبیداللہ میمن ـــ سکھر

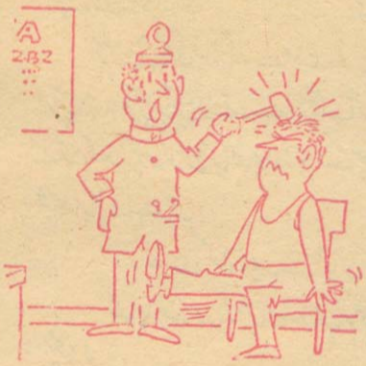

یقیناً تمہارا اعصابی نظام صحیح کام کر رہا ہے

کیا آپ کا کوئی بچّہ ہے؟

کلاس ٹیچر: "تم کلاس میں نہیں سو سکتے۔"

طالب علم: "بالکل سو سکتا ہوں سر! اگر آپ زور سے نہ بولیں۔"

مجتبےٰ الرحمٰن — میر پور (آزاد کشمیر)

ایک صاحب نے جُوتا خریدا اور پھر دکاندار سے نئے سال کا کیلنڈر مانگا۔ دکاندار نے معذرت کرتے ہوئے کہا: "ابھی تو نہیں ہے اگلے ہفتے رسید دکھا کر وصول کر لیجئے گا۔"

گاہک نے کہا: "اگر رسید گم ہو گئی تو جُوتا دکھا کر وصول کر لُوں گا۔"

ابنِ مفرح — گنجو خان روڈ، ملتان

پہلا: "کیا یہ سچ ہے کہ موسیقی سے پانی کھول سکتا ہے؟"

دوسرا: "پانی تو معلوم نہیں، مگر خُون ضرور کھولتا ہے۔"

محمد یوسف کامدار — صدر کراچی

ایک بچّہ اپنے اسکول کی لائبریری میں گیا اور لائبریرین سے بولا۔

"جناب مجھے بچّوں کی نگہداشت پر کوئی کتاب دے دیں۔"

لائبریرین نے ایک کتاب نکال کر بچے کو دی اور پوچھا۔ "بیٹا! کیا تمہاری امّی یا ابّو نے یہ کتاب منگوائی ہے۔"؟

"نہیں جناب!" بچے نے جواب دیا "میں خود دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے والدین میری نگہداشت صحیح طریقے سے کر رہے ہیں یا نہیں۔"

بوبی، ٹیپو، ——— مقام نامعلوم

آپ بہت اسمارٹ لگ رہے ہیں سر۔

ایک صاحب کی عادت تھی کہ خ کو ق اور ق کو خ کہتے تھے۔ ایک روز قبرستان سے گزر رہے تھے کہ ایک قبر سے ٹھوکر لگی اور وہ گر پڑے تو کہنے لگے۔ "مجھے کیا قبر تھی کہ یہاں خبریں ہی خبریں ہیں!"

فہیم الدین، ——— نیو کراچی

لفٹ پلیز!

ایک پاکستانی امریکہ گیا وہ وہاں کوئی کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اُس نے جلیبی کی دُکان کھول لی۔ اس کی دھڑا دھڑ بکری ہونے لگی ایک دفعہ اس کے پڑوسی دکاندار نے ایک امریکن سے پوچھا: "آخر تم لوگ جلیبی ہی کیوں خریدتے ہو۔ کوئی اور مٹھائی کیوں نہیں خریدتے؟"

اس نے جواب دیا: "دراصل ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس "ٹیوب" میں رس کیسے بھر جاتا ہے جبکہ کوئی سوراخ بھی نہیں۔"

صائرہ بانو — شادمان ٹاؤن، کراچی

بادشاہ: (مسخرے سے) اچھا ہوا تم آگئے۔ اس وقت میرا دل کسی مسخرے سے باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔"

مسخرہ: "بس میری بھی یہی کچھ کیفیت ہے۔"

محمد فیصل — پی آئی بی کالونی کراچی

ایک آدمی نے پوچھا "تمہارا ساتھی کس طرح زخمی ہوا؟"

دوسرے نے جواب دیا۔ "دراصل میرے ساتھی نے گھوڑے کے دانت گننے کے لئے اس کے منہ میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ گھوڑے نے منہ بند کر کے میرے ساتھی کی انگلیاں گننی شروع کر دیں۔"

رخسانہ جبیب ——— موسیٰ لین، کراچی

مجسٹریٹ (جیب کترے سے) "تم نے اس آدمی کی جیب سے بٹوا کس طرح نکالا کہ اسے پتہ ہی نہ چلا۔"

ملزم (غرور سے سر اُٹھا کر) "حضور، یہ فن سکھانے کی فیس پانچ سو روپے ہے!"

ملک محمد احسان اللہ ——— ولہ، ضلع گجرات

آدھی رات کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ گہری نیند سے چونک کر سیٹھ نے ریسیور اُٹھایا اور منمنے لگا پھر سخت غصے میں کہا۔ "نمبر کہیں کے تم نے غلط احمق ملایا ہے۔"

اورنگ زیب ——— سڈھانڈی (ضلع چکوال)

ایک آدمی کے گھر کے سامنے گدھا مرا پڑا تھا۔ اس نے میونسپل کمیٹی والوں کو فون کیا کہ "میرے گھر کے سامنے گدھا مرا پڑا ہے۔ اُٹھوالیں"۔

جواب ملا۔ "وہیں دفنا دو"۔

وہ آدمی کچھ دیر تک تو خاموش رہا، پھر جل کر بولا۔ "دفنا تو دیتا مگر میں نے سوچا، پہلے خاندان والوں کو اطلاع کر دُوں"۔

رانا گلزار الجدوکی — علی پور

یہ وقت بھی آنا تھا

ایک غیر مُلکی سیّاح امریکی آرٹ کی نمائش میں داخل ہونے کے لیے قطار میں کھڑا تھا اس نے اپنے پیچھے والے شخص سے کہا۔ "اس مُلک کا لباس عجیب ہے۔ اس بچّے کو دیکھو، نہ لڑکا ہے نہ لڑکی"۔

پیچھے کھڑے شخص نے جواب دیا۔ "لڑکی ہے"۔

سیّاح نے کہا۔ "آپ کو کیسے معلوم؟"

جواب ملا۔ "میں اس کی والدہ ہوں"۔

ذرینہ بانو — ملیر ہالٹ، کراچی

ہمارے ہاں کاریں دُھلتی ہیں پالش نہیں کی جاتی

ایک عورت دُکاندار کو بچّہ گاڑی کی آخری قسط ادا کر رہی تھی، دُکاندار نے پوچھا۔ "محترمہ! قسطیں تو آپ نے مکمّل کر دیں، بچّے کا کیا حال ہے؟"

عورت۔ "شکر ہے، آپ نے یاد کرا دیا۔ بچّہ ٹھیک ٹھاک ہے، یہ لیں اُس کی شادی کا دعوت نامہ ضرور آئیے گا"۔

گل مشیر علی — باڑہ گیٹ، پشاور

ایک آدمی کسی دوسرے شہر جانے لگا تو اُس کے دوست نے کہا کہ تم فلاں ہوٹل جاؤ وہاں کا منیجر میرا دوست ہے۔ میرا نام لینا وہ تم سے رعایت کرے گا۔ جب وہ شہر سے واپس آیا تو اُس کے دوست نے پوچھا۔ "جب تم نے میرا نام لیا تو اُس نے کیا کہا؟"

دوسرا دوست۔ "اُس نے کرایہ پیشگی مانگ لیا"۔

ابنِ مفرّح — گنجو خان روڈ، مردان

تیز رفتاری پر چالان تو ہو گا

ایک سکھ رات کے وقت موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ سامنے سے اُسے ٹھنڈی ہوا لگ رہی تھی۔ جس کا حل اُس نے یہ نکالا کہ کوٹ اُلٹا پہن لیا اور بٹن پیچھے کی طرف کر دیے۔ سردی سے بچنے کی اس نئی ترکیب پر وہ اتنا خوش تھا کہ ڈھلوان پر موٹر سائیکل پھسل گئی اور وہ دھڑام سے نیچے آرہا۔ کچھ دیر بعد وہاں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ موٹر سائیکل والا سکھ مرا ہوا پڑا ہے اور ایک دوسرا سکھ اس کے پاس کھڑا ہے۔

لوگوں نے اس سے پوچھا: "کیا ہوا ہے؟"

وہ بولا "جب میں یہاں پہنچا تو سردار جی کراہ رہے تھے۔ میں نے جھک کر دیکھا تو پتا چلا کہ گردن مڑ گئی ہے، میں نے زور لگا کر گردن سیدھی کر دی تب سے نہیں بولتے۔"

محمد ایوب مخدوم ———— چمن (کوئٹہ)

ایک دولتمند نے اپنے لیے مقبرہ بنوایا۔ جب وہ تیار ہو گیا تو اُس نے معمار سے پوچھا۔

"اب اس میں کیا چاہیئے؟"

معمار: "جناب آپ کا وجود!"

نویدہ تاج   اوکاڑہ

(گاہک، (دکاندار سے) "اِس سُوٹ کی کیا قیمت ہے؟"

دکاندار: "ایک سو روپے"

گاہک: "لاحول ولا قوۃ! اور اس سوٹ کی کیا قیمت ہے؟"

دکاندار: "دو لاحول ولا قوۃ!"

ولی محمد ———— لانڈھی، کراچی

دو آدمی آپس میں لڑ رہے تھے۔ لڑتے لڑتے ایک آدمی نے کہا "میں تمہارے چونتیس کے چونتیس دانت توڑ دوں گا۔"

یہ سن کر پاس ہی کھڑا ایک آدمی بول اُٹھا "بھائی صاحب، دانت تو بتیس ہوتے ہیں۔"

اس آدمی نے جواب دیا "مجھے پتا تھا کہ تو ضرور بولے گا، اس لئے دو دانت تیرے بھی شامل کر لئے تھے۔"

ہمایوں بشیر   ویسٹ رج، راولپنڈی

بڑے بے آبرو ہو کر.....

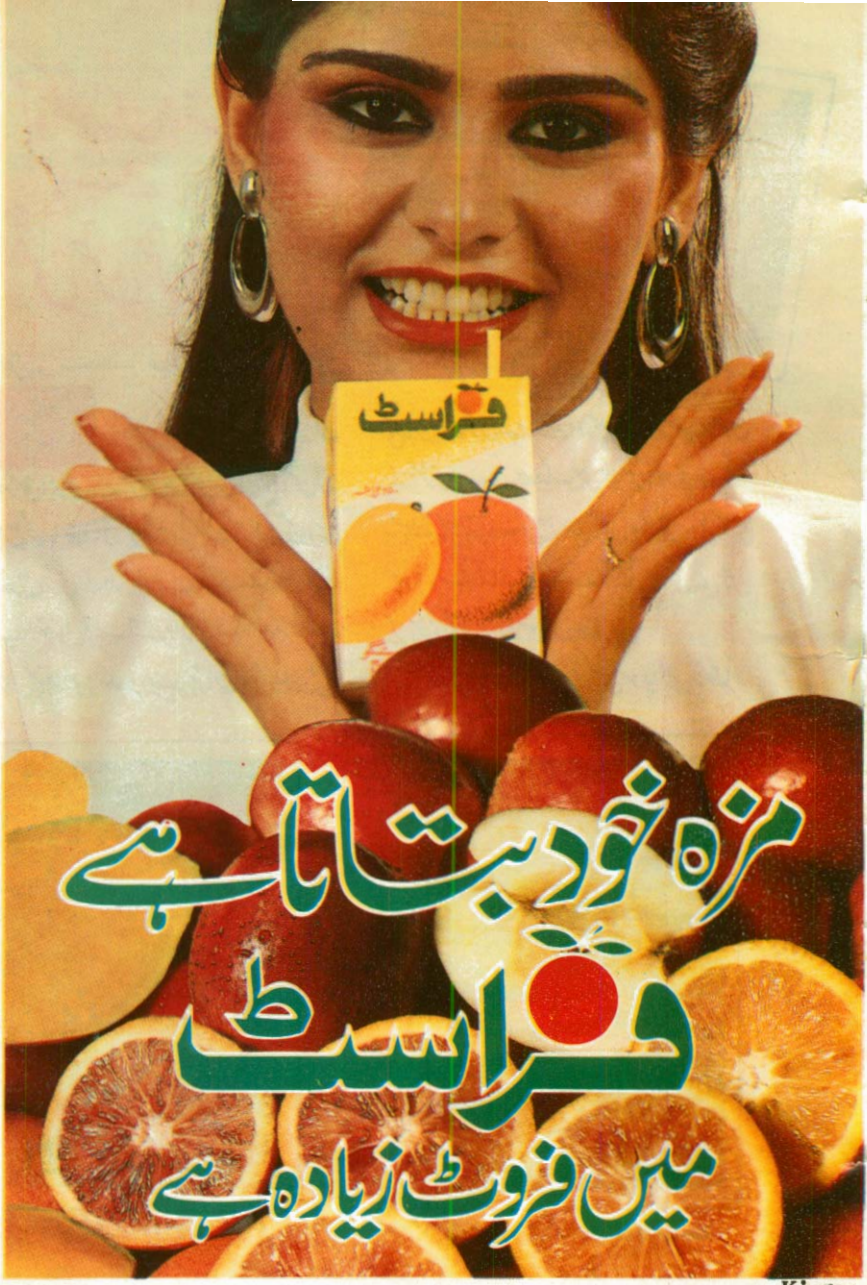

Kargar

آؤ گھومیں دُنیا پہلے قُسطُنطُنیہ

استنبول کا ایک خوانچہ فروش

سفر نامہ ——— عبیداللہ کیہر ———

صبح کی ہلکی ہلکی روشنی نے رات کے سرمئی اندھیرے میں سے نکل کر دن کو روشن کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ گزشتہ شام سے ریل کے اس ڈبّے میں تُرکی کے دارالحکومت انقرہ سے سوار تھے۔ اور اب استنبول قریب آنے والا تھا۔ دُور دُور تک کھیتوں کا سرسبز سلسلہ پھیلا ہُوا تھا۔ اور درخت پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے اور پھر ان سبز میدانوں کے آخری سِرے سے ایک نیلی لکیر سی اُبھری اور یہ لکیر پھیلتے پھیلتے ایک وسیع سمندر میں بدل گئی۔ ریل گاڑی بحیرۂ مَرمَر کے کنارے کنارے دوڑتی جا رہی تھی، جس کے آخری کنارے پر استنبول تھا۔

ارشدہ فہد اور اسد نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ

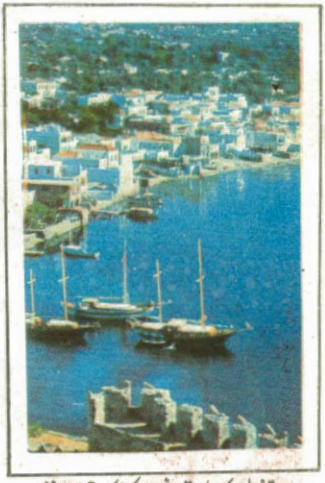

استنبول کے علاقے "غلطہ" کا ایک حسین منظر

باسفورس میں شہزادوں کے جزیرے

وہ اس طرح ترکی میں دندناتے پھر رہے ہوں گے۔

دراصل ان کے والد اقبال صاحب پی آئی اے میں ملازم تھے اور ان کا تبادلہ انقرہ میں ہوگیا تھا۔ ان کے تبادلے کے وقت تینوں بچوں کے امتحانات ہو رہے تھے۔ ابّو نے ترکی روانہ ہوتے وقت محنت کی تاکید کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ان کے امتحانات اچھے ہوگئے تو وہ ان تینوں کو ترکی کی سیر کے لیے بلوائیں گے... اور اب ان کے امتحانات ختم ہو چکے تھے اور تینوں نے محنت کر کے اچھے پرچے دیے تھے لہٰذا وہ ترکی میں تھے۔

کل صبح وہ انقرہ میں اپنے ابّو کے ساتھ ناشتہ کر رہے تھے تو اچانک ابّو نے کہا۔

"بچّو! کیوں نہ آج تمھیں یورپ لے جایا جائے؟"

"یورپ! وہ کیسے؟" تینوں حیرانی سے ابّو کو دیکھنے لگے۔

"میں سمجھ گیا۔" فہد نے ہاتھ اُٹھا دیا۔ "ابّو ہمیں استنبول لے جانا چاہ رہے ہیں۔"

"مگر استنبول تو ترکی کا ایک شہر ہے۔" ارشد اور اسد ابھی تک حیران تھے۔ "یہ یورپ کہاں سے آگیا؟"

"ارے بھئی تم لوگ جانتے نہیں۔ استنبول شہر کا آدھا حصّہ ایشیا میں ہے اور آدھا یورپ میں ان دونوں حصّوں کے درمیان سمندر کی ایک لکیر ہے جسے آبنائے باسفورس کہتے ہیں اور یہ لکیر ایشیا اور یورپ کو جُدا کرتی ہے اگر ہم باسفورس کے دوسرے کنارے پر چلے جائیں تو کیا ہم یورپ نہیں پہنچ جائیں گے؟" فہد نے اپنی خاصی تقریر کر ڈالی۔

"بس بھئی بس۔" اقبال صاحب نے ہنستے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے فہد کو خاموش کرایا۔ "ہاں تو لڑکو اب تم سمجھ گئے ہوگے کہ آج شام ہم استنبول روانہ ہو رہے ہیں۔"

اور وہ شام تک تیار ہوگئے تھے اور پھر انقرہ کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ریلوے اسٹیشن پہنچ کر استنبول جانے والی ٹرین میں سوار ہوگئے۔ اس گاڑی کو صبح استنبول پہنچنا تھا۔

رات بھر گاڑی اناطولیہ کے میدانوں میں دوڑتی رہی اور اب سورج طلوع ہو رہا تھا۔ صبح کے ٹھنڈے اور پُرنور ماحول میں گاڑی سمندر کے کنارے کنارے دوڑتی جا رہی تھی۔ مکانات، باغات اور کھیت غنودگی میں ڈوبے ہوئے تیزی سے پیچھے کی طرف غائب ہوتے جا رہے تھے۔ ریل کی کھڑکیوں سے ایک شہر کے آثار نظر آنا شروع ہوئے۔ سمندر میں کئی جہاز اور لانچیں تیزی سے چلتی پھرتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ تینوں رات بھر سوتے رہے تھے اور صبح اُٹھتے ہی یہ خوبصورت منظر دیکھ کر تازہ دم ہوگئے تھے۔

"فہد بیٹا! اپنا اپنا سامان سنبھالنے میں بھائیوں کی مدد کرو۔ استنبول آگیا ہے۔" ابّو نے کہا تو وہ چونکے، اور ہر ایک نے اپنا اپنا بیگ سنبھال لیا۔ جن میں ان کے دو دو جوڑے اور ٹوتھ پیسٹ برش وغیرہ تھے۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین حیدر پاشا اسٹیشن میں داخل ہوئی اور رُک گئی۔ گارڈ تمام ڈبّوں کے دروازوں پر زور زور سے ہاتھ مار کر "استنبول، استنبول" کی آواز لگاتا جا رہا تھا۔ تاکہ اگر کوئی سو رہا ہو تو جاگ جائے۔

"ارے! یہ کیا؟" اسد پلیٹ فارم پر اُترتے ہی چونکا اور ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے فہد اور ارشد بھی چونکے اور بات بھی واقعی حیران ہونے والی تھی۔ کیونکہ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے نیچے تانگوں، بسوں اور ٹیکسیوں کے بجائے کشتیاں کھڑی ہوئی تھیں اور سمندر کا پانی شڑاپ شڑاپ پلیٹ فارم سے ٹکرا رہا تھا۔ ابّو ان کو حیران دیکھ کر ہنسنے لگے۔

"ارے بھئی میں بتاتا ہوں۔" وہ بولے: "حیدر پاشا دراصل ایشیا کا آخری ریلوے اسٹیشن ہے اور یہ باسفورس کے کنارے پر ہے۔ اس کے بعد سفر بسوں کے بجائے فیری بوٹ میں ہو گا جسے یہاں "والور" کہتے ہیں۔ والور ہمیں استنبول کے یورپی حصّے میں پہنچا دے گی۔"

"اور یوں ہم یورپ پہنچ جائیں گے۔" فہد بولا تو سب ہنسنے لگے۔

کشتیاں اپنے بھونپو بجا بجا کر آجا رہی تھیں اور سمندر کی لہروں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ تینوں بھی ابّو کے ساتھ سنبھل سنبھل کر ایک کشتی میں چڑھے اور عرشے پر لگی بنچوں پر بیٹھ گئے۔ سمندر کی نم آلود فضا میں مچھلی کی ہلکی سی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ مگر چاروں طرف رنگ برنگی کشتیوں کی آمد و رفت دیکھ کر ان کو بہت مزہ آ رہا تھا۔ "مجھے منوڑہ یاد آ رہا ہے۔" ارشد نے ہنس کر کہا۔

تھوڑی دیر میں ان کی والور بھی بھر گئی اور بھونپو بجتے ہی کشتی کنارہ چھوڑ کر آگے بڑھنے لگی۔

"اس کا مطلب یہ ہُوا کہ ہم اپنا بڑا اعظم چھوڑ چکے۔" فہد نے حسرت بھرے لہجے میں کہا تو ابّو بھی ہنس پڑے۔

"ہاں ہم یورپ جا رہے ہیں۔" ابّو نے باسفورس کے دوسرے کنارے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جہاں شہر کی گنجان آباد عمارتوں میں سے مسجدوں کے سینکڑوں نوکیلے مینار اونچی اونچی عمارتوں کے ہجوم میں سے شہادت کی انگلی کی طرح اُبھرے ہوئے تھے۔ شہر کہیں سے اونچا اور کہیں سے نیچا لگ رہا تھا۔

"ابّو یہ شہر ایسا اونچا نیچا کیوں لگ رہا ہے۔" ارشد نے پوچھا تو ابّو مُسکرائے۔

"بھئی استنبول سات پہاڑیوں پر آباد ہے۔ اس لیے ایسا لگتا ہے۔" انھوں نے بتایا۔

کشتی میں ان کے ہمسفر تُرک اُنھیں نہایت محبّت سے دیکھ رہے تھے اس لیے کہ یہ پاکستانی تھے۔ ترک دُنیا میں سب سے زیادہ محبّت پاکستانیوں سے کرتے ہیں کیونکہ پاکستان بننے سے پہلے تحریک خلافت میں ہند و پاک کے مسلمانوں نے تُرکی میں خلافتِ عثمانیہ کی بقاء کے لیے سخت جدّوجہد کی تھی اور قربانیاں دی تھیں۔ تحریکِ خلافت کے رہنماؤں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور حسن علی آفندی کے بے مثال ایثار کی وجہ سے پاکستانی قوم کے لیے اُن تُرکوں کے دل آج بھی محبّت سے بھرے ہیں۔

ایک ادھیڑ عمر مہربان عورت نے اُنھیں ایک ایک چاکلیٹ دیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور "یخشی یخشی" کہہ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ یہ الفاظ اُنھیں ابّو نے سکھائے تھے۔ جن کا مطلب ہے "بہت اچھا"۔ کشتی نے دوسرے کنارے پر پہنچ کر اُنھیں یورپی استنبول میں اُتار دیا۔ یہ علاقہ غلطہ

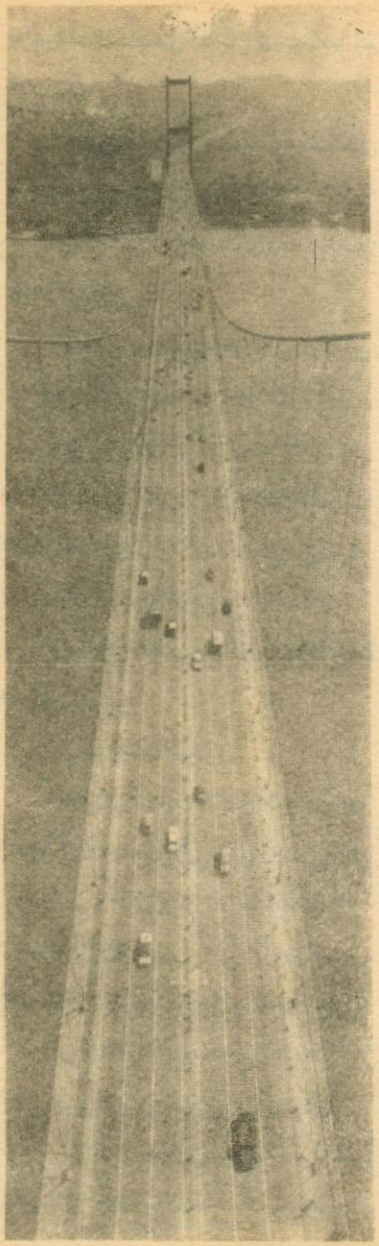

کہلاتا ہے۔ ابّو نے ایک ٹیکسی لی اور اُسے ہوٹلوں کی طرف چلنے کو کہا۔ ٹیکسی والا اُنھیں تارلا باشی کے علاقے میں لے آیا جہاں بہت سے ہوٹل تھے۔ ابّو ان کو لے کر "بلوار ہوٹل" میں اندر گئے۔ ہوٹل کے مینجر نے جب پاکستانیوں کو دیکھا تو اُس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اور وہ ان کا سامان اُٹھوا کر اپنے ہوٹل کے ایک بہترین کمرے میں لے گیا۔ "پاکستانی برادر۔ مُسلم برادر" وہ بار بار خوشی کا اظہار کر رہا تھا۔

انھوں نے ناشتہ وہیں کیا۔ تھوڑی دیر ستا کر کپڑے وغیرہ تبدیل کیے اور ابّو کے ساتھ باہر نکل آئے۔ بس اسٹاپ سے وہ ایک بس میں بیٹھے اور تقسیم چوک پر جا اُترے یہ استنبول کا مرکزی علاقہ تھا۔ جیسے کراچی کا صدر یا لاہور کا مال روڈ ہے۔ یہاں پر چوک کے بیچ میں مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک کا مجسمہ نصب تھا۔ اور فوارے چل رہے تھے۔ وہ لوگ جس سڑک پر چل رہے تھے وہ "جادۂ اِستقلال" کہلاتی ہے۔

"ابّو کتنی خوبصورت دکانیں ہیں"۔ اسد سڑک کے دونوں طرف سجی رنگ برنگی دکانوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ دکاندار زیادہ تر عورتیں تھیں۔

"ہوٹل بھی بہت اچھے ہیں"۔ فہد کو شاید بھوک لگ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ یونہی سیر کرتے رہے اور پھر ابّو اُنھیں لے کر ایک ریسٹورنٹ میں گئے۔ وہاں انھوں نے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور پھر دوبارہ سیر کے لیے باہر نکل آئے۔

ابّو نے ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ کر کچھ دیر بعد

وہ ایک بہت بڑے گنبد والی عظیم الشان عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔

"یہ کون سی جگہ ہے ابّو" ارشد نے حیرانی سے آنکھیں کھول کر اس عظیم الشان عمارت کو دیکھا۔

"یہ جامع مسجد سلطان احمد ہے" ابّو نے بتایا۔ "اسے نیلی مسجد بھی کہتے ہیں"

"ابّو سلطان احمد تو وہ پہلے مسلمان فاتح تھے جنھوں نے استنبول کو فتح کیا" فہد نے پھر معلومات کا دفتر کھولا۔

"ہاں وہ پہلا فاتح تھا۔ مگر اُس نے استنبول نہیں بلکہ قسطنطنیہ کو فتح کیا تھا۔ استنبول کو پہلے قسطنطنیہ کہا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے والے کے لیے جنت کی پیشگوئی کی تھی" ابّو نے بتایا۔

"اچھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سلطان احمد جنتی ہوئے" اسد نے اپنا سر ہلایا۔

"یقیناً" ابّو نے جواب دیا۔

"ابّو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی تو قسطنطنیہ کی فتح کی ابتدائی مہمات میں شامل تھے نا اور ان کا انتقال بھی یہیں ہوا تھا" فہد کہنے لگا۔ دراصل وہ اکثر ابّو کی لائبریری میں گھس کر موٹی موٹی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ اس لیے اُسے کافی باتیں معلوم ہو جاتی تھیں۔

"ہاں بیٹا! حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا روضہ بھی استنبول میں ہی ہے" ابّو نے اس کی تائید کی۔ وہ باتیں کرتے کرتے مسجد کے اندر پہنچ گئے تھے۔ اندر داخلے کے لیے انھیں ٹکٹ لینا پڑا تھا۔ کیونکہ اب یہ مسجد میوزیم میں تبدیل کر دی گئی تھی۔

قسطنطنیہ کی فتح سے پہلے یہاں پر عیسائیوں کی حکومت تھی۔ یہ مسجد بھی عیسائیوں کی عبادت گاہ ہوا کرتی تھی اور اُسے آیا صوفیہ کہتے تھے۔ مگر سلطان احمد نے اُسے مسجد میں تبدیل کر کے اُسے عظمت دے دی" ابّو کہہ رہے تھے اور وہ تینوں حیران ہو کر اس عظیم عمارت کو دیکھ رہے تھے، جس کا بے حد اونچا وسیع گنبد کئی چھوٹے چھوٹے گنبدوں کے سہارے پر کھڑا تھا۔ دیواروں پر طرح طرح کے ڈیزائن بنے ہوئے تھے اور عیسائی دور کی تصاویر بھی بنی ہوئی تھیں۔ جن میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی شبیہیں بنائی گئی تھیں۔

مسجد کے سات نہایت اونچے اونچے مینار تھے جو شہادت کی انگلی کی طرح سیدھے کھڑے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کر رہے تھے۔

مسجد کے گرد ایک بہت خوبصورت، سرسبز گھاس اور رنگ برنگے پھولوں والا پارک تھا۔ ان رنگین پھولوں میں چھوٹے چھوٹے ترکی بچے بھی پھولوں ہی کی طرح لگ رہے تھے جو اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ درمیان میں ایک حوض اور فوارہ تھا جس کا پانی نیلے آسمان تلے نیلا نیلا سا ہو رہا تھا مسجد کی سیر سے وہ کافی تھک گئے تھے۔ چنانچہ پارک میں بیٹھ کر سستانے لگے۔ جب وہ مسجد کے احاطے سے باہر نکلے تو شام ہونے والی تھی۔

یہ سفر ابھی ختم نہیں ہوا... ترکی کے حسین مناظر کی سیر کے لیے سفرنامے کا بقیہ اور آخری حصہ آئندہ ماہ ضرور پڑھیے۔

بے شک آنے والا وقت تمہارے لئے بہتر ہے اس وقت سے جو گزر چکا
اور بے شک تمہارا رب ایسی نعمتوں سے تم کو نوازے گا جو تم کو خوش کر دینگی۔

یہ الفاظ مبارک جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب
فرمائے، تمام سچے مسلمانوں کیلئے طمانیت کا پہلو رکھتے ہیں۔
آیئے ہم اللہ تعالےٰ کے حضور میں سر جھکا کر ان رحمتوں کا شکر
بجالائیں جو امتِ مسلمہ پر اب سے پہلے ہوتی رہیں اور عہد کریں کہ
آئندہ اور زیادہ عنایات کا مستحق بننے کی کوشش کرینگے۔
ایک فریضہ جو ہم پر عائد ہوتا ہے، نظام اسلام کی تعمیر ہے۔
جو بفضلہٖ تعالیٰ پاکستان میں شکل پذیر ہو رہا ہے۔
نیشنل بینک اس مبارک مہم میں حسبِ توفیق شریک رہے گا۔

نیشنل بینک آف پاکستان
قومی ترقی قومی بینک

United

PID-I-19/85

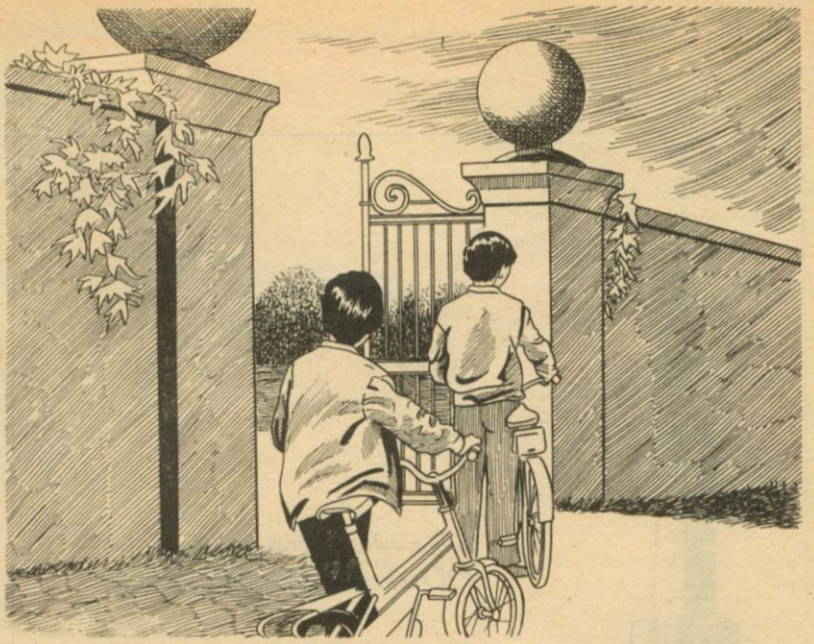

اظہر نیاز

قسط نمبر ④

دھماکہ

اس بار جو دھماکہ ہوا تھا، وہ اتنا شدید تھا کہ اُس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ذیشان کو ان دھماکوں نے پریشان کر رکھا تھا اور وہ سوچتا تھا کہ تخریب کار پکڑے کیوں نہیں جاتے؟ اس کے ابّو آغا صاحب پولیس کے اعلیٰ افسر تھے اور پولیس اکیڈمی۔ انسٹرکٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ دھماکوں کے سلسلے میں دو تخریب کار گرفتار کیے گئے مگر ان کی رہائی کے بے سفارشیں آنے لگیں۔ ذیشان اپنے ابّو کے ساتھ انہیں دیکھنے گیا۔ اُن میں سے ایک بلی آنکھوں والا اور دوسرا عام سا آدمی تھا۔ اُن دونوں کو بالآخر انسپکٹر احمد نے رہا کر دیا۔ شام کو ذیشان اپنی سائیکل پر جا رہا تھا کہ اُسے بلی آنکھوں والا کار سے اُتر کر جاتا نظر آیا۔ اس نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا اور اُس کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ شخص ایک اسٹور سے "بلیک مین" پرفیوم خرید کر گاڑی میں چلا گیا۔ ذیشان واپس گھر چلا۔ راستے میں اُس کی سائیکل ایک موٹر سائیکل سے ٹکرا گئی، جس سے وہ دونوں گر گئے۔ گھر پہنچ کر ذیشان کو پتہ چلا کہ اُس کی جیب میں ڈائری نہیں ہے۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ اُس کی سائیکل سے ٹکرانے والا آدمی وہی تھا، جسے اُس نے بلی آنکھوں والے کے ساتھ دیکھا تھا۔ اگلے دن کوئی آدمی ڈائری واپس کر گیا۔ ذیشان فوراً سائیکل لے کر اُس کی تلاش میں نکلا اور بالآخر اُس تک جا پہنچا۔ وہ شخص اُس سے بڑی اپنائیت سے باتیں کرنے لگا۔ مگر ذیشان مسلسل خطرے کی بُو محسوس کر رہا تھا۔ اور اُس کا اندازہ درست ثابت ہُوا۔ کیوں کہ اُن کی باتوں کے دوران ایک جیپ اُن کے پاس آ کر رُکی اور دو آدمیوں نے ذیشان کو قابو کر کے اُسے گاڑی میں ڈال دیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اُسے "بلیک مین" خوشبو کا جھونکا محسوس ہُوا۔ آغا صاحب کو ذیشان کی گمشدگی کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فوری طور پر اُس کی تلاش شروع کروا دی۔ لیکن اُس کا کوئی سُراغ نہ ملا۔ پھر ایک دن وہ بڑی خاموشی سے واپس آ گیا۔ آغا صاحب اور پولیس کے افسران، اُس سے معلومات کرنے لگے۔ مگر ذیشان کوئی خاص بات نہ بتا سکا۔ وہ اپنے طور پر بھی اُس جگہ کا سُراغ لگانے کا ارادہ رکھتا تھا، جہاں اُسے اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ یکایک فون کی گھنٹی بجی اور نامعلوم شخص نے آغا صاحب کو دھمکی دی کہ وہ ان کے راستے سے ہمت جائیں، ورنہ خطرناک نتائج کے لیے تیار رہیں۔ اس کال کے بعد ایسی تمام جگہوں کی نگرانی کا فیصلہ کیا گیا، جہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ اس کے اگلے دن لاہور کے ایک دینی جلسۂ عام میں دھماکے ہوئے اور بہت سے لوگ اور عالمِ دین شہید ہو گئے۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد کراچی کے بازار میں دھماکہ ہو گیا۔ ایک

افسر نے شک ظاہر کیا کہ جو بھی فیصلے کیے جاتے ہیں تخریب کار اُن سے کسی طرح آگاہ ہو جاتے ہیں، لہٰذا اس بات کا پتا لگانا چاہیے کہ وہ کس طرح میٹنگ کی گفتگو سنتے ہیں۔ ذیشان چھپ کر یہ ساری باتیں سُنتا رہا اور دل میں فیصلہ کیا کہ وہ خود تخریب کاروں کا کھوج لگائے گا۔ اس شک کے بعد کہ مجرم میٹنگ کی کارروائی سُن لیتے ہیں آغا صاحب کے گھر اور ملازمین کی تلاشی لی گئی، مگر کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ جدید ترین آلات سے لیس تلاشی پر مامور انسپکٹر شعیب نے شک ظاہر کیا کہ ٹرانسمیٹر ذیشان کے پاس ہے۔ آغا صاحب نے بڑی چالاکی سے ذیشان کی تلاشی لی، مگر اُس کے پاس سے کوئی چیز دستیاب نہ ہوئی۔ آغا صاحب نے یہ بات انسپکٹر شعیب کو بتائی تو اُسے شک ہوا کہ آغا صاحب اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں تلاشی اُسے خود لینی چاہیے تھی۔

اب آگے ملاحظہ کیجیے

آغا صاحب سخت پریشان تھے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کا اکلوتا بیٹا تخریب کاروں کے لیے کام کرے۔ کیا وہ بلیک میل ہو رہا ہے؟ اُسے کسی وجہ سے مجبور کیا جا رہا ہے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اغوا ہونے کے بعد ہی اس نے تخریب کاروں کے لیے کام شروع کیا ہے اور تخریب کاروں نے جو اُسے چھوڑ دیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اُسے اپنا ایجنٹ بنا کر میرے گھر بھیج دیا لیکن ذیشان اتنا ہوشیار کیسے ہو گیا کہ میری تلاشی کے باوجود وہ مجھ سے ٹرانسمیٹر چھپا گیا اور مجھے خبر نہیں ہونے دی کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ کوئی اور ذیشان ہو اور میرا بیٹا ذیشان تخریب کاروں کے قبضے میں ہو۔ نقلی ذیشان ہونے کے باوجود وہ ہر وقت اپنے پاس ٹرانسمیٹر کیوں رکھتا ہے۔ آغا صاحب نے بعد میں بھی اُسے کئی مرتبہ چیک کیا لیکن اُنھیں کوئی چیز نہ ملی اُنھیں یقین سا ہو گیا کہ یہ کوئی نقلی ذیشان ہے انھوں نے فوری طور پر اپنے تمام اہم کاغذات دوسری جگہ منتقل کر دیے اور میٹنگ کے لیے بھی دوسری جگہ منتخب کر لی!

ایک دن آغا صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے انھیں کیپسول کھانے کو دیے تھے۔ آغا صاحب نے کیپسول ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا اور سوچ کچھ اور رہے تھے جب کیپسول کھانے کے لیے انھوں نے منہ میں پھینکا تو وہ تالو سے جا کر چپک گیا اور پھر بڑی مشکل سے پانی کا ایک بڑا سا گھونٹ پی کر انھوں نے کیپسول کو حلق سے اُتارا اور اس کے ساتھ ہی وہ چونک پڑے۔ انھیں ایک خیال سُجھائی دیا تھا اور وہ یہ تھا کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ٹرانسمیٹر کا علم خود ذیشان کو بھی نہ ہو اور جب ذیشان کو اغوا کیا گیا تھا تو بہت ہی مائیکرو ٹرانسمیٹر کیپسول اس کے اندر کہیں چھپا دیا گیا ہو۔

آغا صاحب اُٹھے اور سیدھے ذیشان کے کمرے میں پہنچے اور انگلی کے اشارے سے اُسے خاموش رہنے کو کہا اور ایک کاغذ پر لکھا "ہم دونوں آپس میں کاغذ پر لکھ کر گفتگو کریں گے تم کسی صورت میں بھی بولو گے نہیں"۔ اس کے بعد آغا صاحب نے کاغذ پر لکھا "کیا تمھارے پاس کوئی ٹرانسمیٹر ہے؟"

ذیشان نے حیران ہو کر آغا صاحب کو دیکھا اور آغا صاحب نے خاموشی کا اشارہ کیا۔ ذیشان نے کاغذ پر لکھا "نہیں"۔

آغا صاحب آتے وقت ٹرانسمیٹر چیک کرنے کا آلہ اپنے ساتھ لیتے آئے تھے انھوں نے اُسے ذیشان کے

پورے جسم پر مختلف جگہوں پر لگا کر دیکھا تو اُن کا خیال درست نکلا۔ کوئی مائیکرو ٹرانسمیٹر کیپسول ذیشان کے جسم کے اندر کہیں موجود تھا جس کی مدد سے تخریب کار اپنے ہیڈ کوارٹر میں موجود رہ کر بھی آغا صاحب کے گھر میں ہونے والی تمام گفتگو سُن سکتے تھے۔

آغا صاحب نے ذیشان کو تمام تفصیل بتائی اور لکھا۔ "اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ جب تک اس کا انھیں علم نہیں تھا یہ ٹرانسمیٹر ہمارے لیے خطرناک تھا لیکن چونکہ اب ہمیں پتہ چل گیا ہے اس لیے تمھارے جسم میں موجود یہ ٹرانسمیٹر ہمیں تخریب کاروں تک پہنچنے میں مدد دیگا اور امید ہے تم ہماری مدد کروگے"۔ ذیشان نے بھی لکھ کر اپنے ابو کو یقین دلایا۔ "آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا"۔

● آغا صاحب نے فوری طور پر اپنے اسکواڈ کے تمام افسران کو طلب کیا اور ایک خفیہ مقام پر ساری صورت حال ان کے سامنے رکھی۔ اس میٹنگ میں دو باتیں طے کی گئیں۔ ایک تو یہ کہ آئندہ دو میٹنگ ہوا کریں گی۔ ایک میٹنگ جو گھر سے باہر کسی خفیہ جگہ پر ہوگی جس پر ہم اپنے اصل منصوبے کو زیرِ بحث لایا کریں گے اور دوسری میٹنگ آغا صاحب کے گھر ہوا کرے گی جس میں خاص طور پر ذیشان کو ایک سمت بٹھا دیا کریں گے اور کوشش کریں گے کہ تخریب کاروں کو غلط معلومات پہنچیں اور وہ کسی طرح ہمارے پھندے میں پھنس جائیں۔ دوسری بات یہ طے پائی کہ ذیشان کے گلے میں فوری طور پر ایک لاکٹ ڈال دیا جائے۔ اس لاکٹ کی خوبی یہ ہوگی کہ ذیشان جہاں بھی ہوگا اس کے بارے میں ہمیں اطلاع رہے گی۔ خطرہ ہے کہ تخریب کار پھر ذیشان تک پہنچنے کی کوشش کریں گے یا اُسے اغوا کریں گے۔ اس وقت ذیشان ہمارے اس مشن کا بہت ہی اہم مُہرہ ہے اور اس کی حفاظت ہم سب کا قومی فریضہ ہے۔

تمام افسران نے اپنے اپنے ماسٹر پلان بھی آغا صاحب کے حوالے کر دیے تھے اور آغا صاحب نے ایک کمیٹی بنا کر وہ تمام پلان کمیٹی کے حوالے کر دیے کہ وہ ان تمام منصوبوں کی روشنی میں ایک قابلِ عمل گرینڈ پلان تیار کرے۔

آغا صاحب نے گھر آتے ہی ذیشان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے گلے میں لاکٹ پہنا دیا اور لکھ کر تمام تفصیل بتا دی اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اس لاکٹ کی سائیڈ میں جو بٹن ہے یہ اس لیے ہے کہ اگر کسی وقت تم محسوس کرو کہ تمھاری جان کو خطرہ ہے، تم تخریب کاروں کے نرغے میں پھنس گئے ہو تو یہ بٹن دبا دینا پولیس کو فوری طور پر خطرے کا پتہ چل جائے گا اور اس لاکٹ کی مدد سے وہ نہ صرف تمھاری مدد کو پہنچ سکیں گے بلکہ اس طرح وہ تخریب کاروں تک بھی پہنچ جائیں گے۔

پورے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ دھماکے ہو رہے تھے۔ بینک لُوٹے جا رہے تھے اور اب تو

صورتِ حال یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ تخریب کاروں دہاڑے کلاشنکوف بندوقیں ہاتھوں میں لیے دفاتر میں گھس جاتے اور سیف سے جتنی رقم ہاتھ لگتی لے اُڑتے۔ گھروں میں گھس جاتے اور ڈاکہ ڈال کر چلتے بنتے اور جاتے وقت دھمکی دے جاتے کہ اگر پولیس میں رپورٹ لکھوائی تو آئندہ گھر کے کسی فرد کو نہیں چھوڑیں گے۔ لوگ ڈر کے مارے پولیس رپورٹ نہیں لکھواتے تھے اور اس طرح حکومت کے لیے یہ پتہ چلانا دشوار ہو رہا تھا کہ پورے مُلک میں روز کتنی وارداتیں ہوتی ہیں۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ ذیشان نے پہلے تو اپنے ابّو کے ساتھ شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی اور پھر ان سے اجازت لے کر اپنے دوست طارق کے گھر رُک گیا اور اس کے ساتھ مل کر ویڈیو گیم کھیلنے لگا... وہ طارق سے تخریب کاروں کے متعلق ہی گفتگو کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "یار طارق ایک ایسی ویڈیو بھی ہونی چاہیئے جس میں پولیس اور تخریب کاروں کا مقابلہ ہو اور تم دیکھو کہ میں سب سے زیادہ اسکور کروں ایک تخریب کار کو بھی زندہ نہ چھوڑوں" ابھی تخریب کاروں کا خاتمہ جاری تھا کہ طارق کے ملازم نے آکر بتایا کہ ذیشان کا ٹیلی فون ہے۔ ذیشان نے سمجھا کہ شاید ابّو یا امّی ہوں گے میری خیریت معلوم کرنا چاہتے ہوں گے، لیکن وہ کوئی اور تھا

"آپ کون ہیں؟" ذیشان نے پوچھا۔

"میں ... مجھے تم ایک خطرہ سمجھو، جو تمہارے گھر کے گرد منڈلا رہا ہے" ریسیور کی دوسری جانب کوئی اجنبی آواز تھی۔

"تم نے مجھے فون کیوں کیا ہے" ذیشان نے پوچھا۔

"اس لیے کہ تمہارے ابّو کی جان خطرے میں ہے"

"کیا مطلب؟" ذیشان پریشان ہو گیا۔

"مطلب یہ ہے کہ ہم جس وقت چاہیں تمہارے ابّو کو ایک ہی بم کے دھماکے سے اُڑا سکتے ہیں۔ ان کے جسم کا ایک بھی ٹکڑا تم نہ دیکھ سکو گے" دوسری طرف ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی پھر اس آواز نے کہنا شروع کیا۔

"میری بات غور سے سنو۔ اگر تم اپنے ابّو کی جان چاہتے ہو تو ہمارا ایک کام کر دو"

"کیا کام ہے؟" ذیشان کے منہ سے لفظ نہیں نکل رہے تھے اور سارا جسم پسینے سے بھیگ گیا تھا۔

"معمولی کام ہے، تمہارے لیے تو بہت ہی معمولی کام ہے تمہارے ابّو کے کمرے میں ایک فائل موجود ہے جس میں تخریب کاروں کی سرکوبی کے لیے گرینڈ پلان ہے۔ اس فائل کی ایک فوٹو اسٹیٹ ہمیں پہنچا دو"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا" ذیشان چلّایا "میں تخریب کاروں کے لیے کام نہیں کر سکتا"

"آہستہ بولو" دوسری طرف سے آواز آئی "کوئی تمہاری آواز سُن بھی سکتا ہے"

ذیشان نے اِدھر اُدھر گھبرا کر دیکھا۔

"اگر تم تخریب کاروں کے لیے کام نہیں کر سکتے تو پھر ٹھیک ہے۔ اپنے ابّو کی موت کے لیے تو کام کر سکتے ہو۔ میں تمہیں آخری بار کہہ رہا ہوں۔ کل شام تک وہ فائل چُرا کر اپنے گھر کے قریب ترین فوٹو اسٹیٹ مشین تک پہنچ جاؤ۔ ورنہ کل شام کو تمہارے ابّو کی لاش تمہارے گھر پہنچ جائے گی"

اس سے پہلے کہ ذیشان کچھ اور کہتا دوسری طرف سے ٹیلی فون ریسیور رکھ دیا گیا۔ ذیشان سخت اُلجھن میں پھنس گیا تھا وہ ٹیلی فون ریسیور کریڈل پر رکھ کر واپس طارق کے پاس آگیا۔

"کس کا فون تھا؟" طارق نے پوچھا۔

"وہ ابّو کا تھا" ذیشان نے گھبرا کر جواب دیا "کہہ رہے تھے کہ گھر جلدی آجانا" وہ طارق سے اب کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔ طارق کے گھر سے اُٹھ کر وہ اپنے گھر آگیا اور بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔ آخر اُس نے فائل چُرانے کا فیصلہ کر لیا۔

● ذیشان نے آغا صاحب کے کمرے میں فائل تلاش کرنا شروع کر دی لیکن اُسے فائل نہیں مل رہی تھی۔ شاید اُس کے ابّو ساتھ لے گئے تھے۔ فائل کی تلاش کے دوران ایک دراز سے چند چابیاں ملیں۔ ذیشان نے ان چابیوں کی مدد سے دوسری درازیں اور الماریاں کھول کر فائل کی تلاش شروع کر دی۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کوئی اُسے دیکھ نہ لے کیونکہ آغا صاحب نے آج کل گھر کے ملازمین میں بھی خفیہ پولیس کے آدمی شامل کر دیے تھے۔ اور پھر یہ بھی ڈر تھا کہ امّی اس کی تلاش میں یہاں نہ آجائیں۔ حالانکہ وہ دیکھ آیا تھا کہ امّی کچن میں مصروف تھیں اور باورچی کو رات کے کھانے کے بارے میں کچھ ہدایات دے رہی تھیں۔ ذیشان بہت جلدی میں فائل تلاش کر رہا تھا اور بار بار دروازے کی طرف بھی دیکھ رہا تھا کہ کوئی آتو نہیں رہا۔ ذیشان نے اُوپر کی دراز کھولی تو اس میں صرف ایک ہی فائل موجود تھی اور وہ وہی ذیشان کی مطلوبہ فائل تھی۔ ذیشان نے دروازے کی طرف دیکھا اور جلدی سے فائل نکال کر تمام دراز اور الماریوں کے دروازے اُسی طرح بند کر دیے اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کسی طرح گھر کے لوگوں کو چکّر دے کر فوٹو اسٹیٹ مشین تک پہنچ جائے۔ آخر اُسے موقع مل گیا اور وہ فائل چھپا کر گھر سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے گھر کے قریب ترین گولڈن جنرل اسٹور میں فوٹو اسٹیٹ مشین تھی۔ وہاں پہنچ کر اُس نے فائل کے ہر صفحے کی ایک ایک نقل بنانے کے لیے کہا۔ ابھی پہلے صفحے کی نقل ہی بنی تھی کہ "بلیک مین خوشبو" جنرل اسٹور میں داخل

ہوگئی یہ وہی شخص تھا۔ گورا چٹا، بلی آنکھیں، سنہرے بال، تھور کے کانٹوں کی طرح مونچھیں، سفید ریچھ جیسا قوی الجثہ غیر ملکی لیکن پاکستانی لباس میں آتے ہی ذیشان سے بے تکلفی سے مخاطب ہوا۔

"ہاں! تو بیٹے فوٹو اسٹیٹ ہوگئی؟" پھر دکاندار سے کہنے لگا "ذرا جلدی"

اُسے اُردو بولنے میں دقت ہو رہی تھی لیکن وہ کافی ٹھیک اردو بول رہا تھا۔ وہ تمام نقول خود اُٹھا رہا تھا اور اصل ذیشان کو دیے جا رہا تھا بلکہ اشارہ کر دیتا کہ اصل ذیشان اُٹھالے وہ اصل کاغذات کو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتا تھا۔ جب فائل مکمل طور پر فوٹو اسٹیٹ ہوگئی تو بل اس نے خود ادا کیا اور ذیشان کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے باہر لے آیا۔ سخت گھبراہٹ کے باوجود ذیشان نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا ہوا تھا اور آج وہ کسی قیمت پر بھی اس کے ساتھ جانے کو تیار نہ تھا اور اُس نے پکا تہیہ کر لیا تھا کہ وہ لاکٹ کا بٹن دبا دے گا۔

بلیک مین خوشبو لگائے ریچھ نے باہر جا کر ذیشان کے کندھوں سے ہاتھ اُٹھا لیا اور ذیشان سے بے پروا، اپنی پجیرو میں جا کر بیٹھ گیا۔ جس کے اندر دو تین افغانی کلاشنکوف سنبھالے بیٹھے تھے۔

گھر پہنچ کر اُس نے چپکے سے فائل اپنی جگہ پر رکھ دی اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ اُس نے کیا کیا؟ اچھا کیا یا بہت بُرا کیا؟

ذیشان سوچ رہا تھا کہ آج ابو جب آئیں گے تو انھیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دے گا کہ اس سے بڑی بھاری غلطی ہو چکی ہے لیکن اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں تھا۔ اب وہ جو کرنا چاہیں کر لیں تاکہ جلد از جلد ایسے اقدامات کیے جا سکیں کہ تخریب کار اس گرینڈ پلان سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔

ذیشان نے اپنے دوست کے گھر جانے کا بہانہ کیا اور طارق کو لے کر دونوں سائیکل پر سیر کو نکل گئے۔

ذیشان نے ابھی تک طارق کو کچھ نہیں بتایا تھا اور اس وقت بھی وہ سیکٹر زیڈ میں گھوم رہا تھا اس کا خیال تھا کہ تخریب کاروں کا خفیہ ہیڈ کوارٹر اسی علاقے میں ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کبھی اکیلا اور کبھی طارق کے ساتھ اس سیکٹر میں گھومتا رہا تھا۔ جب اُسے اغوا کیا گیا تھا تو اُس نے چند ایسی نشانیاں ذہن نشیں کر لی تھیں جو اس علاقے میں پائی جاتی ہیں۔ وہ ابھی تک اپنے شک کو یقین میں بدلنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ ذیشان اچانک ایک اسٹریٹ کے سامنے رُک گیا اور طارق کو واپس مڑنے کا اشارہ کیا۔ یہی اسٹریٹ تھی اور اس اسٹریٹ کے ایک بڑے سے گھر کے اندر کئی گاڑیوں کے ساتھ بلیک مین خوشبو کی سُرخ پجیرو جیپ کھڑی تھی۔

ذیشان اُس جیپ کو دیکھ کر اتنا گھبرایا کہ اس کا نمبر بھی دیکھنا بھول گیا اور فوراً وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُسے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ تخریب کاروں کے خفیہ اڈے کا پتہ چلانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ (باقی آئندہ)

ایم افضل

چور بھالو

جمعہ کی نماز کے بعد محلے کی مسجد میں نماز کمیٹی کی میٹنگ تھی۔ اس کمیٹی میں کاشف کے ابو بھی ایک ممبر کے طور پر شریک تھے۔ میٹنگ کے دوران کاشف بھی مسجد میں رک گیا زیر بحث مسئلہ تھا چندے کے ان پچیس ہزار روپوں کا کیا کیا جائے جو مسجد کی تعمیر کے بعد بچ گئے تھے۔ کسی کی رائے تھی کہ مسجد میں دو ائیر کنڈیشنڈ لگوا دیئے جائیں۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ اِس رقم سے مسجد کی مزید آرائش کی جائے یعنی میناروں، گنبدوں اور دیواروں پر میناکاری کرالی جائے۔ ایک ممبر کا کہنا تھا کہ مسجد کے مینار کو ان پیسوں سے کچھ اور اُونچا کرالیا جائے۔ کیوں کہ محلے کی مسجد کا مینار بہت اونچا بن رہا تھا اور اس پر سجاوٹ کا کام بھی عمدگی سے ہو رہا تھا۔ اُس مسجد کے مینار کا ذکر ہوا تو یہ بھی پتہ چلا کہ دورانِ تعمیر ایک مزدور مینار سے نیچے گلی میں گر پڑا تھا۔ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ کافی بلندی سے گر کر بھی وہ بچ گیا تھا کیونکہ نیچے گلی

میں گٹر کئی دنوں سے بند پڑا تھا۔ جس کی وجہ سے گلی میں آدھ فٹ پانی اپنی اصل سطح سے اوپر کھڑا تھا اور مزدور کو پانی میں گرنے سے بہت معمولی چوٹیں آئیں تھیں۔ ہر کوئی اِسے معجزہ قرار دے رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ شہر میں اس گلی کا گٹر اور دوسرے گٹر کبھی معجزے سے ہی کھلتے تھے۔ جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو کاشف نے بھی معذرت کر کے بولنے کی اجازت لی۔ اس نے کہا "وہ نماز کمیٹی کا رکن تو نہیں اور چھوٹا منہ بڑی بات کے باوجود وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ جمعہ کے خطبے میں مولوی صاحب نے فرمایا تھا کہ خدا تعالیٰ کا فرمان ہے کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ مسجد کی مناسب تعمیر ہو چکی ہے اور اب مزید مینا کاری اور سجاوٹ یا ائیر کنڈیشنڈ فضول خرچی کے سوا کچھ نہیں اور نہ ہی جگہ جگہ مینار بلند کرنے میں ہم قومی سطح پر بلند ہو رہے ہیں۔ دوسرے محلے کے بلند مینار سے گر کر مزدور گٹر کے پانی سے بچ گیا تو یہ معجزہ نہیں محض اتفاق تھا۔ مسجدوں کے پاس گٹروں کے رُکے ہوئے گندے پانی اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کیا صفائی یعنی نصف ایمان ہے" یہ سن کر حیرانی سے لوگ کاشف سے پوچھنے لگے۔ بیٹے تم کہنا کیا چاہتے ہو" اس پر کاشف نے کہا "سڑک کی طرف، مولوی صاحب کے حجرے کے برابر جو مسجد کا دوسرا کمرہ ہے۔ اُسے اِس بچی ہوئی رقم سے اچھی اچھی تاریخی و علمی کتابیں خرید کر لائبریری بنا دیا جائے تو میرے خیال میں اس بچی ہوئی رقم کا استعمال سب سے بہتر ہو گا۔ بچے اِدھر اُدھر پھر کر اپنا وقت ضائع کرتے ہیں ان کے لئے یہ اچھا ہو گا" یہ سن کر مولوی صاحب نے اعتراض کیا کہ بچوں کے شور اور شرارتوں سے عبادت میں خلل ہو گا۔ مگر جلد ہی ایک صاحب نے مولوی صاحب کو بتایا کہ ہمارے یہاں انگریزی راج سے پہلے ہماری مسجدیں ہی اپنی تعلیم کے ساتھ مکتبوں کا کام بھی دیتی تھیں۔ نماز کمیٹی کے سارے ممبران نے کاشف کی تجویز کو پسند کیا۔ اور یوں مسجد کے ایک خالی حجرے کو لائبریری بنانے کے لئے ایک انتظامیہ کمیٹی بنا دی گئی

نماز کمیٹی کی میٹنگ سے فارغ ہو کر جب کاشف اپنے ابّو کے ساتھ گھر واپس لوٹ رہا تھا تو راستے میں ایک جگہ لوگوں کا ہجوم تھا قریب جا کر پتہ چلا کہ علاقے کا کالا چور نامی آدمی کسی دکان سے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے اور لوگ اسے مار رہے ہیں۔ کاشف کے ابّو نے کہا اِسے مت مارو پولیس کے حوالے کر دو۔ ان کے کہنے پر لوگ اُسے پولیس چوکی تو لے گئے مگر وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ یہ عادی چور ہے سزا کاٹ کر پھر آ جائے گا اور یہی دھندہ کرے گا۔ کاشف نے اپنے ابّو سے پوچھا کہ یہ شخص چور کیوں بنا؟ اور یہ کہ سزا کاٹ کر بھی یہ چوری کرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتا کاشف کے ابّو نے بتایا کہ اس شخص کے والدین بہت غریب تھے وہ اسے پڑھنا لکھانا تو کیا اُسے دو وقت کی روٹی بھی میسّر نہ کر سکے۔ کھانے پینے کی چھوٹی موٹی

چیزیں چرانے اور بار بار پٹنے سے یہ شخص بڑا ہو کر عادی چور ہو گیا اور اب پولیس کی مار اور سزا بھی اسے سُدھار نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ تشدد سہنے کا عادی ہو گیا ہے کاشف کو یہ سن کر دھچکا لگا کہ بچپن میں اگر علاقے کے کھاتے پیتے اس بچے کا خیال کرتے تو یہ آج اس حالت میں نہ ہوتا۔ نہ معلوم ایسے کتنے بچے غربت کی گود میں پل کر غلط راہوں پر بھٹک جاتے ہیں۔ مگر اُس آبادی میں لوگوں کے اتنے مسائل تھے کہ کاشف کا ذہن ان کے حل کے لئے سوچ سوچ کر تھک جاتا۔ صفائی، ٹریفک، غربت، ملاوٹ اور ایسی ہی دوسری برائیوں کے لئے اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے علاقے کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ مِل کر اپنی مدد آپ کے تحت ضرور کچھ کرے گا۔ چند ہی دنوں بعد مسجد سے ملحقہ کمرے میں بچوں کے لئے ایک شاندار لائبریری بن گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ محلے کے لڑکے جو اپنا بیشتر وقت دکانوں کے تھڑوں اور گلیوں کی نکڑوں پر کھڑے ہو کر ضائع کرتے تھے۔ اب اپنا فارغ وقت مطالعے میں گذارنے لگے اور یوں ہر روز کے لڑائی جھگڑے بھی کم ہو گئے تھے۔

وقت پَر لگا کر اُڑ رہا تھا کہ کاشف کو چھوٹی عمر کے بچوں نے ایک بڑے ہی عجیب و غریب مسئلے کے بارے میں بتایا۔ چونکہ رات کو لوڈشیڈنگ سے اسٹریٹ لائٹ اکثر و بیشتر بجھی رہتی تھی اس لئے کئی بچے جو شام ڈھلے باہر سودا سلف لینے جاتے تو تنہا پا کر ایک بھالو نما جاندار غُرّا کر ان سے پیسے چھین لیتا اور لوگوں کے بہتیرا تلاش کرنے کے باوجود وہ ہاتھ نہ آتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ خیال لوگوں میں مضبوط ہوتا گیا کہ یہ کوئی ہوائی چیز ہے جو کہیں سے آ کر لوگوں کو تنگ کر رہی ہے۔ کاشف نے جب یہ سنا تو اسے اس بات سے اتفاق نہ ہوا۔ ایک تو وہ اپنے ابّو سے سن چکا تھا کہ ہوائی جہاز، راکٹ، ہیلی کاپٹر اور اُڑنے والے پرندے تو ہوائی ہو سکتے ہیں مگر اس کے علاوہ کوئی ہوائی چیز نہیں ہوتی اور یہ جہاں تعلیم کی کمی ہوتی ہے کچھ چالاک لوگ اس قسم کی افواہیں یعنی ہوائیاں چھوڑ دیتے ہیں جو سادہ لوح لوگوں کو صرف بے وقوف بنانے کے لئے ہوتی ہیں۔ چنانچہ بڑے غور کے بعد کاشف نے یہ عزم کیا کہ وہ ضرور اس نئی مصیبت کا پتہ لگا کر چھوڑے گا۔ اس نے فوراً اس بچے سے رابطہ کیا جس سے یہ بھالو نما جاندار اکثر پیسے چھین چکا تھا۔ اس نے بھالو نما جاندار کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں۔ اور پھر پلاسٹک کا نقلی پستول خریدا۔

ایک شام جب رات ڈھلنی شروع ہوئی تو کاشف حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں اس جانب گیا جہاں وہ بھالو نما جاندار اکثر دیکھا گیا تھا۔ ایک دو گلیوں کے موڑ کاٹ کر وہ قصبے کے اس عقبی حصّے کی طرف اکیلا چل دیا جہاں لوگوں کا بہت کم آنا جانا تھا۔ ایک ویران سی جگہ پر ایک پُرانا مقبرہ تھا۔ جس کی دیواروں

کے پاس جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ سنسناتی ہوا کا کوئی جھونکا کبھی کبھار اُسے چھُو کر گذر جاتا کاشف پر کچھ دیر تو گھبراہٹ طاری ہوئی مگر جلد ہی اس نے اپنے حواس پر قابو پایا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔ جب وہ ایک جھاڑی کی اوٹ سے گذر رہا تھا تو پیچھے سے آکر اچانک کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ کاشف سنبھل کر جلدی سے ایک طرف کو ہٹا۔ سامنے کچھ فاصلے پر بھالو نما جاندار کھڑا اس پر غرّا رہا تھا۔ اور پھر پھٹی سی آواز میں کہنے لگا "شمبو شا! لڑکے چپکے سے سارے پیسے دے دے۔ نہیں تو گلا دبا کر اس جھاڑی میں پھینک دوں گا۔ صبح کتے تیرا ناشتہ کریں گے"۔ کاشف نے پیسے نکالنے کے بہانے جلدی سے پستول نکال کر تان لیا۔ اور بولا تم جو بھی ہو میرے آگے چلو نہیں تو گولی مار دوں گا۔"

کاشف یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ جسے لوگ ہوائی کہہ رہے تھے وہ زمینی نکلی۔ وہ بھالو نما جاندار بڑی خاموشی سے آگے آگے چلنے لگا۔ جلد ہی وہ قصبے کی دکانوں کے قریب آ گئے۔ پہلے تو وہاں موجود لوگ بھالو نما جاندار کو دیکھ کر ڈرے اور بھاگنے کو تھے کہ کاشف کی پکار پر لوگ رُک گئے۔ قریب آکر کاشف نے لوگوں کو بتایا کہ اس سے مت ڈرو یہ کوئی جن بھوت نہیں۔ ذرا اس کے کمال والے کپڑے تو کھینچو۔ لوگوں نے جرأت کر کے جب اُس بھالو نما جاندار کے موٹے اور بھدّے سے کپڑے کھینچے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ ان موٹے اور بھدّے کپڑوں کے اندر سے کالا چور برآمد ہوا تھا۔ جواب ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔ اب لوگوں کو یہ پتہ چل چکا تھا کہ جھوٹ مُوٹ کا بھالو بن کر چھوٹے بچوں کو اکیلے دیکھ کر ان سے پیسے چھین لیتا تھا اور چوری کے ساتھ اس نے نیا دھندہ بڑی چالاکی سے اپنایا تھا۔ لوگوں نے اس کی پٹائی کرنا چاہی مگر کاشف نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا اور نہ ہی اُسے پولیس چوکی لے جانے دیا کاشف نے اُسے اس وعدے پر چھوڑ دیا کہ وہ کل صبح ان کے ہاں آئے گا۔ مگر کسی پچھلے گیٹ یا کھڑکی کے راستے سے نہیں بلکہ مین گیٹ سے۔ اور واقعی دوسری صبح کالا چور کاشف کے ہاں اُس کے ابّو کی موجودگی میں آ گیا۔ انہوں نے اس سے نفرت کرنے کی بجائے پاس بٹھا کر پوچھا۔ کیا تم محنت مزدوری کرو گے؟

اور اسے عزت کی زندگی اور مزدوری کی عظمت کے بارے میں بتایا تو وہ مان گیا۔ کاشف نے اسے لائبریری میں جھاڑ پونچھ کے کام پر لگا دیا اور چندہ اکٹھا کر کے اُسے مناسب تنخواہ بھی دی جانے لگی۔ اور سب سے بڑھ کر کاشف نے تعلیم بالغاں کے ایک پروگرام کے تحت کالے چور کو پڑھنا لکھنا سکھا دیا اور یوں وہ بدنامی کی مدت کی زندگی کے بعد کالے چور سے شرافت علی یعنی اپنے اصل نام سے پکارا جانے لگا۔

گرمی

پروفیسر عنایت علی خاں

گرمی کا ہے زمانہ — تم دھوپ میں نہ جانا
آتا ہے یوں پسینہ — دُو بھر ہُوا ہے جینا
دوپہر میں نہ نکلو! — لُو لگ نہ جائے تم کو
اور جب بھی گھر سے نکلو — پانی بہت سا پی لو
کتنی ہی لُو چلے گی — تم کو نہیں لگے گی
آئس کریم کھاؤ — شربت پیو پلاؤ!
باغوں سے آم آئے — سب نے خوشی سے کھائے
ککڑی بھی آ رہی ہے — مخلوق کھا رہی ہے
تربُوز چل رہے ہیں — دانے نکل رہے ہیں
چھٹی کے روز لڑکے — نکلیں ہیں گھر سے تڑکے
نہروں پہ جا رہے ہیں — جا کر نہا رہے ہیں
تم بھی چلو نہانے — مر جائیں گرمی دانے
چھوٹی جو نہر دیکھو — اس نہر پہ نہاؤ
بس پاس ہی نہانا — گہرائی میں نہ جانا
پیڑوں پہ سب پرندے — پر جوڑ کر ہیں بیٹھے
سائے میں تم بھی بیٹھو — اور ایک بات سوچو
جو دھوپ گرمیوں کی — ہے جسم کو جلاتی
یہ کام بھی ہے آتی — غلّہ بھی ہے پکاتی
گودے رہی ہے رحمت — پر ہے خُدا کی رحمت

یکجہتی کا مینار

۱۱ سالہ گموئیل مارٹینز انسانوں کے اس مینار پر سب سے اوپر کھڑا ہے۔ دیکھنے والوں کی سانسیں رُکی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے ۹ سالہ بھائی پیڈرو کے اوپر کھڑا ہوا ہے۔ یہ دونوں بھائی اس ٹیم کے سب سے کم عمر ارکان ہیں۔ ہر دوسرے سال اسپین کے شہر کیٹلونیا میں اس طرح کے مینار بنانے کا مقابلہ ہوتا ہے۔

آپ نے بہت سے مشہور میناروں کا ذکر سنا ہوگا، مثلاً دلی کا قطب مینار، پیرس کا ایفل ٹاور، اٹلی کا پیسا ٹاور وغیرہ، یہ سارے مینار اور ٹاور انسانوں نے بنائے ہیں، لیکن یہ مینار جو آپ دیکھ رہے ہیں ان میں نوجوان لڑکوں نے اوپر تلے ہو کر ایک گیارہ منزلہ مینار تعمیر کیا ہے۔ نہایت حیرت انگیز اور اچھوتا مینار۔ یہ مینار محض سرکس کے بازی گروں کا کوئی کارنامہ نہیں بلکہ اس مینار میں ہمارے لیے بہت سے سبق پوشیدہ ہیں۔ اتحاد و یکجہتی کا سبق۔ ایک دوسرے کا بوجھ اُٹھانے کا سبق، ایک دوسرے کے لیے تکلیف برداشت کرنے کا سبق۔ کیونکہ انہی خصوصیات کی بنا پر ایک قوم، قوم بنتی ہے۔ اور دنیا کے وسیع اسٹیج پر اپنی عظمت کا مینار تعمیر کر سکتی ہے۔

اپنے دانتوں کو
مزے سے صاف کیجئے

کرسٹل کے تین ذائقے، تینوں مزے دار
کرسٹل ریڈ جیل میں چیری، گرین جیل میں
منٹ اور کرسٹل وہائٹ میں منٹ فریش۔

کرسٹل سے برش کیجئے، ٹوتھ پیسٹ کا مزا
لیجئے دانت ہمیشہ صاف، چمکدار اور کیویٹا
لگنے سے محفوظ۔

Crystal
سانس خوشگوار، دانت چمکدار

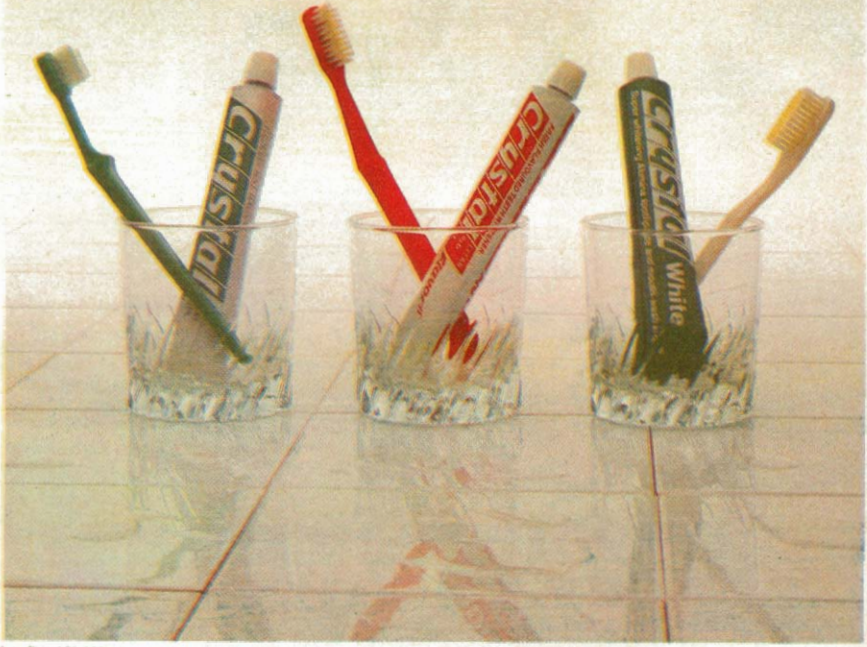

Interflow-APL-100

بھائی کی محبت

سیفی سیوھاروی

مُغلوں کے زمانے میں ایک ڈاکو تھا۔ اُس کا نام تو شیر سنگھ تھا۔ پر اُسے شیرا شیرا کہتے تھے۔ تھا بڑا بہادر اور جتھے والا۔ چھوٹے موٹے راجا تو اُس کے نام سے ہی کانپتے تھے۔ جہاں بچّوں نے شرارت کی کہہ دیا "وہ آیا شیرا" اور بچّے سہم جاتے تھے۔

تم جانو عالمگیر تھا زور کا حاکم۔ اس نے یہ خبر سُنی۔ جبار خان صوبہ دار کو حکم دیا "شیرا کو پکڑ لاؤ۔ تین ہزار جوان ساتھ لے جانا"

پر اکبر کو کیا عُذر؟ جبار خان جو تھے تین ہزار جوان ساتھ لے کر چل کھڑے ہوئے۔ سڑک سڑک تو کُودتے پھاندتے چلے گئے۔ جب آئی راجپوتانے کی ریتلی زمین تو گھوڑوں نے کان ٹیک دیے۔ گرمی کا موسم۔ کڑی دھوپ۔ جنگل اور پھر کیسا۔ جہاں کوسوں پانی کا پتہ نہیں۔ آخر بڑی مشکل سے مرکھپ کر وہاں پہنچے۔ لوگوں سے شیرا کو پوچھا سب

اُس کی شکایتیں تو کرنے لگے کہ ہاں صاحب ایسا ہے۔ ویسا ہے اور بڑا ظالم ہے۔ پر یہ کسی نے نہ بتایا کہ کہاں رہتا ہے۔ کہاں نہ۔ اب صوبہ دار اس چکر میں، کروں تو کیا؟ آخر اُس نے بے سوچے سمجھے اپنا گھوڑا پھر جنگل کی طرف موڑ دیا۔

پندرہ دن برابر خاک چھانی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اُس جگہ پہنچ گئے۔ جہاں ایک ندی ریت میں غائب ہو جاتی ہے۔ پر نہ جانے شیرا کہاں چھپا تھا کہ اس کا پتہ نہ چلا۔ ہار کر صوبے دار نے وہیں کھجوروں تلے ڈیرے ڈال دیے۔

سُورج ڈوب رہا تھا، دُھوپ تو نہیں۔ ہاں تمام جنگل ہلکے سنہری رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیٹے کھجور کی شاخوں پر پھدک رہے تھے۔ ندی کا پانی آہستہ آہستہ بالکل دھیمی چال سے۔ عجب وقت تھا۔ صوبہ دار جبّار خان کے دِل میں اُمنگ اُٹھی۔ تھکے ہوئے تھے، پر اپنے ماتحت سے بولے "چلو ذرا گھوم آئیں۔ مرزا جی چلو۔ خط پھر لکھ لینا۔" "بہت اچھا جناب" کہتے ہوئے مرزا اُٹھے۔ دونوں خیمے سے باہر نکلے۔ سائیس سے گھوڑے منگائے اور ان پر سوار ہو کر ایک طرف کو چل دیے۔ کوئی میل بھر گئے ہوں گے کہ راستے میں ایک ٹیلے کے پیچھے سایہ سا نظر آیا۔ جبّار خان جلدی گھوڑا دوڑا کر وہاں پہنچا۔ دیکھا تو ایک پندرہ برس کا لڑکا۔ صوبہ دار نے تعجّب سے پوچھا "تم کون؟"

لڑکا ... "میں ایک لڑکا ہوں۔"

جبّار خان "تم ہمیں دیکھ کر کیوں چھُپ گئے تھے؟"

لڑکا ... "میں شیر سنگھ کا بھائی ہوں۔ اور آپ ان کی تلاش میں ہیں۔ کبھی مجھے تنگ کریں۔ اس لیے ڈرتا تھا۔"

جبّار (مرزا سے) "دیکھا۔ ذرا سا لونڈا کیا چال بتاتا ہے" (لڑکے کی طرف دیکھ کر)

"تو اب ہم تجھے پیار کریں گے کیا؟ بتا تیرا بھائی کہاں ہے؟"

لڑکا۔ (سر ہلا کر) "ہاں مجھے معلوم ہے وہ جگہ۔ بھائی جہاں رہتا ہے۔"

جبّار۔ "تو پھر ہم تیرے ساتھ چلیں۔؟"

جواب میں لڑکے نے سر ہلا دیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ چلو۔

آگے آگے لڑکا اور اس کے پیچھے یہ دونوں گھوڑوں کی باگیں پکڑے ہوئے۔ تھوڑی دُور چلے تھے کہ ایک جھونپڑی نظر آئی، قریب پہنچ کر دیکھا تو وہ بالکل خالی تھی، لڑکا بولا "یہاں رہتا تھا میرا بھائی۔ اب نہ جانے کہاں چلا گیا۔؟" جبّار خان کا چہرہ غُصّے سے سُرخ ہو گیا، دندنا کر بولا "چکمے پر چکمہ۔ افوہ رے مکّار! جلدی بتا ورنہ اُدھیڑ دُوں گا۔"

لڑکا تھر تھر کانپنے لگا۔ رو کر بولا "خان جی۔ میں جھوٹ نہیں کہتا۔ پر ماتما جانے وہ کہاں چلے گئے۔" یہ کہہ کر وہ

مرزا کی طرف دیکھنے لگا۔ ایسی نظروں سے۔ جو یہ کہہ رہی تھیں "تم مجھے بچالو"۔

مرزا کو پہلے ہی یقین تھا کہ لڑکا جو کچھ کہہ رہا ہے، بالکل سچ ہے۔ اس کی بھولی صورت اور سیدھے سادھے لفظوں سے ٹپکتا تھا کہ وہ جھوٹ سے کوسوں دُور ہے۔ اپنے افسر سے کہا "بیٹو پاٹو نہ۔ اسے ساتھ لے چلو۔ لڑکا شریف معلوم ہوتا ہے۔ سب کچھ بتا دے گا"۔

دونوں افسر پڑاؤ پر پہنچے۔ وہاں لڑکے سے پھر پوچھا، اس نے وہی جواب دیا۔ اب دونوں افسروں میں ہوا جھگڑا۔ جبار خان کا خیال تھا کہ لڑکا چکمہ دے رہا ہے اور مرزا کہتا تھا کہ نہیں۔ لڑکا سچ کہتا ہے۔ اسی کھینچا تانی میں بات یہاں تک بڑھی کہ آپس میں تُوتُو میں میں ہونے لگی۔ جبار آخر بڑا تھا اور افسر۔ اُس نے لڑکے کو تو قید کر دیا، اور بادشاہ کے پاس مرزا کی شکایت بھیج دی۔ بلکہ غصے میں یہاں تک لکھ گیا کہ معلوم ہوتا ہے، لڑکے کو مرزا پہلے سے جانتا ہے اور یہ بالکل غلط تھا، لڑکا تھا ہندو اور مرزا مسلمان۔ دونوں ایک دوسرے کا نام بھی نہ جانتے تھے ساری بات یہ تھی کہ سانچ کو آنچ نہیں اور اسی وجہ سے اللہ میاں نے اس بے گناہ کی ہمدردی مرزا کے دِل میں پیدا کر دی تھی۔ شیرا کے بھائی کو پکڑ لینے سے میاں صوبہ دار اکڑ گئے۔ پھُولے نہ سماتے۔ انھوں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ دن بھر سُراغ لگاتے رات کو ڈیروں میں آگھُستے۔ آخر تنگ آ گئے۔ ایک دن لڑکے کو بلا کر کہا "دیکھو تم اپنے بھائی کا پتہ بتا دو۔ ورنہ پرسوں تمھیں قتل کر دیا جائے گا"۔

لڑکا بولا "مہاراج! مارو کہ چھوڑو۔ جو مجھے معلوم تھا، بتا دیا اور جو کچھ بتایا ہے بالکل سچ ہے۔ رام جانے اس وقت میرا بھائی کہاں ہے؟ خان جی۔ ہم چھتری لوگ جھوٹ بہت کم بولا کرتے ہیں۔ ہماری آن ہے کہ سر جائے، بات نہ جائے۔ آگے آپ مالک ہیں۔ جو اچھا ہو کریں"۔

میاں جبار آخر تھے کانے پکے عیبی۔ پہلے تو گردن گھمائی۔ پھر ہُوں کر کے بولے۔

"اوہو۔ تم راجپوت ہو جبھی ــ ہاں۔۔۔! چھتریوں کا یہی کام ہے ڈاکے ماریں۔ چوریاں کریں۔۔۔ کیوں؟"

لڑکا ہزار بے بس تھا اور زنجیروں سے جکڑا ہوا۔ پر اپنی قوم کی نسبت ایسے الفاظ سُن کر بھنا گیا۔ تڑاخ سے بولا۔ "میرا بھائی اچھا نہیں نکلا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری قوم بُری ہے۔ حالانکہ تم مجھ پر ظلم کر رہے ہو۔ تو میں تمام مسلمانوں کو ظالم سمجھ لوں یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ (مرزا کی طرف اشارہ کر کے) ایک یہ بھی تو ہیں"۔

یہ سُنتے ہی جبار نے پینترا بدلا۔ نیام سے تلوار کھینچ کر چاہتا تھا وار کرے کہ مرزا نے پھُرتی سے اس کی تلوار اپنی تلوار پر لے لی۔ تلواریں آپس میں ملی ہوئی ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے دو ہلال اور اِن کے نیچے لڑکا کھڑا تھا، چُپ چاپ سر جھکائے۔

جبّار خان نے جھلّا کر اپنی تلوار دُور پھینک دی اور بڑبڑاتا خیمے سے نِکل آیا۔ غُصّے میں اور کُچھ تو نہ سُوجھا ۔ جھٹ نقّارہ بجادیا۔ ڈَم ڈَم ڈَم ڈَم سارا جنگل گُونج اُٹھّا۔ تمام لشکر اکٹھا ہوگیا۔ سپاہی حیران تھے کہ معاملہ کیا ہے؟
"مرزا کو باندھ کر ڈال دو! اس کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ ایسا نہ ہو کسی کو نقصان پہنچائے۔ میں تو بال بال بچا ہوں۔ اُفوہ!"
یہ سُنتے ہی تمام لشکر میں سنّاٹا چھا گیا۔ سب کو بہت افسوس ہوا۔ مرزا تھا ہنس مُکھ۔ نہ کسی کے اچھّے سے مطلب نہ بُرے سے۔ مگر اِس وقت اور کیا ہوسکتا تھا؟ چالیس پچاس جوان خیمے کی طرف لپکے اور انھوں نے جاتے ہی دبا لیا مرزا صاحب بہتیرے چیخے چلّائے۔ پر کون سُنتا تھا؟ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ ہم ان سے ہمدردی کر رہے ہیں۔ کہتے تھے "تم دِلّی پہنچ کر اچھے ہوجاؤ گے۔ مرزا جی گھبراؤ نہ۔ حکیم بنّو بہت اچھا علاج کرتے ہیں۔"
مرزا حیران کہ یہ کہہ کیا رہے ہیں۔ آخر اُن کا جی جَل گیا۔ اپنے بندھے ہاتھوں کو تان کر بولے "عقل ٹھکانے ہے کہ نہیں؟ تم لوگ ہو کہاں۔ ارے میں بیمار ہوں؟"
کسی نے کُچھ جواب نہ دیا اور فوراً ہاتھ پاؤں جکڑ کر اُنھیں ایک صندوق پر بٹھا دیا۔ لڑکے کو دوسرے خیمے میں لے جا کر قید کر دیا۔

مرزا کو لڑکے سے کُچھ ایسی ہمدردی ہوگئی تھی کہ اُسے نہ اپنی گرفتاری کا افسوس تھا نہ کسی اور بات کا خیال تھا تو صرف اِتنا کہ کسی طرح لڑکے کی جان بچ جائے۔ دِل میں بار بار سوچتا تھا کیسا نیک، سچّا اور بہادر لڑکا ہے۔ اگر اُسے جبّار نے مروا دیا تو بڑا ظلم ہوگا۔ آخر اس بے چارے کا کیا قصُور؟ خُدا کرے کل بادشاہ کا حکم آجائے، اور جو حکم نہ آیا ___ تو...؟
اسی سوچ میں آدھی رات گزر گئی، آخر ایک تدبیر سوجھی۔ مرزا نے کیا کیا کہ اپنے ہاتھ شمع دان کی طرف بڑھا دیئے۔ جب موم بتّی سے رسّی کا پھندا جَل گیا تو مرزا اپنے ہاتھ پاؤں کھول چُپ چاپ خیمے سے نکلے۔ سیدھے وہاں پہنچے جہاں لڑکا قید تھا۔
خیمے کا پردہ جو اُٹھا تو لڑکا سہم گیا۔ پھر جب اُس نے دیکھا کہ مرزا جی ہیں تو پھُولا نہ سمایا۔ کچُھ کہنا چاہتا تھا کہ مرزا نے چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اور اُس کے ہاتھ کھولنے لگا پھر کسی ڈھب سے بیڑیاں بھی الگ کر دیں، اور دونوں اِس صفائی سے نِکل گئے کہ لشکر میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

کچُھ دُور چل کر ایک ٹیلے کے نیچے مرزا جی ٹھہر گئے اور لڑکے سے بولے: "خدا حافظ اب تم جاؤ، اور اگر مناسب

سمجھو تو اپنے بھائی کے حالات مجھے بتا دو۔ تمھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ کہاں ہے۔؟"

لڑکا۔" افسوس! آپ کو بھی مجھ پر اعتبار نہیں"۔

مرزا۔" اعتبار کیوں نہیں۔ میں نے سوچا کبھی بھائی کی محبت!"

لڑکا۔" ہاں مجھے بھائی سے محبت ہے۔ پر ان کے پیچھے اپنا ایمان نہیں کھو سکتا۔ ہمارے ہاں جھوٹ بولنا بڑا پاپ ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کوئی بُری بات نہیں۔ اچھا اب یہ کرو کہ میں کل پتہ لگا لوں گا۔ اس کے بعد آپ کو خبر دے دُوں گا"۔

مرزا۔" اچھی بات۔ رکھو ہاتھ پر ہاتھ"۔

لڑکے نے مرزا کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا" ضرور اطمینان رکھو"۔

اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے رُخصت ہوئے۔ چلتے وقت مرزا نے پھر کہا" بھول نہ جانا"۔

لڑکے نے جاتے ہوئے کہا" نہیں"۔

جب مرزا لشکر میں پہنچے تو وہاں ایک شور مچا ہوا تھا۔ انھیں دیکھتے ہی جھٹ پہرہ داروں نے پکڑ لیا اور صوبہ دار کے پاس لے گئے۔ جبار خان نے چلا کر پوچھا" تمھارا ساتھی کہاں ہے؟"

مرزا نے مُسکرا کر کہا" آپ ہی کو خبر ہوگی۔ میں تو پاگل آدمی ہوں"

جبار خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گیا، کچھ سوچ کر بولا" اور تم اِس وقت کہاں سے آرہے ہو؟"

مرزا جی سر کھجا کر بولے" مَیں۔ مَیں اِس وقت ذرا سَیر کرنے گیا تھا، اب پھر جاتا ہوں آؤ تم بھی چلو"

اب تو جبار خاں بہت چکرائے سمجھ میں نہ آیا کیا کریں کیا نہ۔ آخر سر جُھکاتے ہی بنی۔ مرزا کا ہاتھ پکڑ کر خیمے میں لے گئے۔ اپنے قصُوروں کی معافی چاہی اور بولے" باوا سچ بتا! لڑکا کہاں گیا؟ ورنہ سلطان ہم دونوں کو زندہ نہ چھوڑیں گے"۔ جبار کی صورت دیکھ کر مرزا خوب ہنسے۔ دانتوں سے اپنا ہونٹ چبا کر کہنے لگے" مجھے کیا خبر! میں تو پاگل ہوں"۔

جبار۔" بہت ہنسی ہو چکی۔ ہاں بتا دُنا! کہاں گیا وہ لڑکا؟"

مرزا۔" اپنے بھائی کا پتہ لینے گیا ہے اور کہاں جاتا۔؟ کل آجائے گا۔ اطمینان رکھیے"۔

جبار۔" کیا واقعی؟"

مرزا۔" ہاں"۔

جبار۔" تو آچکا"۔

مرزا ۔ "نہیں ضرور آئے گا۔ وہ نہایت شریف معلوم ہوتا ہے۔"

جبار ۔ "اگر نہ آیا تو میں یہی لکھ بھیجوں گا کہ اُسے مرزا صاحب نے چھوڑ دیا، ہاں پھر بُرا نہ مانو۔"

مرزا ۔ (لاپروائی سے) "اچھا صاحب! ہمارا ہی نام لے دینا۔ اور کیا چاہتے ہو؟ بس۔"

جبار ۔ "تم جانو۔"

اس کے بعد دونوں اپنے اپنے خیموں میں سونے کو چل دیئے۔

اگلے دِن وہ لڑکا جو تھا، آیا، مرزا اُسے لے کر صوبہ دار کے پاس گئے۔ وہ بہت حیران ہوا، کہنے لگا "آگئے تم۔ کہو! سنگھ بہادر کا پتہ چلا؟"

لڑکا ۔ "بنگال چلے گئے۔"

صوبہ دار ۔ "کب؟"

لڑکا ۔ "آٹھ نو دن ہوئے۔"

صوبہ دار ۔ "پکّہ تو نہیں دے رہے ہو؟ اچھا تمھیں یہ کس طرح معلوم ہوا۔"

لڑکا ۔ "کل ماما کے ہاں گیا تھا میں۔ وہاں سُنا تھا کہ بھیّا جی بنگال چلے گئے۔"

صوبہ دار ۔ "تمھارے ماما کہاں رہتے ہیں؟ برادر! یہ تو خوب بات سُنائی تم نے!"

لڑکے نے کچھ جواب نہ دیا، صوبہ دار نے پھر پوچھا۔ اُس نے صاف کہہ دیا "میں آپ کو ماما کے گھر کا پتہ نہیں بتا سکتا۔"

صوبہ دار بولا "کیوں؟"

لڑکے نے کہا "ماما جی سے اقرار کر چکا ہوں کہ میں تمھارے گھر کا پتہ سپاہیوں کو نہ بتاؤں گا۔" پھر کہنے لگا۔ "خان جی! وہ تو مجھے یہاں آنے کو بھی منع کرتے تھے۔ جب میں نے یہ کہا کہ چھوٹے صوبہ دار سے واپسی کا وعدہ کر آیا ہوں تو اُنھوں نے آگیا دی۔"

لڑکے کی سیدھی سادی باتوں کا جبار پر ایسا اثر ہوا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دِل ہی دِل میں کہہ اُٹھا کہ ایسے نیک بچے تو پُتلیوں میں بٹھا لینے کے قابل ہیں۔ اور میں نے اس پر سختی کی۔ "افوہ" کہہ کر لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا "بڑے اچھے بیٹے ہو۔ خُدا تمھاری عمر دراز کرے۔ اپنا نام تو بتاؤ۔ ہاں تمھارا نام کیا ہے۔؟"

لڑکا نظریں جھُکا کر بولا "پریم سنگھ۔"

"نام تو بہت اچھا ہے اور اس سے اچھے تم ہو" کہہ کر صوبہ دار مرزا سے بولا،

"برادر۔ دیکھو! میں تمہارے سامنے کہتا ہوں۔ یہ آج سے میرا بیٹا ہے اور میں بادشاہ کے سامنے بھی کہہ دُوں گا۔ کوئی اولاد نہ تھی۔ خدا نے مجھے پریم جیسا لڑکا دے دیا۔" یہ کہہ کر صوبہ دار نے پریم کو گود میں اُٹھا لیا۔ اور اپنی کٹار کھول، اس کی کمر میں باندھ دی۔

دو تین دِن بعد سلطان کا حکم پہنچ گیا "لڑکے سمیت دلّی روانہ ہو جاؤ۔"

صوبہ دار نے کوچ بول دیا۔ دلّی پہنچے۔ دربار میں حاضر ہوئے۔ سلطان نے لڑکے سے بات چیت کی۔ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے "جبّار لڑکا ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ اِسے فوج کا کام سکھاؤ۔" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ صوبہ دار نے اُسے فوج میں بھرتی کر لیا۔

تم سُن کر حیران ہو گے ایک سال میں پریم نے اتنی ترقی کی کہ اچھے سپاہیوں میں گِنا جانے لگا۔ دوسرے سال مرزا اور جبّار کی مہربانیوں نے سہارا جو دیا تو کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ "پریم سنگھ صوبے دار" اور چوتھے سال راجہ پریم سنگھ پنج ہزاری کہلانے لگا۔

سُنا آپ نے؟ اتنا بڑا نام پایا اُس نے، اس لڑکے نے جو فوجیوں کو دیکھ کر ٹیلوں میں جا چھپا تھا، یہ ہے محنت اور سچائی کا پھل۔

اب شیر کی سُنیئے۔ وہ راجپوتانہ سے جو دُم دبا کر بھاگا تو سیدھا بنگال پہنچا۔ وہاں کچھ دنوں لُوٹ مار کی، پھر روزگار مدھم پڑ گیا۔ تو بندھیل کھنڈ کی پہاڑیوں میں آن چھُپا۔ یہاں اپنا نام بھی بدل ڈالا۔ کیا لقب اختیار کیا؟ "شیر خان بہادر"

شیر خاں، ہوکہ ہاتھی خاں۔ چور آخر چور ہے۔ جب لوگوں کو زیادہ تنگ کیا تو دِلّی کے دربار میں پھر شکایتیں پہنچنے لگیں۔ سلطان نے پریم کو کچھ فوج دے کر بھیج دیا۔

بڑی مشکل سے اُس قلعہ کا پتہ چلا جس میں شیر خاں اور اس کے ساتھی رہتے تھے یہ قلعہ ایک پہاڑی کے دامن میں تھا۔ صوبہ دار پریم نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ خوب پہرے دہرے لگائے گئے۔ بڑا انتظام کیا گیا تمام رات گولہ باری ہوئی۔ پریم کو تین چار بجے ذرا فرصت ملی تو اپنے خیمے میں آن پڑا۔ مگر نیند کہاں؟ بار بار یہ خیال آتا تھا اگر ڈاکو ہاتھ آ گیا تو میری نیک نامی ہو گی۔ سلطان خوش ہوں گے۔ ابّا جان پھُولے نہ سمائیں گے اور چچا مرزا تو لاکھوں دُعائیں دیں گے۔ دیکھو یہ سب مسلمان ہیں اور میں ہندو۔ پر مجھ سے کتنی محبت رکھتے ہیں۔ دنیا

کہتی ہے کہ عالمگیر ہندوؤں سے جلتا ہے۔ یہ بات نہیں، ہمارے سلطان تو لاکھوں میں ایک ہیں، بڑے دیالو دھرماتما ہاں۔ یہ بات، ہے کہ وہ اپنے دین کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ سو یہ کوئی بُری بات نہیں۔ کیا مجھے اپنے دھرم سے پریم نہیں ؟ ہے، ایشور! تو سب کا پرماتما ہے۔ یہ کہہ کر پریم نے انگڑائی لی۔ بستر سے اُٹھا اور نہا دھو کر پُوجا پاٹ میں لگ گیا۔

دن نکل رہا تھا کہ دو جاسوس بھاگے ہوئے آئے اور کہنے لگے "ڈاکو قلعہ سے بھاگنے والے ہیں۔ چور دروازے کی طرف سے۔ وہ اُنھوں نے کھول لیا"۔

پریم جلدی سے وردی پہن، باہر آیا اور ایک ہزار جوان ساتھ لئے چور دروازے کی طرف چل دیا۔ وہاں پہنچ کر ڈاکوؤں سے خُوب لڑائی ہوئی، کچھ مارے گئے۔ کچھ زخمی ہوئے۔ ڈاکوؤں کا سردار بھاگ نکلا۔ پریم نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔

دونوں قلعہ سے دُور نکل گئے۔ آخر ایک ندی کی گھاٹی میں ڈاکو سردار ٹھہرا اور گرج کر بولا "مغل بچّے! ادھر آ، میں دیکھوں تیری اکڑ۔ بڑا اشور مابن کے چڑھا چلا آتا ہے"۔

پریم قریب پہنچا۔ تو سردار کہنے لگا "ارے تُو تو کل کا بچّہ ہے۔ جا تجھ سے کیا اُلجھیں ؟ (ڈانٹ کر) دکھاؤں راجپوتی ہاتھ ؟" یہ فقرہ سُن کر پریم حیران رہ گیا۔ مُسکرا کر بولا "مجھے دکھاؤ گے راجپوتی ہاتھ ہم بھی راجپوت ہو"؟ یہ کہہ کر اُس نے بغور سے ڈاکو سردار کی طرف دیکھا۔ نگاہوں کا آپس میں ملنا تھا کہ خُون نے جوش مارا۔ مان جائے کو پہچان لیا۔ تلوار پھینک دی گھوڑے سے اُترا۔ اور بھائی کی رکاب سے آنکھیں ملنے لگا۔

ڈاکو سردار (شیر سنگھ) کو اب خبر ہوئی کہ وہ کس پر وار کرنا چاہتا تھا ؟ دونوں پھُوٹ پھوٹ کر روئے حال وال پُوچھنے کا موقع نہ تھا، پریم نے سِسکیاں لے کر اتنا کہا صرف اتنا "بھیّا! تم جلدی بھاگ جاؤ۔ سپاہی آرہے ہیں۔ پھر میں تمھیں چھوڑ بھی نہ سکوں گا اور نہ میں نمک حرام بن کر بادشاہ کے سامنے جانا چاہتا ہوں" یہ کہہ کر پریم خُوب رویا۔ کٹار اپنے سینے میں بھونک لی اور تڑپ کر بھائی کی گود میں ٹھنڈا ہو گیا۔۔۔ بھائی کی محبّت! ●

مقابلۂ تھپّڑ

سنہ ۱۹۳۴ء میں، روس کے ایک شہر "کیو" میں طویل تھپّڑ بازی کا ایک مقابلہ ہوا تھا جس میں ڈینلی بارڈی اور گو بینج اوّل انعام کے مستحق قرار دیئے گئے۔ یہ دونوں نوجوان مسلسل ۳۱ گھنٹے ایک دوسرے کے منہ پر تھپّڑ مارتے رہے۔

فیصل احمد ——— لیاقت آباد، کراچی

پ، اک، س، ت، ان

"پ" سے پاکستان ہمارا ہم کو اپنی جان سے پیارا
سُن لو مُنّی، بلّو تارا قائدِاعظم کا فرمان
سب سے اچھا پیارے بچّو! اپنا پاکستان

"ا" سے آگے بڑھتے جاؤ علم کے زینے چڑھتے جاؤ
مُلک کی خدمت کرتے جاؤ مُلک تمھاری شان
سب سے اچھا پیارے بچّو! اپنا پاکستان

"ک" سے کرلو بچّو! محنت، محنت سے ملتی ہے عزّت
عزّت سے بڑھتی ہے عظمت، عظمت سے ایمان
سب سے اچھا پیارے بچّو! اپنا پاکستان

"س" سے پرچم سبز تمھارا اللہ کا تم کو ہے سہارا
چمکو گے تم بن کر تارا سچ پر دے دو جان
سب سے اچھا پیارے بچّو! اپنا پاکستان

"ت" سے توڑو گردن جاکر آنکھ دکھائیں جو آآکر
غیرت کی تم دولت پاکر قائم رکھو آن۔۔۔!
سب سے اچھا پیارے بچّو! اپنا پاکستان

"ا" سے ہے احسان خدا کا جس نے اپنا ملک بنایا
سبزے سے ہے جسے سجایا جگ میں اونچی شان
سب سے اچھا پیارے بچّو! اپنا پاکستان

"ن" سے اک نشانہ لے لو، ظُلم کے سارے رنگ مٹا دو
کیا ہو تم دُنیا کو دکھا دو، دے کر اپنی جان
سب سے اچھا پیارے بچّو! اپنا پاکستان

سیداشرف بیتھوی

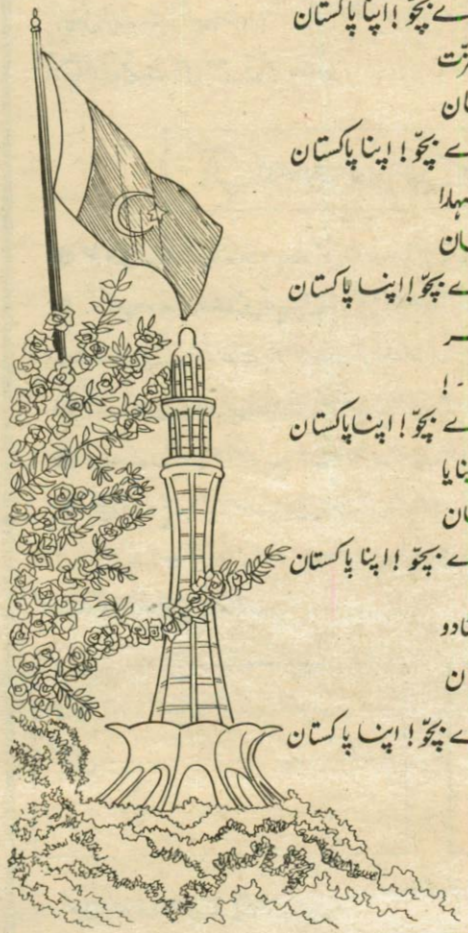

ادارہ آنکھ مچولی کی ایک نئی پُرکشش اسکیم

کیا آپ اپنے کسی دوست کو تحفہ بھیجنا چاہتے ہیں؟

اگر آپ اپنے کسی دوست کو تحفہ بھیجنے کے خواہشمند ہیں تو "آنکھ مچولی" آپ کی یہ خواہش پوری کرسکتا ہے۔ ہم آپ کی طرف سے، آپ کے دوستوں کو خوبصورت تحائف ارسال کریں گے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان تحائف کی آپ سے کوئی قیمت بھی نہیں لی جائے گی۔

آپ کو صرف ان باتوں کا خیال رکھنا ہوگا

- ضروری ہے کہ آپ کے دوست کسی دوسرے شہر میں رہتے ہوں۔
- اگر آپ کے دوست بھی آپ ہی کے شہر، قصبے یا گاؤں کے ہوتے تو تحائف نہیں بھجوائے جائیں گے۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ لفافے پر ڈاکخانے کی مُہر دیکھ کر اس کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔)
- تحفے کے لیے اپنا اور اپنے دوستوں کا مکمل نام اور پتہ علیحدہ علیحدہ ارسال کیجئے۔
- آپ کے دوستوں کا اسکول یا کالج کا طالب علم ہونا ضروری ہے۔
- نیچے دو کوپن دیے جارہے ہیں۔ ان میں سے ایک آپ کے لیے اور ایک آپ کے دوستوں کے لیے ہے۔ ضروری نہیں کہ آپ یہی کوپن کاٹ کر ارسال کریں۔ اپنی سہولت کے لیے آپ اپنا اور اپنے دوستوں کا کوپن سادہ کاغذ پر بھی بنا کر بھیج سکتے ہیں۔

میرا نام ..... عمر	میرے دوست کا نام ..... اندازاً عمر .....
کلاس ..... پتہ	کلاس ..... پتہ .....
.....	.....

کوپن بھر کر اس پتے پر ارسال کیجئے:۔ "آنکھ مچولی تحفہ" ڈی-۱۱۲- نورس روڈ- سائٹ، کراچی-۱۶

انوکھے لوگ

پہلا منظر

ایک لڑکی میز کے ساتھ کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ میز کے اُوپر ماچس کی بہت سی تیلیاں رکھی ہوئی ہیں۔ لڑکی اپنی انگلیوں کے اشارے سے ہوا میں دائرے بناتی ہے۔ اور اگلے ہی لمحہ تیلیاں خود بخود سرکتی ہوئی ایک دوسرے کے قریب آجاتی ہیں۔ اور پھر سرکتے سرکتے میز سے نیچے گر جاتی ہیں۔

دوسرا منظر

یہی لڑکی پانی سے بھرے ہوئے ایک جار سے دو میٹر کے فاصلے پر بیٹھی ہوئی ہے۔ جار میں ایک انڈا ٹوٹا ہوا پڑا ہے۔ لڑکی چند لمحوں تک انڈے کو گھور کر دیکھتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے انڈے کی زردی، سفیدی سے علیحدہ ہو جاتی ہے۔

آپ ان دونوں منظروں کو دیکھ کر سمجھیں گے کہ ہو نہ ہو یہ لڑکی جادوگرنی ہے اور اس طرح کے کام وہ

جادو کے زور پر انجام دیتی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ یہ صلاحیتیں لڑکی میں پیدائشی ہیں اس کے یہ کمالات دیکھنے کے بعد ماہرین نے اس لڑکی کو جب خصوصی آلات کی مدد سے چیک کیا تو پتا چلا کہ اُس لڑکی کے پورے جسم میں عام افراد سے زیادہ مقناطیسی قوت پائی جاتی ہے۔ ٹیسٹ کے دوران لڑکی کے دل کی دھڑکنیں عام حالت سے زیادہ تیز ہوگئی تھیں۔ اور لڑکی کے جسم میں ایک طرح کا ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ جس کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ گویا لڑکی کو کسی بات پر شدید غصہ آرہا ہے۔ ٹیسٹ کے بعد یہ لڑکی اتنی تھکی ہوئی اور کمزور نظر آتی تھی جیسے وہ کسی شدید بیماری کا شکار ہوگئی ہو۔ ان علامتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیلیوں کو حرکت میں لانے کے لیے لڑکی کو اپنی اندرونی قوت کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔

آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ دنیا میں اس لڑکی کی طرح کی حیران کن صلاحیت رکھنے والے اور بھی افراد پائے جاتے ہیں۔ یہ افراد گھڑیوں کی جانب دیکھ کر ان کی خرابی دُور کر دیتے ہیں۔ پمپجوں کو چھوئے بغیر اُن کی بناوٹ تبدیل کر دیتے ہیں اور مختلف چیزوں کو ہاتھ لگائے بغیر کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں پہنچا دیتے ہیں۔ یہ افراد جس قوت یا صلاحیت کی مدد سے ناقابلِ یقین کام کرتے ہیں اُسے انگریزی کی اصطلاح میں ٹیلی کینسز کہتے ہیں۔

حیرت انگیز صلاحیت رکھنے والے ان افراد کے متعلق عام لوگوں میں مختلف قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ افراد جادو ٹونے کی مدد سے ایسا کرتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ یہ حضرات نہایت چالاکی سے آنکھوں میں دُھول جھونکتے ہیں۔ ان افراد کے بارے میں لوگوں کے اس قسم کے خیالات درست نہیں ہیں۔

انسان اور دوسری جاندار مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ ان میں سے بہت سی صلاحیتیں ہمارے علم میں ہیں۔ لیکن ابھی انسان اور دوسری مخلوقات کی بے شمار پوشیدہ قوتوں کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں لیکن اگر کسی چیز کے بارے میں ہمیں علم نہ ہو تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم اُس کی حقیقت سے ہی انکار کر دیں۔ کسے خبر کہ اگلے دس بیس برسوں میں انسان کی یہ چھپی ہوئی صلاحیتیں سائنسی حقیقت بن جائیں اور تب لوگ انھیں جادو ٹونا قرار نہ دے سکیں۔

ٹیلی پیتھک لوگ

آیئے اب انسان کے اندر پائی جانے والی ایک اور حیرت انگیز صلاحیت کے بارے میں آپ کو بتاتے ہیں اس صلاحیت کو نفسیات کی اصطلاح میں ٹیلی پیتھی کہا جاتا ہے۔

ٹیلی پیتھی کی صلاحیت رکھنے والے یعنی ٹیلی پیتھک افراد کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اُن چیزوں کو بھی دیکھ سکتے ہیں جو اُن کی نظروں کے سامنے نہیں ہوتیں۔ غیر موجود اشیا کو دیکھنے کے لیے یہ لوگ دوسرے لوگوں کے خیالات کو پڑھتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کسی بھی ایسی تصویر کی تفصیلات سے آپ کو آگاہ کر سکتے ہیں جو اُن کی نظروں کے سامنے نہیں ہے لیکن آپ اُسے دیکھ رہے ہیں۔ تصویر کی جُملہ تفصیلات بتانے کے لیے ٹیلی پیتھک شخص آپ کے خیالات کو پڑھے گا۔ ۱۹۳۰ء میں ہائین نام کے شخص نے اس سلسلے میں کئی تجربات کیے۔ تجربات کے لیے اُس نے ۲۵ کارڈز کا ایک سیٹ استعمال کیا جس پر اس طرح کی اشکال بنی ہوئی تھیں۔ ▭ ○ △ ≋

اس سلسلے میں اُس نے کئی ٹیلی پیتھک افراد پر تجربات کیے۔ تجربے کے لیے ہائین اپنے اور ٹیلی پیتھک شخص کے درمیان ایک چادر کھینچ لیتا اور پھر کسی ایک شکل کے کارڈ کو اُٹھا کر چادر کی دوسری جانب بیٹھے ہوئے ٹیلی پیتھی کے ماہر سے پوچھتا کہ اُس نے کون سی شکل اُٹھائی ہے۔ ہائین کے بقول تمام ٹیلی پیتھک افراد نے پچیس میں سے ۲۳ مرتبہ اُس کے سوال کا درست جواب دیا۔

آپ نے یقیناً ایسے افراد کے بارے میں بھی سُنا ہوگا جنہیں سینکڑوں میل کی دُوری پر موجود اپنے کسی عزیز کا عام طور پر خاندان کے کسی فرد کا بلا کسی ظاہری رابطے کے پیغام موصول ہوا۔ ایسا عام طور پر ایسی صورت میں ہوتا ہے جب پیغام بھیجنے والا شدید بیمار ہو یا مر رہا ہو۔

مثال کے طور پر ایک شخص کو یکایک بیٹھے بیٹھے احساس ہوتا ہے کہ محاذِ جنگ پر گیا ہُوا اس کا بیٹا ہلاک ہو گیا ہے اور کچھ دنوں بعد اُسے پتہ چلتا ہے کہ اُس کا بیٹا واقعی اُس لمحے ہلاک ہو گیا تھا جس لمحے اُسے یہ احساس ہُوا تھا۔

اس طرح کے واقعات جُڑواں بچّوں کے ساتھ عام طور پر ہوتے ہیں مثلاً اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جُڑواں بچّوں میں سے ایک بچّہ کسی بیماری کا شکار ہو جاتا ہے: دوسرا بچّہ جو اُس سے بہت دُور کسی دوسرے مقام پر موجود ہے وہ حیرت انگیز طور پر اُسی وقت اُسی بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔

ٹیلی پیتھی کا حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ اس میں فاصلہ بالکل اہمیت نہیں رکھتا۔ ایک روسی شہری نے یہ جاننے کے لیے کہ لوگ ایک دوسرے کو کس طرح پیغام ارسال کرتے ہیں ایک تجربہ کیا۔

تجربے کے لیے اُس نے دو ایسے افراد کا انتخاب کیا جن میں ٹیلی پیتھی کی صلاحیت موجود تھی تجربے سے ثابت ہوا کہ اُن میں سے ایک شخص دوسرے کو جب چاہے گہری نیند سُلا سکتا ہے اور گہری نیند سلانے کے لیے وہ صرف اُس کے سونے کے بارے میں سوچے گا۔ اور بس۔

اثر انداز ہونے والے لوگ

بعض لوگوں کے خیالات میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کے خیالات تبدیل کر دیتے ہیں اور بسا اوقات انھیں وہ کام کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں جنہیں وہ کرنا نہیں چاہتے۔ دنیا کے بڑے بڑے فلسفی، سیاست دان اور سماجی رہنما کروڑوں افراد کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرنے والے اسی ذیل میں آتے ہیں۔ اسی طرح آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ آپ کے اطراف میں بھی بعض ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جو ہزاروں لوگوں کے خیالات میں نہ سہی دس بیس افراد کے خیالات میں ضرور تبدیلی پیدا کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایسے افراد پیدائشی طور پر رہنمائی کی صلاحیت لے کر پیدا ہوتے ہیں۔

ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ ایک استاد کی ذہنی کیفیت شاگردوں کی کامیابی یا ناکامی کی ذمہ دار ہو سکتی ہے۔ اس حوالے سے ہونے والے ایک مطالعے کے مطابق ایک استاد جب اسکول میں نیا نیا آیا تو اُسے بتایا گیا کہ وہ جس کلاس کو پڑھائے گا اس میں کچھ طلبہ وطالبات ذہین ہیں اور کچھ کُند ذہن۔ اس سلسلے میں اُستاد کو غلط معلومات فراہم کی گئیں۔ یعنی جو طلبہ ذہین تھے انھیں کُند ذہن بتایا گیا اور جو کُند ذہن تھے انھیں ذہین بتایا گیا۔

چنانچہ اس اُستاد نے ذہین بچوں کو کُند ذہن اور کُند ذہن بچوں کو ذہین سمجھ کر پڑھانا شروع کر دیا۔ حیرت انگیز طور پر بچے استاد کی توقع کے عین مطابق نکلے۔ یعنی حقیقتاً کُند ذہن بچوں نے کلاس میں سوالات کے درست جوابات دینے شروع کر دیے جبکہ ذہین بچوں نے غلطیاں کرنا شروع کر دیں۔ اسی طرح امتحانات میں کُند ذہن بچوں نے ذہین بچوں سے کہیں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

یقین کی قوت سے علاج کرنے والے لوگ

اب آیئے ایک ایسی قوت یا صلاحیت کے تذکرے کی جانب جو دنیا میں چند ہی لوگوں میں پائی جاتی ہے اور یہ صلاحیت ہے بیمار لوگوں کو بغیر کسی دوا بغیر کسی جدید آلے کی مدد کے صحت یاب کرنا۔ یہ صلاحیت "یقین کی قوت کے ذریعے علاج" کہلاتی ہے۔

برازیل میں "یقین کی قوت کے ذریعے علاج" کرنے والا ایک شخص موجود ہے۔ یہ شخص آپریشن کے لیے سبزیاں کاٹنے والی عام چھری استعمال کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ صاحب مریض کو بے ہوش کیے بغیر اس کے متاثرہ جسمانی حصّے کو عام چھری سے کاٹ دیتے ہیں۔ آپریشن کے درمیان نہ تو مریض کو کسی قسم کی تکلیف محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی مریض کے جسم سے خون جاری ہوتا ہے۔ آپریشن کے بعد نہ صرف یہ کہ

جسم کا کٹا ہُوا حصّہ خود بخود جُڑ جاتا ہے بلکہ مریض کے جسم پر آپریشن کا کوئی نشان بھی باقی نہیں رہتا اور مریض آپریشن کے فوراً بعد اپنے پیروں سے چل کر گھر جاتا ہے۔

یقین کی قوّت کے ذریعے علاج میں عام طور پر ماہر کسی آلے کا استعمال نہیں کرتا۔ وہ صرف مریض کے جسم کے متاثرہ حصّے پر اپنا ہاتھ رکھتا ہے اور مرض دُور ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں لوگوں کا خیال ہے کہ شفا یا تو علاج کرنے والے شخص پر مریض کے یقین سے ہوتی ہے۔ یا علاج کرنے والے کے اپنے یقین سے۔۔

اپنے جسم پر کنٹرول کرنے والے لوگ

دنیا میں بعض ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے جسمانی نظام پر حیرت انگیز کنٹرول رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر تبّت میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنے جسموں کو اس طرح تربیت دیتے ہیں کہ انھیں شدید سے شدید سردی کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ یہ لوگ ایسے سرد پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں جہاں اُن کے چاروں طرف برف ہی برف ہوتی ہے۔ یہ لوگ صرف جسم ڈھانپنے کے لیے کپڑے پہنتے ہیں۔ یہ لوگ عام افراد کی طرح کبھی بھی سردی کا شکار ہو کر بیمار نہیں پڑتے۔ تبّت ہی میں کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو مخصوص طریقے سے سانس لینے کی تربیت حاصل کر کے خود کو لمبے فاصلے تک دوڑنے کے قابل بناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ تربیت کے بعد ۳۰ گھنٹے تک مسلسل دوڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

آپ نے ہندوستان کے بعض ایسے جوگیوں کے تذکرے بھی سنے ہوں گے جو کانٹوں کے بستر پر آرام کے ساتھ لیٹ جاتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ مزے سے سو بھی جاتے ہیں۔ کانٹوں کے بستر پر لیٹنا کوئی شاطرانہ ٹرک نہیں ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اگر آپ چند سال تک درد کو محسوس نہ کرنے کی تربیت حاصل کر لیں تو کانٹوں پر لیٹ سکتے ہیں۔ بلکہ لوگوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ مخصوص تربیت کے بعد آپ جسم سے خون کا بہنا روک سکتے ہیں۔

ہندوستان ہی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے آپ کو زمین میں دفن کر لیتے ہیں اور دفن ہونے کے بعد کئی روز تک زندہ رہتے ہیں۔ اس عرصے میں وہ اپنا سانس مکمل طور پر روک لیتے ہیں۔ اس عمل کے درمیان اُن کے دل کی دھڑکنیں بہت آہستہ ہو جاتی ہیں۔

سبز انگلیوں والے لوگ

کچھ لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ پیڑ پودوں کے اُوپر خاص انداز میں اثر انداز ہونے کی

صلاحیت رکھتے ہیں۔ مثلاً برطانیہ میں بعض لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ Green Fingers یعنی سبز انگلیاں رکھتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ افراد پیڑ پودوں کی نشوونما پر اپنے اندر پائی جانے والی مخصوص قوت کے ذریعہ اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس قسم کے افراد کا خیال ہے کہ اگر وہ اپنے پودوں سے ایک مخصوص زبان میں نرم لہجے کے ساتھ گفتگو کریں تو پودوں کی نشوونما بہتر انداز میں ہوتی ہے لیکن اگر پودوں سے چلا کر یا سخت الفاظ میں گفتگو کریں تو اُن کی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔

آوازوں کے پودوں کی نشوونما پر اثر انداز ہونے کے مفروضے کو بنیاد بنا کر ترقی یافتہ ممالک میں کچھ تجربات کیے گئے ہیں اور ان تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ موسیقی پودوں کی نشوونما پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مثلاً امریکہ کی ایک طالبہ نے پودوں کو مختلف مزاج کی موسیقی سُنائی تو پتا چلا کہ جب وہ پودوں کو کلاسیکل موسیقی سُناتی ہے تو پودے آواز کی طرف مائل ہوتے ہیں اور جب وہ پودوں کے آگے پاپ موسیقی والے ساز بجاتی ہے تو پودے آواز کی مختلف سمت میں اس طرح مڑ جاتے ہیں گویا وہ آواز سے ڈر کر بھاگ رہے ہوں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پودے نرم آوازوں کو پسند اور تیز آوازوں کو ناپسند کرتے ہیں۔

پانی تلاش کرنے والے لوگ

آخر میں انسانوں میں پائی جانے والی ایک اور صلاحیت کا تذکرہ۔ یہ صلاحیت بھی دو چار لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اس صلاحیت کو طلسماتی چھڑی کے ذریعہ زیر زمین پانی تلاش کرنے کی صلاحیت کہتے ہیں۔ اس صلاحیت کا حامل شخص اپنے دونوں ہاتھوں میں چھڑی لے کر چھڑی کو جسم کی سیدھ میں رکھتے ہوئے چلتا ہے۔ اور جب کہیں زیر زمین پانی آجاتا ہے تو چھڑی اس شخص کے ہاتھ میں ہلنے یا اُچھلنے لگتی ہے۔ زیر زمین پانی تلاش کرنے کا یہ طریقہ اتنا کامیاب ہے کہ دنیا کے بہت سے ممالک میں حکومتیں زیر زمین پانی کی تلاش کے سلسلے میں اس صلاحیت کے حامل افراد کی خدمات معقول معاوضے پر حاصل کرتی ہیں۔

اس صلاحیت کے سلسلے میں ماہرین کا خیال ہے کہ انسانی جسم میں پائی جانے والی کیمیاوی یا برقی توانائی کی بدولت یہ لوگ زیر زمین پانی کو تلاش کر لیتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ چونکہ انسانی وزن کا ۷۵ فیصد پانی پر مشتمل ہے اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ ہمارے جسم میں موجود پانی کو زیر زمین پانی کی جانب سے مخصوص سگنل موصول ہوتے ہیں۔ یہ مخصوص سگنل بازوؤں کی مچھلیوں سے گزر کر ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چھڑی کو ہلاتے ہیں۔ مردوں کے مقابلے میں خواتین کے اندر یہ صلاحیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ماہرین کے بقول یہ صلاحیت تجربے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔

آپ ایک بار پی کر تو دیکھیں!
TAPAL
TAPAL TEA
DANEDAR
Leaf Blend
Net weight when packed
200 grams
ٹپال چائے
دانے دار
لیف بلینڈ
فوری تیار، زیادہ خوشبودار، گہری رنگت، یادگار لذت، ایک پیالی میں گھنٹوں تسکین
MASS

کیا آپ کو اپنی ذہانت پر ناز ہے؟

آپ کی ذہانت سے انکار نہیں، مگر آنکھ مچولی ذرا آپ کی ذہانت کی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ یہ مختلف اشیا اور جانوروں کی تصویریں ہیں۔ فوٹوگرافر نے یہ تصاویر اتنے قریب سے بنائی ہیں کہ پہچانی نہیں جا رہیں۔ آپ ان تصویروں کو غور سے دیکھیے اور بتلائیے کہ یہ کن چیزوں کی تصویریں ہیں؟ اگر آپ نے ساری تصویروں کو تین منٹ کے اندر اندر ٹھیک ٹھیک پہچان لیا تو آپ کی ذہانت واقعی قابلِ رشک ہے۔

نعیم بلوچ

تعاقب

وقاص نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہی ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابوں کے بنڈل میں سے ایک کتاب نکالی اور بے صبری سے اُسے دیکھنے لگا۔ دو تین منٹ کے بعد جب اُس نے کتاب سے نظریں اُٹھائیں تو وہ بُری طرح چونک پڑا۔ وہ بے دھیانی میں اپنی کار جیسی کسی دوسرے کی گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑی کتاب کو کتابوں کے بنڈل میں رکھا اور اپنا ہاتھ دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا دیا لیکن اس کا ہاتھ ابھی ہینڈل تک پہنچ نہیں پایا تھا کہ یک دم گاڑی کے چاروں دروازے انتہائی تیزی سے ایک سیکنڈ کے وقفے کے ساتھ کھُلے اور اگلے لمحے چار آدمی کار میں داخل ہوئے۔ پچھلے دروازوں سے داخل ہونے والے دونوں آدمی وقاص کو دیکھ کر حیرت سے اُچھل پڑے، لیکن ان میں سے ایک نے فوراً وقاص کو گردن سے پکڑا اور اپنا پورا زور لگاتے ہوئے اُسے سیٹ کے نیچے گرا دیا۔ درد سے وقاص کے منہ سے کئی زوردار چیخیں نکل گئیں۔ چیخوں کی آواز سُن کر اگلی سیٹ پر بیٹھنے والے حیرت سے پیچھے دیکھنے لگے۔ مگر وقاص کو گردن سے پکڑنے والے نے انتہائی غصیلی اور تیز آواز میں کہا۔

"تم گاڑی نکالو ـــــ جلدی!"

"لل... لیکن یہ ہے کون؟" ڈرائیور نے گھبراہٹ اور حیرت کی ملی جلی آواز میں پوچھا۔

"تم پہلے یہاں سے تو نکلو... پھر اس مصیبت کو بھی دیکھتے ہیں۔"

ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ گاڑی فوراً اسٹارٹ ہوئی اور تیزی سے حرکت میں آئی۔ اس دوران اُس آدمی نے وقاص کو سیٹ کے نیچے دبوچے رکھا اور دوسرے نے اس کے منہ میں رومال ٹھونس دیا۔ اگلے دو منٹوں میں گاڑی پارکنگ سے نکل کر بڑی سڑک پر آگئی اور اب وہ سڑک پر چلنے والی ٹریفک کا حصّہ بن چکی تھی۔

وقاص کی کار کا ڈرائیور کار میں بیٹھا اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ وقاص تو اُس سے پہلے دکان سے باہر آگیا تھا، پھر وہ کہاں چلا گیا...؟ اچانک اگلی کار سے اُسے چیخوں کی آواز آئی۔ چیخوں کی آوازیں اُسے کچھ جانی پہچانی سی لگیں، اس کے ذہن میں ابھی کچھ نہیں آرہا تھا کہ کار تیزی سے حرکت میں آئی اور جب وہ بڑی سڑک کی طرف مُڑی تو اُسے یقین ہو چکا تھا کہ چیخوں کی آوازیں تو وقاص کی تھیں۔ اسی گھبراہٹ میں اُسے ایک اور شور سُنائی دیا...

"ڈاکا، ڈاکا... جیولری کی دکان پر ڈاکا۔"

وہ گاڑی سے باہر آگیا... جیولری کی دکان سے باہر نکلنے والا ایک آدمی بتا رہا تھا۔

"میں دکان کے اندر ہی تھا جب ڈاکا پڑا۔ وہ بہت سارے قیمتی زیورات لے گئے ہیں... مالک پولیس کو فون کر رہا ہے لیکن وہ ٹیلی فون کے تار کاٹ گئے ہیں..."

وقاص کی گاڑی کا ڈرائیور یہ سُن کر تیزی سے مُڑا اور قریبی دکان میں گھس گیا۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے کاؤنٹر پر بیٹھے اُس آدمی تک پہنچا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"ایک فون کرنا ہے... بہت ضروری..."

دکاندار کے جواب کا انتظار کیے بغیر اُس نے سامنے پڑے ٹیلی فون کے نمبر گھمانے شروع کر دیے... فون کسی نے اُٹھایا تو وہ بالکل ہکلاتے ہوئے بولا... "میں مجید بول رہا ہوں... ہاں ہاں ڈرائیور، وہ، بیگم صاحبہ میں اور وقاص کتابیں خریدکر باہر نکلے تو پتا نہیں وقاص کہاں چلا گیا۔ میں گاڑی میں بیٹھا تھا کہ اگلی کار سے چیخوں کی آوازیں آئیں لیکن جب کار سڑک کی طرف مڑی تو مجھے خیال آیا کہ یہ تو وقاص کی چیخیں تھیں... جج جی۔ مجھے یقین ہے کہ اُسی کی آوازیں میں نے سُنی ہیں... وہ کار بالکل ہماری کار کی طرح تھی... اور وہ جی اسی وقت ایک جیولری کی دکان میں ڈاکا بھی پڑا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وقاص ڈاکوؤں کی گاڑی کو اپنی گاڑی سمجھ کر اس میں بیٹھ گیا ہے اور وہ اُسے لے گئے ہیں... ہاں۔ ٹھیک ہے جی، میں یہیں ٹھہرتا ہوں..."

ڈرائیور نے فون بند کیا تو دکاندار نے ایک ہی سانس میں درجن بھر سوال داغ دیے، لیکن اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔۔۔ "مجھے پہلے پانی پلائیے۔۔۔"

وقاص کی گردن دبانے والے کے ساتھی نے جب بتایا کہ ان کی گاڑی کا پیچھا نہیں ہو رہا اور اب خطرے کی کوئی بات نہیں تو اس کے منہ سے رومال نکال لیا گیا اور انتہائی خوفزدہ آواز سے پوچھا گیا۔۔۔ "کون ہو تم؟"

وقاص دسویں جماعت کا ایک ذہین طالب علم تھا۔ اُس وقت تک وہ صورتِ حال کو کافی حد تک سمجھ چکا تھا اور ذہنی طور پر اس سوال کے لیے تیار تھا۔ لہٰذا اس نے کافی اطمینان سے سوال کا جواب دیا۔

"میں آپ کی گاڑی کو اپنی سمجھ کر اس میں بیٹھ گیا۔ بالکل اسی طرح کی ہے ہماری گاڑی، وہ آپ کی گاڑی کے پیچھے کھڑی تھی۔ یہ بالکل اتفاق سے ہوا ہے۔۔۔ جان بوجھ کر۔۔۔"

"اچھا اچھا۔ خاموش رہو اب۔" اُسے سختی سے ڈانٹ کر کہا گیا۔

"میرے خیال میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے آدمی نے کہا۔

"لیکن اس کا کریں گے کیا۔۔۔؟ اڈّے پر لے جانا بھی تو ٹھیک نہیں۔۔۔"

"تو کیا راستے میں چھوڑو گے؟ اب تو یہ ہمیں اچھی طرح دیکھ بھی چکا ہے۔ اڈّے پر جا کر قصہ تمام کرو اس کا، اور کوئی حل نہیں۔ چھوڑنا تو موت کے منہ میں جانا ہے۔"

"ہوں۔۔۔ صحیح کہتے ہو۔۔۔ اور کوئی راستہ نہیں۔۔۔" گردن دبوچنے والے نے بھی اپنا فیصلہ دیا۔

وقاص کو یوں لگا جیسے کسی نے ہاتھ ڈال کر اس کے دل کو سختی سے پکڑ لیا ہے۔ خوف سے سارا جسم پسینے سے بھیگ چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کیفیت میں کم از کم آدھ گھنٹہ تو گزر ہی چکا تھا۔ پھر معلوم نہیں کہ کیسے وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگا۔۔۔ "اے خدا، میرے پیارے اللہ، تُو ہی اس وقت مجھے ان ظالموں سے بچا سکتے ہو، اے مالک! میں اس قسم کی بے کسی اور بے بسی کی موت نہیں چاہتا۔۔۔ اے خدا میری مدد کر، صرف تم ہی مجھے بچا سکتے ہو! صرف تم۔۔۔" کچھ منٹ تک وہ اسی قسم کی دعائیں کرتا رہا۔ پھر ایک دم اس کے کانوں میں ڈرائیور کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"ٹریفک رُکی ہوئی ہے۔۔۔ اوہ، میرے خیال میں چیکنگ ہو رہی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ روکو، واقعی چیکنگ ہو رہی ہے۔" اس کے ساتھ والے نے بھی اس کی تصدیق کی۔

"میرے خیال میں پولیس حرکت میں آ چکی ہے۔ توقّع سے بہت پہلے۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔"

"ہمیں اب گاڑی یہیں چھوڑنا پڑے گی۔ اڈّے پر پیدل ہی پہنچنا ہوگا۔۔۔ کیوں کہ وہ ہر سواری کو چیک کریں گے۔۔۔"

"لیکن اس چھوکرے کا کیا کریں گے؟ کیا ساتھ گھسیٹتے پھریں گے؟"

"نہیں... بس پتا کاٹو اس کا بھی" یہ گردن دبانے والے ہی کی آواز تھی... اور حکم اُس نے اپنے ساتھ والے کو دیا تھا۔ اس نے جیب سے ایک جدید قسم کا ریوالور نکالا۔ ریوالور شاید پہلے ہی لوڈ تھا۔ کیوں کہ جیب سے نکالتے ہی اس نے سیٹ کے نیچے گرے ہوئے وقاص کی طرف تان لیا تھا۔

کار اُس وقت سڑک کے کنارے ہو کر تقریباً رُک چکی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف گراسی پارک بنے ہوئے تھے اور ان کے پرے بڑی بڑی کوٹھیاں اور بنگلے تھے۔ یہ شہر کا ماڈرن علاقہ تھا۔ سڑک پر ٹریفک نہ زیادہ تھی نہ کم۔ معمول کے مطابق، لیکن سامنے کی طرف سے آنے والی ٹریفک بہت کم تھی اس کی وجہ یقینی طور پر چیکنگ ہی تھی۔

ریوالور کی نُبلی پر انگلی کا زور ابھی اتنا نہیں پڑا تھا کہ گولی چل جاتی، کہ ریوالور پر ایک بھرپور ہاتھ پڑا اور ساتھ ہی ایک ڈانٹ سُنائی دی۔

"حرام خور، اپنے باپ پر پہلے سائیلنسر چڑھا لو، گولی کی آواز سے ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔" گردن دبانے والے نے ریوالور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بات کو دو تین غلیظ قسم کی گالیوں پر ختم کیا۔ وقاص کو یوں لگا کہ جیسے اس فقرے نے اس کے جسم میں بجلیاں بھر دی ہیں اور اس کے ذہن میں اُمیدوں کے چراغ روشن کر دیے ہیں۔ وہ سیٹ کے نیچے سے یوں تڑپ کر اُٹھا جیسے ذبح ہونے والا بکرا قصائی سے آزاد ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ گردن دبانے والا اور اس کا ساتھی وقاص سے اس قسم کے ردِعمل کا قطعی طور پر کوئی تصور نہیں رکھتے تھے۔ وقاص نے اب تک کمال درجے کی فرمانبرداری کا ثبوت دیا تھا، لیکن اب وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ وہ دروازہ کھول کر کسی طرح گاڑی سے باہر آسکے۔ یہ اُس کی خوش قسمتی سمجھئے یا عقل مندی کہ اُس نے اس دروازے پر حملہ کیا جس پر بیٹھنے والا ریوالور پر سائیلنسر چڑھانے کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا، وہ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا اور اس کے دشمن اس کے کپڑے پھاڑنے میں ہی کامیاب ہو سکے۔ دروازہ کھلتے ہی ریوالور پر سائیلنسر چڑھانے والا اور وقاص دونوں سڑک پر گر پڑے اور اگلے لمحے وقاص ریوالور والے کے بازو کو زوردار طریقے سے کاٹ کر سامنے کی ایک کوٹھی کی طرف بھاگ رہا تھا۔ جب وہ گراسی پارک کو پار کر چکا تھا کہ اس پر پہلی گولی چلائی گئی اور جب تیسری گولی چلی تو وہ کوٹھی کے باہر بنے لان کی آڑ لے چکا تھا۔ ان تین گولیوں میں سے صرف ایک گولی ایسی تھی جو اس کے کان کو چھوتی ہوئی گزری تھی۔ آڑ میں ہونے کے بعد اب وقاص نے حلق پھاڑ کر چیخنا شروع کر دیا لیکن اس کی آواز ایک خوفناک الشیشن نسل کے کتے کی آواز میں دب گئی۔ یہ کتا اسی کوٹھی سے برآمد ہوا تھا جس کے گیٹ کو وقاص نے پاگلوں کی طرح پیٹا تھا۔ کتے کی آواز سُن کر وہ ابھی ایک قدم پیچھے ہی ہٹا تھا کہ گیٹ کے نیچے سے کتا نکل کر اس پر حملہ آور ہو چکا تھا۔ وقاص اس حملے سے قطعی طور پر بے خبر تھا لہٰذا وہ اپنا کوئی دفاع نہ کر سکا۔ کتا وقاص پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ وقاص کتے سمیت بُری طرح زمین پر گر پڑا۔ کتا ایک گٹھری کی طرح اس کے اُوپر پڑا تھا اور اس

کے سر پر خون کا فوارہ اُبل رہا تھا۔ اُس نے گردن گھما کر دیکھا تو اُسے گراسی پلاٹ میں کوئی دس پندرہ قدم دُور وہی دو کار والے نظر آئے جن سے وہ جان چھڑا کر بھاگا تھا۔ انھوں نے گولی یقیناً وقاص پر ہی چلائی تھی لیکن قدرت نے اُسے کتّے کے ذریعے محفوظ رکھا۔ وقاص نے اُسی حالت میں پڑا رہنا بہتر خیال کیا تاکہ حملہ آور اس غلط فہمی میں رہیں کہ گولی اسے بھی لگی ہے۔ چند لمحوں بعد کوٹھی کے دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔ جو شخص باہر آیا تھا وہ اپنے لباس اور چہرے مہرے سے کوئی ملازم معلوم ہوتا تھا۔ وقاص نے اُسے دیکھ کر حرکت کرنے کا ارادہ کیا لیکن کچھ سوچ کر وہ پھر ٹھہر گیا۔ اس نے کار والوں کی طرف دیکھا لیکن وہاں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ کسی دوسرے آدمی کو اپنی شکل دکھانا نہیں چاہتے مگر اُسے ابھی بھی خدشہ تھا کہ وہ ضرور کہیں چھپے ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اس وقت تک اُس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گے جب تک انھیں اس کے ختم ہو جانے کا یقین نہ ہو جائے۔ لہٰذا وہ اسی طرح وہاں لیٹا رہا۔ اس وقت تک کوٹھی سے نکلنے والا ملازم اس کے قریب آچکا تھا۔ کتّے کے سر سے نکلتے ہوئے خون سے اُسے کتّے کے مرنے کا تو یقین ہو چکا تھا' اس نے دم سادھ کر لیٹے ہوئے وقاص کو پاؤں سے بیدردی سے ٹھوکر ماری، حالانکہ اس کے کپڑے بھی خون میں لت پت تھے' لیکن وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کتّے کو اس نے ہی ہلاک کیا ہے۔ اس ٹھوکر پر جب وقاص نے کوئی حرکت نہ کی تو وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ شاید ایک لڑکے اور ایک کتّے کی لاش دیکھ کر ڈر گیا تھا۔

وقاص نے کن اکھیوں سے کار والوں کی طرف دیکھا اس کا چہرہ چونکہ ان کی طرف ہی تھا۔ اس لیے وہ انہی کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ اور انھیں جب اُس نے سڑک کی طرف اطمینان کے ساتھ جاتے دیکھا تو سکھ کا سانس لیا۔ اس نے آرام سے مُردہ کتّے کو اپنے اوپر سے ہٹایا اور کوٹھی کے ملازم کی طرف دیکھا تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا... یہ تو اُس کے کلاس فیلو نوید کے گھر کا ملازم تھا جو اکثر اُسے اسکول چھوڑنے اور لے جانے آتا تھا۔ اس حلیے میں شاید اس نے وقاص کو پہچانا نہیں تھا۔ اس نے ملازم کو اس کا نام لے کر پکارا۔

"چھیدے! میں ہوں نوید کا دوست وقاص... نوید ہے گھر پر...؟"

چھیدے نے سخت حیرانی اور گھبراہٹ سے اُسے اُٹھتے ہوئے دیکھا اور منہ سے عجیب و غریب طریقے سے "ہاں" کی آواز نکلی' وقاص نے اِسے ہی غنیمت سمجھا اور جلد ہی اُسے وہیں حیران چھوڑ کر کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی اُس کی نظر نوید پر پڑی۔ نوید کے ساتھ اُس کے دوسرے گھر والے بھی تھے۔ وقاص نے بغیر کسی تمہید کے' ان کی حیرت کی پروا کیے بغیر' انھیں اپنی تمام کہانی مختصر ترین الفاظ میں سُنا ڈالی اور آخر میں یہ کہہ کر وہ واپس بھاگ اُٹھا...

"میں بدمعاشوں کے پیچھے جا رہا ہوں... گھر فون کر دیجئے گا اور پولیس کو بھی... نوید کو گھر کا نمبر معلوم ہے۔"

"اگر اس کے کپڑے کتّے کے خون سے سُرخ نہ تھے اور گولی اُسے نہیں لگی تو بھی اب ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ کوٹھی سے

کوئی باہر آرہا تھا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے، اب سامان سمیٹو اور نکلو"۔

"لیکن باس، سامان بھی تو بہت ہے اور ٹھکانا ابھی بیس پچیس کلومیٹر دور ہے۔ میرا خیال ہے ہم اس کالونی کے اندر اندر چھوٹی سڑک سے ہوتے ہوئے باہر نکل جائیں، یہ علاقہ میرا بہت اچھا دیکھا ہوا ہے۔"

"تو پھر بحث کس بات کی؟ چلو، دیر مت کرو۔۔۔"

اس مشورے کے بعد کار حرکت میں آئی اور ساتھ کی ایک بغلی سڑک کی طرف مڑ گئی۔ یہ سڑک وقاص کے دوست نوید کے گھر سے تین مکان چھوڑ کر کالونی کے اندر جارہی تھی۔

وقاص جب نوید کے گھر سے باہر نکلا تو ڈاکوؤں کی کار چھوٹی سڑک کی طرف مڑ رہی تھی۔ وہ فوراً ایک طرف آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ سوچنے لگا کہ کیا کرے۔ اسی سوچ میں تھا کہ اس نے موٹر سائیکل کی آواز سنی، مڑ کر دیکھا تو نوید تھا۔ نوید نے بھی اُسے دیکھ لیا۔ اُسے دیکھتے ہی بولا۔

"وقاص تمہاری امی نے فون پر کہا ہے، تمہیں ہم کہیں مت جانے دیں۔ وہ بہت پریشان تھیں۔ اور معلوم ہے تم کن کی کار میں تھے۔۔۔؟ وہ ڈاکو تھے، جیولری کی دکان میں ڈاکا مار کر بھاگے تھے۔"

وقاص نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس کو اشارہ کر کے پوچھا۔۔۔

"وہ کار دیکھ رہے ہو جو سامنے کی سڑک پر جارہی ہے۔ یہی ہے وہ کار جس میں میں سوار ہوا تھا اور جس میں اب تمہاری اطلاع کے مطابق ڈاکو ہیں۔۔۔ نوید، تم یہ موٹر سائیکل ذرا مجھے دینا۔" وقاص نے یہ آخری جملہ تھوڑے سے وقفے کے بعد ادا کیا تھا۔

"ہوش میں آؤ وقاص۔۔۔ وہ پہلے ہی تمہاری جان کے دشمن ہیں!"

"موت کو اس قدر قریب سے دیکھنے کے بعد اب کوئی خوف باقی نہیں رہا۔۔۔ دیکھو نوید اگر خدا مجھے ان ظالموں سے نہ بچاتا تو میری زندگی کا حاصل کیا ہوتا؟ آدمی اگر مرے تو کچھ کر کے مرے، زندگی میں کچھ کرنے کا اگر کبھی موقع ملے تو اُسے غنیمت جاننا چاہیے ان ڈاکوؤں کو صرف میں پہچانتا ہوں۔ میں ہمت کروں تو ان کو پکڑوا سکتا ہوں۔"

نوید کا چہرہ جذبات سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اُس نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور وقاص کو اپنے پیچھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وقاص شاید پہلے ہی یہی چاہتا تھا۔ بیٹھتے ہی بولا۔۔۔

"کار کے پیچھے پیچھے مناسب فاصلہ رکھ کر چلتے جاؤ۔" لیکن کب تک یہ تعاقب جاری رکھو گے؟"

"جب تک پولیس نہیں آجاتی یا کوئی اور مدد۔۔۔"

وقاص نے اپنا جملہ ابھی مکمل کیا تھا کہ اُسے ایک تیز قسم کا کان پھاڑ دینے والا ہارن اور کسی بڑی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ انھیں کچھ دُور سامنے سے ایک ٹرک آتا ہوا نظر آیا۔ ٹرک نے یہ ہارن ڈاکوؤں کی کار کے لیے بجایا تھا۔ سڑک چونکہ چھوٹی تھی اس لیے ٹرک کو گزرنے کے لیے خاصی دِقّت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وقاص نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا ذہن ایک منصوبہ بنا چکا تھا۔ اس نے بڑے جوش سے نوید کے کندھے دباتے ہوئے کہا۔

"نوید کسی طرح ڈاکوؤں کی کار کو اوورٹیک کر لو، ٹرک کی دوسری طرف سے نکلنا تاکہ کار والے دیکھ نہ سکیں۔ میرے خیال میں تمھارے پاس ایسا کرنے کے لیے کافی وقت ہوگا۔"

"ہاں، ہو تو سکتا ہے ایسا" اور ساتھ ہی نوید کی ون سیونٹی فائیو (۱۷۵) موٹر سائیکل برق رفتاری سے اُڑنے لگی۔ ڈاکوؤں کو اپنی کار سڑک سے اُتارنی پڑی، لیکن پھر بھی ٹرک کے لیے مناسب جگہ نہ بن سکی۔ ٹرک کا ڈرائیور بھی خاصا بادشاہ ثابت ہوا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ٹرک کو کچی سڑک پر اُتارے بغیر گزر جائے۔ نتیجہ یہ ہوا دونوں کو رُکنا پڑا۔ ڈاکوؤں نے اپنی کار آخری حد تک نیچے اُتار لی تھی۔ لہٰذا وہ بالکل پھنس کر رہ گئے۔ ٹرک کو آخر سڑک سے نیچے اترنا ہی پڑا، لیکن پھر بھی اس کی طرف اتنی جگہ بچ ہی گئی تھی کہ نوید کی موٹر سائیکل اچھی خاصی رفتار سے اس کے ساتھ سے نکل گئی تھی اور جب تک ڈاکوؤں کی کار اور ٹرک ایک دوسرے کو کراس کر پائے، نوید اور وقاص مناسب حد تک آگے نکل چکے تھے۔ تقریباً ایک کلو میٹر چلنے کے بعد انھیں ایک جگہ ایک عمارت تعمیر ہوتی دکھائی دی۔ وقاص نے نوید کو اس زیرِ تعمیر عمارت کے سامنے رُکنے کے لیے کہا، جس ٹرک کی وجہ سے وہ کار سے آگے نکلنے میں کامیاب ہوئے تھے، شاید وہ اسی جگہ اینٹیں اُتار کر واپس ہوا تھا۔ وقاص نے نوید کو موٹر سائیکل سڑک کے عین درمیان میں کھڑا کرنے کو کہا اور خود اینٹوں کی طرف بھاگ اُٹھا۔ جتنی اینٹیں وہ اُٹھا سکتا تھا اُٹھائیں اور انھیں سڑک کے درمیان جوڑ جوڑ کر رکھنے لگا۔ نوید موٹر سائیکل کھڑی کر چکا تو اس نے اُسے بھی یہی کام کرنے کو کہا۔

عمارت میں کام کرنے والے مزدور اور دوسرے لوگ ان بن بُلائے مہمانوں کی اس عجیب و غریب کارروائی پر سخت حیران تھے۔ ایک آدمی، جو کہ تعمیر کے کام کی نگرانی کر رہا تھا، سخت غصّے میں ان کو ڈانٹتے ہوئے چیخا چلّایا۔

"یہ کیا کر رہے ہو... کون ہو تم؟"

وقاص نے دو جملوں میں ہی صورتِ حال سمجھا دی۔ اس کی بات کی سچّائی کا ثبوت اس کے خون آلود کپڑے دے رہے تھے۔

وقاص نے اُسے معقول آدمی دیکھ کر کسی طرح پولیس کو فون کرنے کی بھی فرمائش کر دی اور کہا،

"پولیس کو اس جگہ پہنچنے کے لیے کہیئے۔ ہم انشاءاللہ اتنی دیر تک انھیں روکے رکھیں گے۔"

"میں فون کیے دیتا ہوں... لیکن بیٹے دھیان سے، وہ کہیں فائرنگ ہی نہ کر دیں!"

"نہیں انکل آپ فکر نہ کریں، وہ ہم سے اُلجھنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے، بس آپ جلد از جلد فون کریں۔"

سڑک کے عین درمیان ایک موٹر سائیکل اور اینٹوں کا ڈھیر دیکھ کر کار کے ڈرائیور کے منہ سے گالیاں یوں نکل رہی تھیں جیسے مشین گن سے گولیاں۔ ڈاکوؤں کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ یا اینٹوں کو وہاں سے ہٹائیں یا موٹر سائیکل کو۔۔۔ پہلے تو انھوں نے ہارن بجایا لیکن جب ایک دو منٹ تک کوئی بھی نہ آیا تو ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا آدمی کار سے اُترا۔ موٹر سائیکل کو اسٹینڈ سے اُتارا، لیکن اُسے تالا لگا ہوا تھا۔ وزنی موٹر سائیکل کو اب وہ اکیلا اُٹھا کر ایک طرف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے موٹر سائیکل کو دھکّا دے کر گرا دیا۔ عین اُس وقت نوید اینٹوں کی اوٹ سے نکلا اور سخت غصّے میں بولا۔

"کیا تکلیف ہے تمھیں، میری موٹر سائیکل کیوں گرائی ہے؟"

"یہ سڑک تمھارے باپ کی ہے جو درمیان میں موٹر سائیکل اور اینٹیں رکھ کر راستہ بلاک کر رکھّا ہے؟"

"بکواس بند کرو کتّے" نوید نے کڑک کر کہا اور ہاتھ میں پکڑا اینٹ کا ٹکڑا اس کے سر پہ دے مارا۔ یہ منظر دیکھ کر کار سے یکے بعد دیگرے دو آدمی اُترے اور خوفناک انداز سے نوید کی طرف بڑھے۔ نوید نے ان کی طرف بھی نشانہ باندھ کر دو پتھر پھینکے اور پھر فوراً ایک طرف بھاگ اُٹھا۔ وہ تینوں اس کے پیچھے لپکے، لیکن ایک کے کہنے پر پھر رُک گئے۔

وقاص اس افراتفری سے پوری طرح فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ اُسے زیرِ تعمیر عمارت سے دو بڑے بڑے کیل مل گئے تھے، اور وہ انھیں لیے چُپکے سے کار کی پچھلی طرف پہنچا اور پچھلے کے دونوں ٹائروں کے ساتھ انھیں اس طرح رکھ دیا کہ کار آگے چلے تو لازمی طور پر پنکچر ہو جائے۔۔۔ اس کام سے فارغ ہو کر جب وہ واپس مڑ کر اپنی جگہ پر پہنچا تو اُس نے ڈاکوؤں کو کار کی طرف آتے دیکھا ان میں ایک کا سر پھٹا ہوا تھا اور اس سے خون رس رہا تھا۔ نوید اُسے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سڑک سے موٹر سائیکل ایک طرف ہٹ کر گرا پڑا تھا۔ اب سڑک پر اتنی جگہ بن چکی تھی کہ کار گزر سکتی تھی، لیکن جیسے ہی وہ تمام کار میں بیٹھے۔ ایک بڑا سا پتھر کار کے اگلے شیشے پر لگا اور شیشہ ٹوٹ کر چکنا چُور ہو گیا۔ یہ سب کچھ منصوبے کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ ڈاکوؤں نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور کار اسٹارٹ ہو گئی۔ اب وقاص نے یکے بعد دیگرے ڈرائیور کی طرف پتھر پھینکے۔ ایک پتھر نشانے پر بیٹھا، لیکن اس دفعہ اس پر فائر کیا گیا۔ یہ فائر ایک بڑی بندوق سے کیا گیا تھا۔

فائر کی آواز سُن کر وقاص دبک کر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ اب وہ نوید کی طرف سے انتظار کر رہا تھا۔

پولیس کی گاڑی انتہائی تیز رفتاری سے بہار کالونی کی طرف اُڑی جا رہی تھی کہ انسپکٹر سعید کو نیا حکم ملا۔

"انسپکٹر، بہار کالونی کی اسٹریٹ نمبر آٹھ ۸ کوٹھی نمبر اکسٹھ پر پہنچو۔ کچھ لوگوں نے مجرموں کو وہاں روک رکھا ہے۔ جلدی پہنچو۔"

"اوکے سر، میں تین منٹ کے اندر اسٹریٹ نمبر آٹھ میں داخل ہو رہا ہوں۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ اور اینڈ آل" سلسلہ منقطع ہوا اور کار کی رفتار پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی۔

وقاص کے بعد نوید نے اپنی باری پر پتھر پھینکے۔ اس کام میں اب عمارت میں کام کرنے والے مزدور بھی شامل ہو چکے تھے۔ ڈاکو اس صورتِ حال سے بالکل عاجز آ چکے تھے۔ وہ اب اندھا دُھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ڈرائیور اچھا خاصا زخمی ہو چکا تھا۔ اُسے شیشے کے ٹکڑے اور کئی ایک پتھر لگے تھے لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور گاڑی اسٹارٹ کر کے پوری رفتار پر چھوڑ دی لیکن دوسرے ہی لمحے کار کے پچھلے پہیوں نے وقاص کے لگائے ہوئے کیلوں کی فتح کا اعلان کیا۔ کار تھوڑی دُور جا کر رُک گئی۔ لیکن پھر چلنے لگی ڈرائیور اُسے اسی طرح گھسیٹ رہا تھا۔ ایک منٹ بعد پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز سُنائی دی۔

سائرن کی آواز سُن کر چاروں ڈاکو گولی کی طرح باہر نکلے لیکن ایک دفعہ پھر وقاص، نوید اور مزدوروں کے پتھروں نے ان کو اپنی زد میں لے لیا۔ ویسے وہ اب بھاگ کر جا بھی کہاں سکتے تھے۔؟ لوگ اپنے گھروں کے دروازے بند کر چکے تھے۔ وہ مجبور تھے کہ اب ہتھیار ڈال دیں۔

جب انھوں نے اپنے ہتھیار پولیس کے حوالے کیے تو وقاص اور نوید اپنے "مورچوں" سے باہر آ گئے۔ وقاص کو دیکھ کر اس کی گردن دبانے والا دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو یہ تم ہو، کباب میں ہڈی۔۔۔"

وقاص نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ پولیس والا اُسے مختلف قسم کے خطابات سے نوازتا ہوا ہتھکڑی ڈال رہا تھا۔

بے خبری

ایک شخص اپنے دوست کے دروازے پر پہنچا اور دستک دی۔ دوست باہر نکلا اور اس کے آنے کی وجہ پوچھی۔ اس نے کہا۔ "مجھے اس وقت دو ہزار روپے کی اشد ضرورت ہے۔ میں مقروض ہوں"۔ دوست اندر گیا اور فوراً دو ہزار نقدی لا کر اس کے حوالے کر دی۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد وہ اندر جا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اس کی بیوی نے کہا۔ "اگر تمہیں روپے کے ضائع ہونے کا اتنا ہی دکھ ہے تو دیئے ہی کیوں تھے؟"

اس نے کہا۔ "اے نیک بخت عورت! میں تو اس لئے رو رہا ہوں کہ میں اپنے دوست کے حالات سے اس قدر بے خبر رہا ہوں کہ اسے خود میرے دروازے پر اپنی حاجت بیان کرنی پڑی"۔

ایم اکرم سیال ذکی، چیاہ سیالاں

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت۔ جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

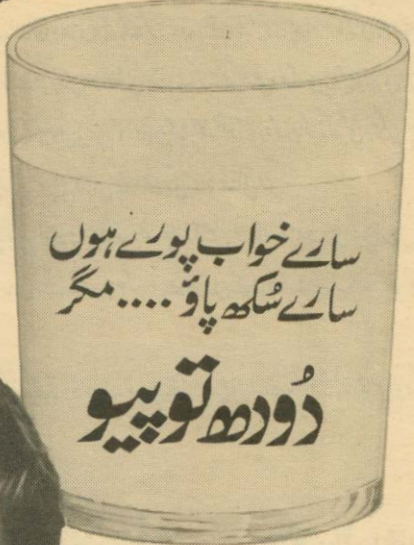

سارے خواب پورے ہوں
سارے سُکھ پاؤ .... مگر

دُودھ تو پیو

مستقبل کی بڑی ذمّہ داریوں کے لئے ابھی سے اپنے ذہن کو تر و تازہ اور جسم کو توانا رکھئے غیر متوازن غذائیں انسانی جسم کی تمام ضروریات پوری نہیں کرتیں۔
دودھ واحد غذا ہے جو انسانی جسم کو زیادہ سے زیادہ قوّت فراہم کرتی ہے۔

قدرت کی عطا کردہ اِس انمول نعمت میں کیلشیم، پروٹین، وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا شامل ہیں۔ دُودھ کا روزانہ استعمال۔ اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہے
دن میں دو بار دودھ پینا اپنی عادت بنایئے۔
چاہیں تو دُودھ میں چاکلیٹ یا شربت ڈال کر پی سکتے ہیں۔

یوں گویا۔
غذا کی غذا
مزے کا مزا

اِشتہار برائے بہبود اطفال: منجانب ماہنامہ آنکھ مچولی، کراچی

MASS

شاھد علی سحر

انکل جانباز کے کارنامے

پاک تعمیر پلازہ کے احاطے میں کرکٹ کھیلنے والے ننّھے کھلاڑی بغل میں بلّے دبائے، اپنے اپنے فلیٹوں کی طرف واپس جا رہے تھے۔ اچانک بڑے زور سے بادل گرجے، بجلی کڑکی اور پھر مُوسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بچّے گھروں کی طرف دوڑے۔

حسان باہر لٹکی ہوئی یونیفارم اُٹھانے کو لپکا۔ ندا کو بالکونی میں رکھا ہوا جھولا یاد آیا۔ شفقت اور شجاعت کو اپنے طوطوں کے پنجرے کی فکر لاحق ہوئی۔ عابد نے اپنی سائیکل کو بھیگنے سے بچایا اور کامران اپنے جوتے اُٹھانے کو دوڑا۔ پلازہ کے گیٹ سے انکل جانباز بھی دوڑے چلے آتے تھے۔

"دیکھو! انکل جانباز! بارش سے کس قدر ڈرتے ہیں۔" کامران نے چیخ کر سب دوستوں کو متوجّہ

کیا۔۔۔

"آؤ، ان سے ملتے ہیں۔" سب نے بیک آواز کہا۔ "ممکن ہے، کوئی نئی کہانی سُننے کو مل جائے۔"

انکل جانباز زینے پر کھڑے اپنے کپڑے جھاڑ رہے تھے کہ بچّوں نے ان کا گھیراؤ کر لیا۔

"آپ تو کہا کرتے ہیں کہ میں بھوتوں سے بھی کبڈّی کھیلتا رہا ہوں۔۔۔" حسان نے شرارت سے کہا۔ "آج تو آپ پانی کی بوندوں سے ہی ڈر کر بھاگ نکلے۔"

"پورے ایک سو جھوٹے مرے تھے۔ تب تمھارے انکل جانباز پیدا ہوئے تھے۔" چچی جان نے دُور سے طعنہ دینے والے انداز میں کہا جو بیٹھی آلو چھیل رہی تھیں۔

"ہاں چچی جان۔ پتہ ہے پرسوں انکل ہمیں بتا رہے تھے کہ ــــــــــ" انھوں نے شیر کے حلق میں ہاتھ ڈال کر اس کی آنتیں باہر نکال پھینکی تھیں۔۔۔ مگر اس دوران جب گڈّو کا دُبلا پتلا سا کتّے کا پلّا اس طرف آنکلا تو انکل سر پر پیر رکھ کر ایسے بھاگے کہ پھر پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔" بچّوں کی مُسکراہٹ نے قہقہوں کا روپ دھار لیا اور انکل جانباز سب کو کھا جانے والی نظروں سے گھُورنے لگے۔

"تم سب بالکل بدّھو ہو۔" انھوں نے اپنی صاف شفّاف چندیا پر انگلیاں پھیرتے ہوئے وضاحت کی۔ "احمقو، اس وقت مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا تھا، اس لیے وہاں سے جانا پڑا۔ کتّا تو معمولی سا جانور ہے، میں تو اکثر شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، مزے سے کنگھی کرتا رہا ہوں۔"

"ہاں ہاں، بالکل سچ کہتے ہیں۔۔۔" حسان نے تصدیق کی۔ "میرے سامنے آپ نے شیر کے پنجرے کے پاس کھڑے ہو کر یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔" قہقہوں کا سیلاب ایک بار پھر اُمڈ پڑا اور انکل جانباز حسّان کو گھورنے لگے۔

"کہتے ہیں۔۔۔ پہلونٹی کے بچّے پر بجلی گر جاتی ہے۔" انکل جانباز نے نئی بات شروع کی۔ "میں بھی اپنے والدین کا پہلا بچّہ ہوں، مجھ پر بھی بجلی گر سکتی ہے۔ اس کے باوجود میں ابھی بارش میں چہل قدمی کرتا آیا ہوں۔"

"انکل! یہ آپ چہل قدمی کرتے ہوئے آرہے تھے۔۔۔؟" کامران نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں ہمارے پیارے انکل پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چہل قدمی کرتے ہیں۔" حسان کی اس بات پر چچی جان مُسکرانے لگیں۔

"ابھی تم نے بارش دیکھی ہی کہاں ہے۔" انکل بولے۔۔۔ "افریقہ کے جنگلوں کی طوفانی برسات دیکھ لیتے تو ساری زندگی بارش کے نام سے ہی کانپا کرتے۔۔۔ برسات کی ایک اندھیری رات تو بھلائے

نہیں بھولتی۔"

"اس رات بھی آپ نے ضرور بہادری کا کوئی کارنامہ انجام دیا ہوگا...؟" شفقت نے اپنی ہنسی چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"ارے میاں، ہماری بہادری کے قصّے تو افریقہ کے بچّوں کو اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔" انکل شعیب نے اپنی پتلی سی گردن کو اکڑاتے ہوئے انکشاف کیا۔ "افریقہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو، ہماری بہادری کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر افسوس کہ یہاں کوئی ہمیں گھاس ہی نہیں ڈالتا۔"

"ہاں تو انکل شعیب، ذرا اس اندھیری رات کا قصّہ ہم بھی تو سُنیں۔" حسّان نہایت سنجیدگی سے بولا اور سب اس کی تائید کرنے لگے۔

"تم لوگ اس قدر ضد کرتے ہو تو سنانا ہی پڑے گا۔" انکل نے گیلے فرش کو اپنے رومال سے صاف کیا۔ اور پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے۔ بچّے بھی ان کے سامنے سیڑھیوں پر جا بیٹھے۔

"یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ میرے نانا ایک مشہور شکاری تھے اور ان کے ساتھ میں نے ساری زندگی افریقہ کے خطرناک جنگلوں میں گزاری ہے۔" انکل نے قصّے کا آغاز کیا۔ "اُن دنوں میں افریقہ کے سرکاری شکاری کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہا تھا۔ اسی زمانے میں منگولو نامی گاؤں میں ایک شیرنی نے سخت دہشت پھیلائی ہوئی تھی۔ گاؤں کے پندرہ آدمی اس کا نوالہ بن چکے تھے۔

اس کا پہلا شکار مویشیوں کا محافظ ایک دیہاتی تھا۔ وہ بے چارہ بھیڑ بکریاں چرانے جنگل گیا تھا کہ شیرنی کا نشانہ بن گیا۔ اس کے بعد شیرنی کو انسانی گوشت اور خون کا کچھ ایسا چسکا پڑا کہ باقاعدگی سے ہر رات گاؤں پر حملہ کرتی اور ایک آدمی کو اُٹھا کر لے جاتی تھی۔ یہ سلسلہ گزشتہ پندرہ دنوں سے جاری تھا۔

حالات کے پیشِ نظر میں نے جنگل کے کنارے سے شروع ہونے والی آبادی کی سب سے پہلی جھونپڑی میں مورچہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے سے میرے مددگار حبشی سخت خوفزدہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ میں نے ان کے لیے جھونپڑی کے سامنے درختوں پر مچان بنوا دیے اور خود تنہا، اس گھاس پھوس کی جھونپڑی میں بیٹھ کر شیرنی کا انتظار کرنے لگا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا، جب مجھے کوئل کی کوک سُنائی دی۔ یہ میرے مددگاروں کی طرف سے ایک اشارہ تھا، جو انھوں نے شیرنی کو دیکھ کر دیا تھا۔ میرے نزدیک اس سگنل کی کوئی اہمیت نہ تھی، کیونکہ میرے حسّاس نتھنے شیرنی کی بُو پہلے ہی محسوس کر چکے تھے۔ رائفل پر میری گرفت مضبوط ہو گئی اور

میں کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ گزرتا ہوا کوئی بھی لمحہ شیرنی سے میری ملاقات کرانے والا تھا۔

میرے سامنے دروازہ اور اس کے قریب ہی ایک کھڑکی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شیرنی مجھ تک پہنچنے کے لیے کس راستے کو منتخب کرے گی، لیکن شیرنی کی مخصوص بُو کا احساس کھڑکی کی جانب سے پیدا ہو رہا تھا۔

میرا اندازہ سو فیصد درست نکلا... چند لمحوں بعد شیرنی کھڑکی پر پنجوں کے بل کھڑی، اندر کے حالات کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا، جس وقت شکاری کو فیصلہ کُن حملہ کرنا ہوتا ہے۔ میں نے اس کے سَر کا نشانہ لے کر رائفل کا ٹریگر دبا دیا لیکن... گولی نہیں چلی۔ میرا احمق مددگار رائفل میں کارتوس ڈالنا بھول گیا تھا۔ میں نے بھی اس پر اعتماد کرتے ہوئے رائفل میں کارتوس نہیں دیکھے تھے۔ اس وقت یہ اندھا اعتماد مجھے موت کا پیغام سُنا رہا تھا۔

حالات سو فیصد شیرنی کے حق میں جا رہے تھے اور اب وہ مجھ پر حملہ کرنے کے لیے بالکل مستعد تھی۔ میں نے اپنے مددگاروں کو منع کر دیا تھا کہ میرے اشارے کے بغیر گولی ہرگز نہ چلائیں اور اس وقت موت بے حد قریب نظر آ رہی تھی چنانچہ میں نے "زندگی یا موت" کے اصول پر لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

شیرنی نے مجھ پر جست لگائی تو میں اُچھل کر دوسری طرف ہٹ گیا۔ شیرنی کا وار خالی گیا۔ میں نے رائفل کا دستہ پوری قوت سے اس کے سَر پر مارا، لیکن رائفل ٹوٹ کر دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ میں نے ٹوٹی ہوئی رائفل کھڑکی سے باہر پھینک دی تاکہ میرے مددگار، میری بے بسی سے آگاہ ہو جائیں۔ اب میرے ہاتھ خالی تھے۔ دروازہ سامنے ہی تھا مگر وہاں سے بھاگنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ بھاگنے کی صورت میں شیرنی اس آسانی سے میرا شکار کر لیتی جیسے بلّی چوہے کو جھپٹ لیتی ہے۔

زندگی اور موت کے درمیان محض چند لمحوں کا فاصلہ تھا۔ میں نے ان لمحوں کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا اور زندہ رہنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ شیرنی کے اگلے حملہ کو بھی میں نے قلابازی کھا کر ناکام بنا دیا۔ میں لڑھکتا ہوا، زمین میں گڑی ہوئی مشعل کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اور وہ مشعل میرے لیے اس وقت خدا کی ایک بہت بڑی نعمت تھی۔ میں نے مشعل بڑھا کر شیرنی کو دھمکایا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دوبارہ حملے کی تیاری کرنے لگی۔ میں نے آخری حربے کے طور پر اپنے پیچھے، جھونپڑی کی دیوار کو آگ لگا دی اور پھر ذرا ہی دیر میں گھاس کی دیوار آگ کی دیوار میں تبدیل ہو گئی

یہ ترکیب کارگر رہی اور شیرنی گھبرا کر دروازے سے باہر نکل گئی۔ عین اُسی لمحے میرے مددگاروں

میرا جی چاہتا تھا کہ اس مدد گاروں کی خوب مرمت کروں، مگر افسوس کہ میرے پاس غصہ کرنے کے لیے بھی وقت نہ تھا۔ وہ شیرنی آدم خور تو تھی ہی، اب زخمی بھی ہو گئی تھی اور زخمی شیر انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ بہر حال میں اس کا فوری خاتمہ کرنا تھا۔ میں اپنے مدد گاروں کے ساتھ جیپ میں سوار ہوا جیپ کا رُخ جنگل کی طرف موڑ دیا۔

ایک گھنٹہ کی جدّوجہد کے بعد بھی شیرنی کا کہیں پتہ نہ چلا اور ہم گھنے جنگل میں بھٹک گئے۔ اب زخمی شیرنی کے ساتھ ساتھ ہمیں واپسی کے راستے کی بھی تلاش تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی اور ہم جنگل کی بھول بھلیّوں میں اپنی منزل کا تعیّن کر رہے تھے۔ اُمید کی کرنوں کے ساتھ ساتھ ہماری بیٹریاں بھی مدّھم ہونے لگی تھیں۔ نیم تاریکی میں وہ بڑا سا گڑھا کسی کو نظر نہ آیا جس کا احساس اس میں گرنے کے بعد ہوا۔ اس لمحاتی احساس کے بعد جلد ہی ہم تاریکی میں ڈوب گئے۔

ڈھول کی تھاپ پر ہوش آیا تو ہمارے قریب نہ کوئی گڑھا تھا نہ تباہ شدہ جیپ، آنکھوں کے سامنے بھڑکتے ہوئے شعلے نظر آ رہے تھے اور آگ کے گرد گھوم گھوم کر رقص کرنے والے جنگلی انسان۔

میرے دونوں ساتھی بھی اب ہوش میں آ چکے تھے۔ ہمیں لاتعداد وحشیوں نے نیزوں کی نوک کے درمیان قابو کیا ہوا تھا۔ سامنے چبوترے پر جنگلیوں کا سردار، سر پر چیل کے پروں کا تاج پہنے بیٹھا تھا۔ اس نے فضا میں ہاتھ بلند کیا تو ان میں سے چار جنگلی ہماری طرف بڑھے۔ انھوں نے میرے ایک مددگار کو بازو اور بالوں سے پکڑا اور ایک گھنے درخت کے نیچے لے گئے۔ ذرا ہی دیر بعد وہ بے چارہ سر کے بَل درخت پر لٹکا ہوا تھا اور نیچے بھیانک آگ اس کا جسم چاٹ رہی تھی۔ اس کی کھال اور بالوں کے جلنے سے ایک مخصوص بُو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی چربی پگھل پگھل کر کوئلوں پر گرتی تو فضا کی ناگواری میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔

اس بدنصیب کی جلی ہوئی لاش درخت سے اُتار کر سردار کے سامنے چبوترے پر رکھ دی گئی۔ خوشی سے اس کی بانچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس ظالم نے للچائی ہوئی نظر سے ہماری طرف دیکھا، تو ڈر کے مارے ہمارا لہو خشک ہونے لگا۔ ہم چیخ چیخ کر ان سے رحم کی اپیل کر رہے تھے، مگر وہ ہماری زبان سے ناواقف نظر آتے تھے۔

سردار نے دوبارہ فضا میں ہاتھ بلند کیا تو وہی چار جنگلی اس مرتبہ بھی ہماری طرف بڑھنے لگے۔
اسی لمحہ، میرے دوسرے مددگار نے ایک زوردار چیخ ماری اور زمین پر گر پڑا... ڈر کے مارے اس کا دم نکل گیا تھا... اب صرف میں زندہ تھا، مگر میرے نزدیک زندگی کے وہ چند اذیت ناک لمحے، موت سے زیادہ بدتر تھے۔ آدم خور جنگلی مجھے گھسیٹ کر آگ کے شعلوں کی طرف لے جا رہے تھے اور میری نگاہیں آسمان کی سمت اُٹھی ہوئی تھیں۔

پھر ایک معجزہ رونما ہو گیا... خدا کی رحمت جوش میں آئی اور بڑے زور سے بادل گرجے۔ موسلا دھار بارش نے آگ کے شعلوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ جنگلی غصّے سے پھنکارتے ہوئے مجھے ایک تاریک غار کے دہانے پر لے آئے اور پھر مجھے اندھیرے غار میں دھکیل کر، اوپر ایک بھاری پتھر رکھ دیا... موت کچھ دیر کو ٹل گئی تھی، مگر حالات بدستور خراب تھے۔ بارش کسی بھی لمحہ تھم سکتی تھی، جنگلی کسی بھی وقت لوٹ کر آ سکتے تھے، مگر اب مجھے آدم خوروں کی وحشت سے زیادہ اپنے رب کے کرم پر بھروسہ تھا۔ میں سجدے میں گر پڑا اور رو رو کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔ اچانک میری کمر پر پانی کی چند بوندیں آ کر گریں، جو کچھ ہی دیر بعد پانی کی تیز دھار میں تبدیل ہو گئیں۔

غار کی چھت پر گرنے والا پانی اپنا راستہ بنا رہا تھا۔ میں نے سر اُٹھایا لیکن اندھیرے نے بینائی کو ناکارہ کر دیا تھا۔ اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر میں نے وہ مقام تلاش کیا جہاں سے پانی گر رہا تھا۔ غار کی اس نرم چھت میں زندگی پوشیدہ تھی۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس جگہ کو اپنی انگلیوں سے کھودنا شروع کر دیا۔ سخت تھکن اور خوف کے احساس نے جسم کو مفلوج کر دیا تھا، لیکن زندہ رہنے کی خواہش ہر احساس پر غالب تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ چھوٹا سا شگاف ایک بڑے راستے میں تبدیل ہو گیا۔

اب میں آدم خور جنگلیوں کی قید سے آزاد، گھنے جنگل میں پوری قوت سے دوڑ رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھکڑ، طوفانی بارش اور کڑکتی بجلیوں سے بے نیاز، میں اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا...

انکل شعیب نے ابھی اتنا ہی کہا تھا، کہ بڑے زور کا دھماکہ ہوا۔ شاید کہیں بجلی گری تھی۔ انکل کی ڈراؤنی داستان نے کچھ ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا کہ بچے ڈر کر ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ چند لمحوں بعد سب کے حواس بحال ہوئے تو وہ دوبارہ انکل شعیب کے کارنامے کا اختتام سننے کے لیے ان کی طرف متوجہ ہوئے لیکن... سب نے دیکھا کہ شاید بجلی گرنے کے خوف سے انکل بے ہوش پڑے تھے۔

بنت نئی باتیں سوچنا اور خطرات سے کھیلنا انسان کی فطرت ہے۔ امریکہ کے ایک نوجوان کریگ ہاسکنگ نے اب ایک ایسا ہوائی جہاز بنایا ہے جو دونوں اطراف یعنی اوپر اور نیچے سے لینڈ کر سکتا ہے۔ جب کریگ نے ایسے جہاز کا خیال پیش کیا تھا تو لوگوں نے بڑا مذاق اُڑایا تھا۔ لوگ تو ہمیشہ نئے اور اچھوتے خیال کا مذاق ہی اُڑاتے ہیں، لیکن جب کریگ ہاسکنگ نے اپنے جہاز کی اُلٹی طرف سے لینڈنگ کا مظاہرہ پیش کیا تو وہی لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔!

"جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم"
بالکل ایسے ہی
گرمیوں کی حدّت میں ٹھنڈے اور شیریں احساس
کا
ایک حسین نام
نورس
قومی مشروب
اب عوامی پیک میں بھی دستیاب ہے
نورس
Naurus

◉ انکل، ریڈیو فوٹو کیا ہوتا ہے؟ (فیصل عدنان۔ پاک کالونی۔ کراچی۔)

(پرنس وسیم بن اشرف، میاں چنوں)

دراصل مصنوعی سیّاروں سے بھیجی جانے والی مختلف تصاویر ہوتی ہیں۔ چونکہ انھیں ریڈیائی لہروں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جاتا ہے اس لیے انھیں ریڈیو فوٹو کہتے ہیں۔ مصنوعی سیّارے سے حاصل ہونے والی ان تصاویر کو مختلف زمینی مواصلاتی اسٹیشن وصول کرتے ہیں ... پاکستان میں اسلام آباد، کراچی اور دیہہ مندرو وغیرہ میں ایسے مواصلاتی اسٹیشن موجود ہیں۔

◉ راڈار کے بارے میں بتائیے کہ یہ کس طرح کام کرتا ہے اور اسے کس نے ایجاد کیا؟

(سلطان بشیر۔ اسلام آباد۔ سیّد عاطف امام۔ نصیر آباد۔ کراچی)

۱۹۰۴ء میں ایک جرمن موجد کرسٹین ہلسمیئر نے یہ خیال پیش کیا کہ ریڈیو کی لہروں کے ذریعے کچھ فاصلے پر موجود چیزوں کو تلاش کیا جائے۔ اسی خیال کو ۱۹۲۲ء میں مارکونی نے بھی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ ۱۹۳۲ء تک امریکہ، جرمنی اور جاپان اسے بنانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ مگر برطانیہ ان سب پر سبقت لے گیا اور وہاں ۱۹۳۹ء میں پہلا راڈار بنایا گیا۔ یہ ریڈیائی لہروں کے اصول پر کام کرتا ہے۔ ریڈیائی لہریں ایک خاص فاصلے کے اندر موجود ٹھوس اشیاء کی نشاندہی اسکرین پر کر دیتی ہیں۔ عموماً یہ جنگی جہازوں اور عام ہوائی جہازوں کو اسکرین پر پیش کر دیتی ہیں جن سے ان کے راستے اور فاصلے کا تعین ہو جاتا ہے۔

◉ انکل کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آئندہ پچاس برسوں میں ہماری دنیا کتنی بدل جائے گی؟

(ثوبیہ صفی۔ مقام نامعلوم)

آپ کے جواب میں شاعرِ مشرقؒ کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

بھئی دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ انسانی عقل دنگ ہے۔ آج سے پچاس برس قبل کوئی آج کی ترقی یافتہ دنیا کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک اندازہ یہ ہے کہ اس وقت تک مزید تیز رفتار طیارے ایجاد ہو چکے ہوں گے۔ مہلک بیماریاں مثلاً کینسر، ایڈز وغیرہ کے شافی علاج دریافت ہو چکے ہوں گے۔ گھر گھر ایسے ٹیلیفون سیٹ عام ہو جائیں گے کہ آپ سامنے لگی اسکرین پر اپنے مخاطب کو دیکھ بھی سکیں اور وہ بھی آپ کو دیکھ سکے۔ خلانورد مریخ یا کسی دُور دراز سیارے پر بھی قدم رکھ چکے ہوں گے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ شاعرِ مشرق کا یہ شعر ہی مستقبل کی ایک جھلک دکھا دیتا ہے۔

◉ میزائل کیا ہے اور اس کا کام کیا ہے؟ (مبشر علی زیدی۔ انچولی۔ کراچی)

یہ ایک قسم کا راکٹ ہے جو جیٹ کے اصول پر کام کرتا ہے یعنی بڑی تیزی سے آگے کو جاتا ہے۔ یہ عموماً جنگی مقاصد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جس میں زمین سے فضا میں موجود دشمن کے طیاروں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ میزائل اپنے نشانے پر بالکل ٹھیک پہنچ کر اُسے تباہ کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے میزائل بھی ہیں جو جنگی طیاروں کے بجائے عام آبادیوں پر فائر کیے جاتے ہیں جس سے زبردست تباہی پھیل جاتی ہے۔ میزائل مختلف سائز، وزن اور قوت کے ہوتے ہیں۔

◉ آنسو گیس کیسے بنتی ہے اور اُسے زائل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟

(محمد انجم مبین۔ ڈیرہ اسماعیل خان)

عموماً ہنگامی حالات میں پولیس مظاہرہ کرنے والوں کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس کے شیل پھینکتی ہے۔ جس کے دھویں سے ناک اور آنکھوں میں بڑی جلن ہونے لگتی ہے اور آنکھ سے پانی گرنے لگتا ہے۔ اس کی بُو چبھنے والی ہوتی ہے۔ اس میں کیمیائی مادّے شامل ہوتے

ہیں۔ جن میں بینزائل برومائیڈ، برومو ایسیٹون، ایتھائل بروموایسیٹیٹ، زیلائل برومائیڈ، بروموبینزائل سائنائیڈ وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ آنسو گیس کے اثر کو زائل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ فوری طور پر منہ پر گیلا کپڑا یا پانی کے چھپاکے مارے جائیں کیونکہ اس گیس کا توڑ پانی ہے۔

◉ انکل! کیمرے کا موجد کون ہے؟ (کاشف سعادت، لطیف آباد۔ حیدر آباد

طارق رحیم۔ ناظم آباد۔ کراچی)

فرانس کے رہنے والے جوزف نیپس نے پہلی مرتبہ ۱۸۲۶ء میں ــــ کیمرے سے تصویر بنائی۔ گو کہ یہ تصویر دھندلی تھی مگر دنیا کی پہلی تصویر تھی جو کیمرے سے کھینچی گئی تھی۔ جوزف نیپس کو "بابائے فوٹوگرافی" کہا جاتا ہے۔

◉ ایگزاسٹ فین کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟ (محمد شاہد سدھو۔ لطیف آباد۔ حیدر آباد)

لفظ ایگزاسٹ EXHAUST کا مطلب ہے، کھینچ لینا، خالی کرنا۔ اس طرح ایگزاسٹ فین اس پنکھے کو کہتے ہیں جو کمرے کی ہوا کو مسلسل باہر نکالے اور اس کے بدلے تازہ ہوا کمرے میں آسکے۔ عموماً فیکٹریوں، ملوں، باورچی خانوں اور سینما ہالوں میں ایگزاسٹ فین لگے ہوتے ہیں تاکہ تازہ ہوا اندر آتی رہے اور اندر کی ہوا باہر جاسکے۔ اس پنکھے کی وجہ سے کمرے میں گھٹن کا احساس نہیں ہوتا۔ چاہے کتنے ہی افراد کیوں نہ موجود ہوں۔

◉ مریخ ہماری زمین سے کتنی دُور واقع ہے؟ (محمد انور میمن۔ شاہ پور چاکر)

مریخ کا سورج سے فاصلہ ۲۲ کروڑ ۸۷ لاکھ کلومیٹر ہے۔ جبکہ زمین سے ۸ کروڑ ۱۸ لاکھ کلومیٹر دُور واقع ہے۔ اس کا اوسط درجہ حرارت زمین سے کم ہے۔ مریخ کا ایک سال زمین کے ۶۸۷ دن کے برابر ہے۔

◉ انکل! راڈار RADAR کس چیز کا مخفف ہے؟ (حیرا تبسم علوی۔ اورنگی ٹاؤن۔ کراچی)

راڈار چار لفظوں سے مل کر بنا ہے جسے ہم تکنیکی اصطلاح میں ــــ RADIO DETECTION AND RANGING ــــ کہتے ہیں اس کا مطلب ہے ریڈیو کی لہروں سے گشت کرتے ہوئے کھوج لگانا۔

◉ پانی سے بھرے ہوئے گلاس میں اگر نمک یا چینی ڈالی جائے اور اُسے ہلا یا جائے تو یہ کہاں چلا جاتا ہے؟ (عبدالحفیظ راجپوت۔ سانگھڑ)

بات یہ ہے کہ پانی کے مالیکیولوں کے درمیان اتنی جگہ ہوتی ہے کہ اس میں نمک، چینی وغیرہ آسانی سے سما جاتے ہیں اور برتن کا پانی بھی نہیں چھلکتا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب آپ شربت بنانے کے لیے گلاس کے پانی میں چینی ملاتے ہیں تو پانی میٹھا ہو جاتا ہے۔ پانی کی مٹھاس ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ پانی کے مالیکیولوں نے چینی کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔

● کیا زمین کے پورے حصّے پر آبادی ہے یا نصف حصّے پر؟

(سیّد مقبول حسین۔ عبداللہ پور۔ جہلم)

بات یہ ہے کہ کرۂ ارض کے تین حصّے میں بڑے بڑے سمندر واقع ہیں۔ لہٰذا ان پر آبادی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خشکی کے حصّے پر سات براعظم آباد ہیں۔ یعنی ایشیا، افریقہ، یورپ، شمالی امریکہ جنوبی امریکہ اور انٹارکٹیکا۔ سوائے انٹارکٹیکا کے سارے براعظم اربوں انسانوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جو مختلف رنگ اور نسل کے ہیں اور مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ انٹارکٹیکا چونکہ لاکھوں میل کے رقبے میں برف سے ڈھکا ہوا ہے لہٰذا اس حصّے میں بھی عام انسانی آبادی نہیں ہے۔ تاہم دنیا بھر کے سائنسدان یہاں مختلف قسم کے تجربات میں لگے ہوئے ہیں۔ ان تجربات میں معدنیات کی تلاش، موسموں اور جغرافیائی تبدیلیوں پر تحقیق اور مختلف سائنسی تحقیقات شامل ہیں۔

● آتشی شیشے کو دھوپ میں رکھ کر اس کے نیچے سوکھی گھاس رکھی جائے تو کچھ دیر میں گھاس میں آگ کیوں لگ جاتی ہے؟ (اویس عزیز شیخ۔ فیصل آباد)

اس کی وجہ یہ ہے کہ آتشی شیشے سے گزر کر سورج کی روشنی ایک مخصوص مقام پر ایک جگہ جمع ہو جاتی ہے۔ پہلے وہاں حرارت پیدا ہوتی ہے اور پھر آگ لگ جاتی ہے مگر یہ عمل فوراً نہیں ہوتا بلکہ اس میں کافی دیر لگتی ہے۔ تجربے کے لیے آپ ایک سفید کاغذ پر آتشی شیشے کا عکس اس طرح ڈالیں کہ کاغذ پر روشنی کا صرف ایک نقطہ دکھائی دے۔ کوشش کریں کہ آپ کا ہاتھ نہ ہلے۔ چند سیکنڈ بعد ہی آپ دیکھیں گے کہ کاغذ اس مقام پر جہاں روشنی پڑ رہی تھی براؤن رنگ میں تبدیل ہو گا پھر اس میں سے ہلکا دھواں نکلے گا اور پھر وہ آگ پکڑے گا۔

● ہمیں دنیا کی بلند چوٹیاں اور عمارتیں کیوں نظر نہیں آتیں؟ (خالد محمود۔ سرگودھا)

اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کی زمین چپٹی ـــــ نہیں ہے بلکہ گول ہے۔ اسی وجہ سے زمین کے ایک حصّے پر بنی ہوئی بلند عمارت یا اونچی پہاڑی کی چوٹی زمین کے دوسرے حصّے میں نظر نہیں آتی اس بات کو سمجھنے کے لیے اگر آپ گلوب کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو یہ اصول آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔

گیس کی توپ

دلچسپ سائنسی کھیل

کیا آپ گھر بیٹھے گیس سے چلنے والی توپ بنانا چاہتے ہیں؟ اس کے لیے آپ کو چند چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔

۱۔ شیشے کی چھوٹی سی بوتل جس کا کارک ذرا تنگ ہو۔

۲۔ کھانے کا سوڈا۔

۳۔ سرکہ۔

۴۔ کاغذ کا ٹکڑا۔

۵۔ پانی۔

لیجیے یہ ضروری چیزیں آپ نے جمع کر لیں۔ اب آیئے توپ بنانے کا عمل شروع کیا جائے۔ سب سے پہلے تھوڑا سا سوڈا بوتل میں ڈالیے۔ کارک کو پانی میں بھگو دیں تاکہ یہ مضبوطی سے بند ہو سکے۔ اب بوتل میں تھوڑا سا سرکہ ڈالیں اور فوراً ہی کارک سے بوتل بند کر دیں۔ بوتل کو میز پر رکھ کر پیچھے ہٹ جائیں کیونکہ "توپ" چلنے ہی والی ہے اور کارک ایک زوردار آواز سے باہر نکل گیا۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ ایسا کیوں ہُوا؟ ایسا اس لیے ہُوا کہ کھانے کا سوڈا ایک کیمیکل ہے جس کا نام سوڈیم بائی کاربونیٹ ہے جب یہ سرکے سے ملا تو ان کے آپس کے ملاپ سے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس بن گئی۔ جس نے باہر نکلنے کے لیے پوری قوت سے کارک کو دھکا دیا اور اس طرح زوردار آواز بھی پیدا ہوئی اور کارک اُوپر اُچھل پڑا۔

بہت سے دھماکہ خیز مادّوں میں بھی مختلف کیمیائی اجزا اسی طرح ردِّعمل پیدا کر کے دھماکے کا سبب بنتے ہیں۔ راکٹ بھی اسی اصول پر کام کرتا ہے اور تیزی سے اُوپر سفر کرتے ہوئے خلا میں جا نکلتا ہے۔

تو پھر آپ کب بنا رہے ہیں گیس کی توپ...؟

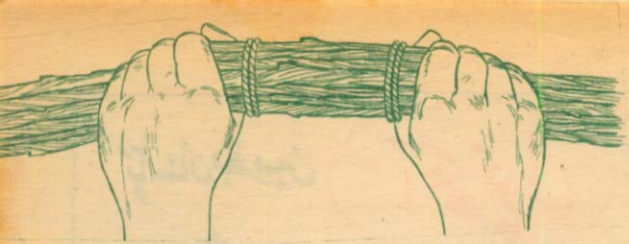

اتّحاد کی برکت

راغب مُراد آبادی

گاؤں میں ایک تھا لکڑہارا
سات بچّوں کا باپ بے چارا

مُفلسی، اُس پہ کثرتِ اولاد
تھا جگر داغ داغ، دل ناشاد

صبح، جنگل میں روز جاتا تھا
لکڑیاں کاٹ کر وہ لاتا تھا

لکڑیاں بیچ کر جب آتا تھا
گھر کا سودا سلف بھی لاتا تھا

روز کرتا تھا ایک دو پھیرے
کام اس کا یہی تھا برسوں سے

لوگ سب جانتے تھے نام اس کا
دل سے کرتے تھے اِحترام اس کا

تھی یہ برکت ہلالِ روزی کی
سب کو توفیق دے خدا ایسی

اتفاقاً وہ ہو گیا بیمار!
زندگی سے نہ تھا مگر بے زار

شکرِ پروردگار لب پر تھا
کلمہ بار بار لب پر تھا

ساتوں بیٹوں کو پاس بُلوایا
اور اُنھیں ایک راز سمجھایا

گٹھا بندھوا کے لکڑیوں کا کہا
توڑ دو، ایک ایک آ کے ذرا

گٹھا مضبوط تھا نہ جب ٹوٹا
سر ندامت سے جُھک گیا اُن کا

باپ نے پیار سے کہا، بیٹو!
کیوں ہو ناکام تم، یہ مجھ سے سنو

متّحد ہیں یہ لکڑیاں ساری
اور گٹھا بھی ہے، بہت بھاری

ایسے گٹھے کو توڑنا ہے محال
رُخ سمندر کا موڑنا ہے محال

ہے یہ سب اتّحاد کی برکت
واقعی اِتّحاد ہے دولت

کوئی غالب نہ آئے گا تم پر
یونہی تم متّحد رہو گے اگر

پاکستان بھر میں آنکھ مچولی کے نیوز ایجنٹ

علم وادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں، جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

محمد حسین برادرز۔ کراچی	فون:۔ ۷۲۳۹۵۵
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور	فون:۔ ۵۸۲۴۹
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی	فون:۔ ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد	فون:۔ ۲۵۱۰۱ / ۲۳۱۲۸
افضل نیوز ایجنسی۔ چوک یادگار۔ پشاور	فون:۔ ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱
اے ایس حامد نیوز پیپر سٹرس۔ ملتان	فون:۔ ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷
فیاض بک ڈپو۔ فیصل آباد	فون:۔ ۲۷۴۰۶
ایم ایم ٹریڈرز۔ کوئٹہ	فون:۔ ۷۵۰۰۲
ملک اینڈ سنز۔ سیالکوٹ	فون:۔ ۸۷۹۸۹
سلمان برادرز۔ نوابشاہ	فون:۔ ۲۴۱۴

سعید بک اسٹال۔ گجرات	فون:۔ ۰۴۳۳۱
پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا	فون:۔ ۶۲۹۵۱
کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور	فون:۔ ۲۹۵۷
طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم	فون:۔ ۰۵۹۴۱
چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان	فون:۔ ۲۶۲۶
اسلامی نیوز ایجنسی، وہاڑی	فون:۔ ۰۶۹۳
اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ	
اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ	
نیا مکتبۂ اردو۔ جی ٹی روڈ۔ سرائے عالمگیر	
وہاڑی نیوز ایجنسی۔ ریل بازار۔ وہاڑی	

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھیے!

سرکولیشن مینیجر۔ ماہنامہ "آنکھ مچولی" ڈی۔ ۱۱۲۔ نورس روڈ۔ سائٹ۔ کراچی ۱۶

محاورے میں کہانی

رفاقت علی

ایک دن یونہی بیٹھا خیالی پلاؤ پکا رہا تھا کہ دل نے کہا "یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کیوں بیٹھے ہو؟ کوئی ایسا تیر مار کر دکھاؤ جس سے چار لوگوں میں نام تو ہو۔ آخر کب تک مُفت کی روٹیاں توڑتے رہو گے؟" بات من کو بھا گئی۔ دماغ پر زور ڈالا تو یہ دور کی سوجھی کہ ایسا اوٹ پٹانگ مضمون لکھا جائے، جس کے ہر جُملے میں کم از کم ایک محاورے یا ضرب المثل کا روڑا اٹکا ہو۔ اگر چھپ گیا تو بس وارے نیارے ہیں پھر تو پانچوں گھی میں ہوں گی اور سر کڑاہی میں۔ اپنی ادبیت کا بھی ڈنکا بج جائے گا۔ گوہئے لہو لگا کے شہیدوں میں شامل ہونے والی بات پھر سوچ کہاں پدی اور کہاں پدی کا شوربا! ہوش کی دوا لو، میاں رفاقت! ادیبوں کی صف میں جگہ حاصل کرنا کوئی خالہ جی کا گھر تو نہیں۔ یہاں تو بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ بیٹھے بٹھائے یہ کیا خبط سر پہ سوار ہو گیا؟ لیکن فوراً ہی جرأت نے میرا دل بڑھایا اور کمر ہمّت باندھ کر لکھنے بیٹھ گیا۔ یوں حضرات! ہلدی کی گرہ لے کے پنساری بن بیٹھا۔

رات بھیگ چلی تھی۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ آدھی خلقت گھوڑے بیچ کر سوئی ہوئی تھی، لیکن مجھ سے نیند کالے کوسوں دُور تھی۔ پہاڑ سی رات کیسے کٹے؟ یہ سوچ کر میں ہوائی قلعے تعمیر کرنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن جلد ہی تھک کر چُور ہو گیا۔ کمر سیدھی کرنے کو پاؤں جو پسارے تو آنکھ لگ گئی۔ اب میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ خواب میں ایک چور کو دیکھا جسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا تھا اور اب اس کے گرد لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ ہر طرف ہا ہا کار مچی تھی۔ غُل غپاڑہ اتنا تھا کہ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ چور بے چارہ خود تو شرم سے پانی پانی ہو ہی رہا تھا۔

اس پر مستزاد تماشائیوں کی بھانت بھانت کی بولیاں۔ اس کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ ٹھیک ہے، جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ بعض منچلے تو اُسے ہاتھ تک دکھانے پر تُلے ہوئے تھے۔

میری جو شامت آئی، بیچ بچاؤ کی نیت سے اس معاملے میں کُود پڑا۔ چھوٹتے ہی سب لوگ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے۔ انھوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا اور لگے بے نقط سنانے۔ آدمی ہوتا تو آئندہ پرائے پھٹے میں ٹانگ اڑانے سے کان پکڑتا لیکن میرے سر میں تو نصیحت کا سودا سمایا ہوا تھا۔ چنانچہ اُن لوگوں کے ساتھ سر کھپانے لگا: "بھائیو! اس بے چارے کا قافیہ تنگ کیوں کیے ہوئے ہو؟ اس پر تو پہلے ہی گھڑوں پانی پڑ چکا ہے اُوپر سے تم جلی کٹی سُنا کر اس کے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو؟ یہ تو وہی بات ہوئی، مرے کو مارے شاہ مدار۔ صاحبو! عقل کے ناخن لو! کیوں غریب کے خون کے پیاسے ہو رہے ہو؟ تم لوگوں نے کبھی چوری کے مال سے گُل چھرّے نہیں اُڑائے کیا؟ جو یوں اس بے چارے کی مٹّی پلید کر رہے ہو؟ ذرا اپنے گریبان میں تو جھانک کے دیکھو۔ دیگراں را نصیحت، خود را فضیحت" بھلا نقّار خانے میں طُوطی کی آواز کون سُنتا ہے؟ میری باتوں سے کسی کے کان پر جُوں تک نہ رینگی۔ مجھے اپنی دال گلتی نظر نہ آتی تھی۔ اسی فکر میں غلطاں تھا کہ ہر چیز اُڑن چھُو ہو گئی۔ نہ وہ گھوڑا رہا، نہ وہ میدان۔ چلو خلاصی ہوئی۔

جب میں خواب سے اپنے آپ میں آیا تو یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ سورج سوا نیزے پر آچکا ہے۔ اور گرمی کا یہ عالم ہے کہ چیل بھی انڈا چھوڑ دے۔ ادھر بھُوک کے مارے میری انتڑیاں قُل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں اور پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے، جیب ٹٹولی تو وہاں پھُوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ بس اللہ کا نام تھا۔ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟ کسی دوست کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا خیال آیا مگر ساتھ ہی یہ بھی سوچا کہ اگر اس نے ٹکا سا جواب دے دیا تو اپنی بنی بنائی عزّت خاک میں مل جائے گی۔ مزید قیاس کے گھوڑے دوڑائے لیکن گتھی کسی طرح سلجھتی نظر نہ آتی تھی۔ ناچار خدا کا نام لے کر ایک طرف منہ اٹھائے چل پڑا۔

رستے میں ایک جگہ دو غنڈوں کے درمیان تُو تُو مَیں مَیں ہو رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تماشائیوں نے حاشیے چڑھا چڑھا کر بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ انجام کار نوبت ہاتھا پائی تک آ پہنچی۔ دونوں کے حامی بھی آپس میں گتھ گئے۔ اب جو سر پھٹول ہوئی ہے تو خدا کی پناہ۔ لڑنے والوں کو دن میں تارے نظر آ گئے ہوں گے۔ جوتوں میں دال بٹنے والا محاورہ اب میری سمجھ میں آیا۔ تاہم فریقین کی اینٹ سے اینٹ بجنے میں بس تھوڑی سی کسر رہ گئی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ دُودھ کا جلا چھاچھ بھی پھُونک پھُونک کر پیتا ہے۔ یا سانپ کا کاٹا رسّی سے بھی ڈرتا ہے چنانچہ

سابقہ تلخ تجربے کو یاد رکھتے ہوئے میں نے کنّی کترا کر نکل جانے ہی میں خیریت سمجھی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگا۔ کچھ دُور جا کر دم لینے کو رُکا تو چند لنگوٹیے یاروں کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ دوست بھی مجھے دیکھ کر خوشی سے پھُولے نہیں سماتے تھے۔ علیک سلیک کے بعد ہم سب گپ لڑانے لگے۔ اختر نے لہر میں آ کر ڈینگ ماری۔ "آج میں نے اپنی بندوق سے جنگلی کبوتروں کے کُشتوں کے پُشتے لگا دیے اور بھیڑیوں کی فوج کو تتر بتر کر دیا۔"

شریف نے جل بھُن کر کہا "کہنا تو یہ چاہیئے تھا کہ تم چھُپے رستم نکلے، لیکن تمہاری خودستائی کو دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنو۔"

امیر باپ کے لاڈلے بیٹے اختر نے آگ بگولہ ہو کر کہا "منہ سنبھال کر بات کرو! تم گُڑ کھانے والے ہم امیروں کے منہ آتے ہو؟ یہ منہ اور مسور کی دال؟"

شریف سے بھی نہ رہا گیا اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا "تم بھی اپنی زبان کو لگام دو۔ مجھ سے تین پانچ کی تو مزا چکھا دُوں گا۔" اس طرح ان دونوں کے درمیان تُو تکار طول کھینچتی چلی گئی۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ شرپسند گلزار کو سنہری موقع ہاتھ آ گیا۔ وہ لگا جلتی پر تیل ڈالنے۔ اس کی باتوں میں آ کر دونوں دوست گتھم گتھا ہو گئے اور بھُس میں آگ لگا، جمالو دُور کھڑی کے مصداق وہ اُن کے جھگڑے سے لُطف اندوز ہونے لگا۔ جب اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا نظر نہ آیا تو مجھے مزید صبر کا یارا نہ رہا۔ مرتا کیا نہ کرتا، میں نے دوستانہ مروّت کو بالائے طاق رکھ کر گلزار کو دو چار سنائیں اور اُسے چلتا کیا۔ خس کم جہاں پاک... وہ تو رفو چکر ہو گیا لیکن ادھر ابھی تک دونوں کے دلوں کی بھڑاس نہیں نکلی تھی۔ میں نے للّو پتّو کرتے ہوئے ان سے کہا "دوستو! آپے سے باہر کیوں ہوتے ہو؟ اتنے لال پیلے نہ ہو۔ غصّہ تھوک دو۔ ابھی کل تک تو تم دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ آپس میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ اب نہ معلوم تمہارے خون کیوں سفید ہو گئے؟... خدا لگتی تو یہ ہے کہ ابھی اپنے پچھلے کیے پر پانی پھیر دو۔ اس پر آٹھ آٹھ آنسو بہاؤ اور آئندہ کے لیے ایسی باتیں زبان پر لانے سے توبہ کرو۔" لیکن نتیجہ، ڈھاک کے تین پات۔ ان کے دیدوں کا پانی ڈھل چکا تھا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مزید دھینگا مشتی پر آ گئے اور زیادہ بڑھ بڑھ کر بولنے لگے۔ میں نے دوبارہ اونچا بولنے سے منع کرتے ہوئے کہا "غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔ بزرگوں کے اس قول کو پلّے باندھ کر رکھو۔"

جمشید ابھی تک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائے کھڑا تھا جب میری کوئی پیش نہ گئی اور معاملہ شیطان کی آنت کی طرح بڑھتا گیا تو اس کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق وہ

اب خم ٹھونک کر اور کمر کس کر میدان میں اُتر آیا۔ میں بھی یہ سوچ کر کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے، ہمشیر کے ساتھ مل کر ان دونوں شوریدہ سروں پر پل پڑا۔ انھیں وہ بے بھاؤ کی پڑیں کہ چھٹی کا دُودھ تو یاد آگیا ہوگا۔ ہم نے مار مار کر ان کا کچومر نکال دیا، لیکن وہ ہمارا بال بھی بیکا نہ کر سکے۔ ہینگ لگی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آیا۔ ہم نے ان دونوں سے اپنی طاقت کا لوہا منوالیا۔ اس دن سے ایک تو ہماری شہرت کو چار چاند لگ گئے اور دوسرے اختر اور شریف کی دانتا کلکل اور ان بن ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ گویا ایک تیر سے دو شکار ہوئے۔

اس تمام دوڑ دھوپ سے میری بھوک اور زیادہ چمک اُٹھی تھی۔ چنانچہ پیٹ پوجا کی فکر میں ناک کی سیدھ میں آگے چل دیا۔ اب ایک ایسے اُجاڑ علاقے میں پہنچا۔ جہاں بلا کی خاموشی تھی۔ سناٹے کا یہ عالم کہ پرندے کو بھی پَر مارنے کی مجال نہ تھی۔ مارے دہشت کے اوسان خطا ہوتے ہوتے رہ گئے۔ یکایک میں نے انسانی آبادی کا کچھ نشان اور کھانے کا کچھ سامان دیکھا۔ تو میری جان میں جان آئی کھانے کے سامان میں تازہ انگور دیکھے تو منہ میں پانی بھر آیا۔ ابھی میں اس پرائے مال پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے پَر تول ہی رہا تھا کہ اس کے مالک کو آتا دیکھ کر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ سچ ہے، چور کی داڑھی میں تنکا۔ میرے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ حالت یہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ چُپ ایسے تھا، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ واقعی زبان کو تالا لگا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ پیر فرتوت بلائے ناگہانی کی طرح سر پہ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر تو مجھے جان کے لالے پڑ گئے۔ شرمندگی سے تو پہلے ہی زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ اُوپر سے یہ خطرہ قیامت بن گیا۔ خیر کچھ جی کڑا کر کے اس سے آنکھیں چار کیں تو اُس نے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔ مجھے بغلیں جھانکنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ آخر جب اس طرح بھیگی بلّی بننے سے کام بنتا نظر نہ آیا تو میں اپنے بچاؤ کی خاطر اُلٹی سیدھی ہانکنے لگا۔ خُدا جانے اس کے پلّے کچھ پڑا یا نہیں، تاہم اُس نے مجھ سے زیادہ مغز ماری نامناسب نہ سمجھا اور میری جان بخشی کر چل پڑا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔ میں نے سوچا اور اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ اُسی وقت اُلٹے پاؤں واپس ہو جاؤں اور جہاں سینگ سمائیں چل دُوں۔ اور آئندہ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کروں۔ صرف بے پَر کی اُڑانے سے کام نہیں چل سکتا۔

تو حضرات خُدا خُدا کر کے اس طرح تقریباً دو سو محاورات اور ضرب الامثال کی بیل منڈھے چڑھی۔ ویسے تو اس میں بھرمار محاوروں ہی کی ہے، ضرب الامثال تو بس آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔!

تب اور اب

طریقۂ علاج کا تاریخی جائزہ

سیّد خورشید عالم

اُس آدمی کی طبیعت کئی روز سے خراب تھی۔ بدن بُری طرح تپ رہا تھا اور اُسے سخت سردی بھی لگ رہی تھی۔ اُس کے عزیز اُسے ایک شخص کے پاس لے گئے جس نے اُنھیں بتایا کہ اس آدمی کے جسم میں کوئی بُری روح گھُس گئی ہے جسے نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے جسم پر زور زور سے ضربیں لگائی جائیں۔ اس طرح وہ بُری روح جسم سے نکل جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مگر چند گھنٹوں بعد بُری روح تو کیا نکلتی اُس آدمی کی اپنی روح خود ہی پرواز کر گئی۔ یہ تھا قدیم زمانے میں بیماری سے متعلق تصوّر کہ انسان کے جسم میں بُری روح کے داخل ہونے سے انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ مگر پھر انسان نے بیماریوں کے بارے میں سائنسی انداز میں سوچنا شروع کیا۔ بیماریوں کے اسباب معلوم کیے۔ ان کے علاج کی تدابیر اختیار کیں۔ اس طرح سب سے پہلے یونانیوں نے مختلف جڑی بُوٹیوں سے دوا بنائی اور اسے ایک باقاعدہ علم کی شکل دی۔ یونان کے ایک ڈاکٹر گیلن کا قصّہ بھی بڑا دلچسپ ہے جس نے انسانی جسم کے عُضلات اور اعصاب کے بارے میں مختلف نظریات پیش کیے۔ اس نے انسانی نظامِ ہاضمہ کو سمجھنے میں غلطی کی اور یہ سمجھ بیٹھا کہ خوراک ہضم ہونے کے لیے جگر میں جاتی ہے۔ جہاں سے وہ خون میں تبدیل ہو کر جسم میں شامل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ آج ایسی بات کرنے والے کو یقیناً احمق ہی کہا جائے گا۔ کیوں کہ خوراک ہضم ہونے کے لیے معدے میں جاتی ہے نہ کہ جگر میں۔ ڈاکٹر گیلن کے مرنے کے چار سو سال بعد تک طب کے شعبے میں نیا نظریہ پیش نہ کیا جا سکا اور لوگ یہی سمجھتے رہے کہ خوراک ہضم ہونے کے لیے جگر میں جاتی ہے اور پھر جزوِ بدن بنتی ہے۔ طب اور جرّاحی کے میدان میں مسلمانوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ سنہرے الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ الرازی، بُوعلی سینا انھی میں سے ایک ہیں۔ الرازی نویں صدی (۸۶۵ء) عیسوی کے بہت بڑے طبیب تھے۔ انھوں نے بیماریوں کے علاج اور جرّاحی کے آلات ایجاد کیے اور مختلف بیماریوں کے بارے میں کئی کتابیں لکھیں۔ بُوعلی سینا دسویں صدی

قدیم اور جدید طریقے سے کیے جانے والے آپریشن کے دو مناظر

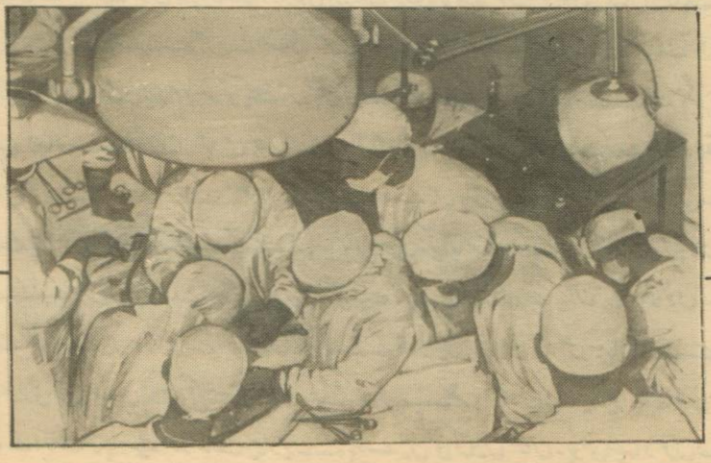

عیسوی کے نامور طبیب تھے۔ جنھوں نے ایک روایت کے مطابق ۹۹ کتابیں لکھیں۔ یہ ساری کتابیں طب اور دواؤں کے علم سے متعلق تھیں۔ مسلمانوں کی وجہ سے یورپ میں بھی ترقی کی راہیں کھلنے لگیں۔ سولہویں صدی تک عموماً چھوٹے موٹے زخموں کے آپریشن ہونے لگے۔ اور ڈاکٹر صاحبان بھی انسانی جسم کے بارے میں خاصی حد تک جاننے لگے تھے مگر جسم کے درجۂ حرارت کو ناپنے کا کوئی آلہ دریافت نہ ہونے کی بنا پر انھیں دقت بھی ہوتی تھی۔ لیکن ۱۵۹۵ء میں گلیلیو نے تھرمامیٹر بنا کر طب کے شعبے کو مزید ترقی بخشی۔ اب بخار میں تپتے ہوئے مریض کا صحیح درجۂ حرارت ناپا جا سکتا تھا۔ اسی زمانے میں نبض کی صحیح رفتار بھی دریافت کر لی گئی۔ ۱۶۲۸ء میں ایک انگریز ڈاکٹر ولیم ہاروے نے دورانِ خون سے متعلق اپنی ایک کتاب شائع کی۔ ہاروے اس زمانے میں جیمز اوّل اور بعد میں چارلس اوّل کا شاہی ڈاکٹر تھا۔ اس نے گیلن کے نظریے کو بھی غلط ثابت کیا اور بتایا کہ خوراک ہضم ہونے کے لیے معدے میں جاتی ہے۔ اس وقت تک ڈاکٹر حضرات جراثیم سے واقف نہیں تھے۔ جراثیم کی دریافت خوردبین کے ذریعے ہوئی۔ جسے سترہویں صدی عیسوی میں ہالینڈ کے اینٹن وان لیون ہُک نے ایجاد کیا۔ اس نے اپنی بنائی ہوئی خوردبین سے بیکٹیریا کا مشاہدہ بھی کیا۔

اٹھارہویں صدی تک علمِ صحت یعنی ہائیجین کی اہمیت لوگوں پر واضح ہو گئی۔ اسی زمانے میں لوئی پاسچر نے متعدی بیماریوں سے بچاؤ کے مختلف ٹیکے دریافت کیے۔

ان سب باتوں کے باوجود ایک بات بڑی تکلیف دہ تھی وہ یہ کہ کسی مریض کا اگر آپریشن کیا جاتا تو وہ بُری طرح چیختا چلّاتا تھا اور آپریشن کے دوران کئی آدمی اُسے پکڑے رہتے۔ مگر ۱۸۴۷ء میں جیمز ینگ سمپسن نے کلوروفارم استعمال کر کے آپریشن انتہائی آسان کر دیا۔ اب اس کے ذریعے مریض کو بے ہوش کر کے، تاکہ اُسے تکلیف محسوس نہ ہو آپریشن ہونے لگے۔ مگر پھر بھی ایک اہم مسئلہ باقی تھا۔ آپریشن کے دوران آلاتِ جرّاحی اور میز کی ٹھیک طرح صفائی نہ ہونے کی بنا پر اکثر مریض جراثیم کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے تھے۔ مریضوں کو اس فسادِ خون یا سیپٹک سے بچانے کے لیے جوزف لسٹر نے اینٹی سیپٹک تیار کیا۔ جس سے آپریشن اور اس کے بعد بھی مریض کو کسی قسم کا خطرہ نہ رہا۔

بیسویں صدی جس میں ہم زندہ ہیں بلاشک و شبہ دواؤں اور صحتِ عامہ کی ترقی کا دور ہے۔ ۱۹۲۸ء میں الیگزینڈر فلیمنگ نے بیکٹیریا ختم کرنے کے لیے ایک دوا تیار کی جسے پینسلین کا نام دیا گیا۔ اس اہم دوا کو اینٹی بایوٹک بھی کہا جاتا ہے۔ پھر ۱۹۴۵ء کے بعد ان اینٹی بایوٹک دواؤں کا استعمال عام ہوتا گیا۔ پھر ایسی دوائیں بھی بننے لگیں جو درد کو فوری طور پر ختم کر دیتی ہیں۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ طب کے شعبے میں اتنی ترقی کے باوجود اکثر لوگ یہ شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ آئے دن نئی بیماریوں نے ہمیں پریشان کر رکھا ہے" یا "فلاں بیماری نے تو موت کی شرح میں اضافہ کر دیا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ ایسی بات نہیں۔ آج ریڈیو ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے ہمیں دُنیا میں بیماری یا کسی بھی وجہ سے ہلاک ہونے والوں کے بارے میں فوراً معلوم ہو جاتا ہے۔ پہلے کے زمانے میں اگر کسی گاؤں میں ہیضے سے چاہے کتنے ہی افراد کیوں نہ مر جاتے دوسرے گاؤں یا شہر میں کسی کو اس کا پتا بھی نہ چلتا۔

ڈاکٹروں کے مطابق اچھی غذا اور صاف ستھرا ماحول ہی انسان کو مختلف بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اسی سے انسان کی عمر میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ امریکہ اور یورپ میں لوگوں کی اوسط عمر زیادہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ وہ لوگ غذا اور ماحول کو صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بیماریاں پہلے بھی موجود تھیں اور آج بھی ہیں۔ پہلے ان کا پتا اس لیے نہیں چلتا تھا کیونکہ اتنی تحقیق نہیں ہوئی تھی۔ آج اس تحقیق کی بدولت ان مُہلک بیماریوں کا علاج بھی ممکن ہو گیا ہے جن کا تصوّر بھی انسان کے لیے تکلیف دہ تھا۔

۱۰۴ صفحات پر مشتمل

سچّی قرآنی کہانیوں کا

خوبصورت مجموعہ

قرآن کی یہ سچّی کہانیاں بچّوں کی تربیت میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتی ہیں

اس کے حصول کے لیے ۱۰ روپے کا منی آرڈر ارسال کر دیجیے۔

خاکِ وطن سے سرزمینِ حرم تک

معلومات بھی ـــــ رہنمائی بھی

حجّاج اور زائرین کے لیے نادر تحفہ!

۲۰۳ صفحات

یہ کتاب آپ صرف ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کر کے حاصل کر سکتے ہیں

Montgomery

The Height of Delight!

OUR CHALLENGE

INCOMPARABLE DRY-CLEANING

We dry-clean on the most innovative system, BOWE COMET P200, World's No. 1 Plant with the best chemicals imported from France to give your clothes the finish you've never seen before. Backed by unbeatable 40 years' experience.

SEE ALSO THE PRICE DIFFERENCE:

	Snowhite	The Cleaners	5- Star Hotels
Lady Shalwar Suit	18/—	30/—	34—50/—
Sari	15/—	25/—	30—40/—
Gent Suit	31/—	40/—	42—60/—
Trousers	11/—	15/—	17—25/—
Shirt	6/—	10/—	14—25/—
Shalwar Suit	11/—	20/—	28—50/—

Member IFI International Fabricare Institute

Member ASCR Association of Specialists in Cleaning and Restoration U. S. A.

Your Economy Through our Technology.

Visit our Clifton Branch.
(Behind Maxim's Restaurant)

Snowhite
DRY CLEANING INDUSTRIES
Karachi 511711 Rawalpindi 67988
The country's largest network of cleaning services

Flowline

ٹارزن کراچی میں

طاہر مسعود

ٹارزن کی آنکھ سمندر کے کنارے کُھلی۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا۔ ساحل پر کھڑے لوگ اُسے حیرت سے دیکھتے رہے۔ ٹارزن نے اُن سے اپنا تعارف کرایا۔ کچھ دیر میں وہ آپس میں بے تکلّف ہو گئے۔ اُن لوگوں نے ٹارزن کو کھانے کی پیشکش کی تو وہ اُن کا سارا کھانا کھا گیا۔ پھر وہ باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران میں ایک انسپکٹر ٹارزن کے پاس آکر بولا: "آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے" انسپکٹر کی اس بات پر وہاں موجود لوگوں اور ٹارزن نے بحث کرنا چاہی، مگر انسپکٹر نے بغیر پاسپورٹ اور ویزے کے، غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہونے کے جرم میں ٹارزن کو گرفتار کر لیا اور ہتھکڑی پہنا کر پولیس اسٹیشن لے گیا۔ انسپکٹر ٹارزن کو اپنے کمرے میں بٹھا کر قانونی کارروائی شروع کرنے ہی والا تھا کہ اچانک کمرے میں آٹھ دس افراد گھس آئے جب انسپکٹر کو پتا چلا کہ وہ اخبارات کے نمائندے ہیں تو وہ بوکھلا گیا مگر ٹارزن مسکرا رہا تھا۔

اب بعد کے واقعات پڑھیے!

ٹارزن مُسکراتا رہا اور پریس رپورٹرز کمرے میں پڑی کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ انسپکٹر پریس رپورٹرز سے مرعوب نظر آ رہا تھا اور صحیح بات یہ ہے کہ رپورٹرز نے انسپکٹر کی طرف توجہ بھی نہیں کی وہ سب کے سب ٹکٹکی باندھے ٹارزن کو دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ سفید بالوں والے سینیئر صحافی نے کھنکار کر اس سکوت کو توڑا "مسٹر ٹارزن!" اس نے کہا "یہ ہماری صحافتی زندگی کا حیرت انگیز واقعہ ہے کہ ہم آپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ صحافی کی حیثیت سے ہم نے اب تک ہر طرح کے لوگوں سے ملاقاتیں کی ہیں۔ وزیر، سفیر، ممبرانِ اسمبلی، سیاستدان، عالم، پہلوان، جاگیردار، کھلاڑی... حتیٰ کہ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والے، بازی گر، مسخرے، فنکار، ان میں سبھی شامل ہیں، لیکن ان میں سے کسی سے مل کر ہمیں اتنی حیرت اور مسرت نہیں ہوئی جتنی آپ سے مل کر ہو رہی ہے۔ حالانکہ یہ ہم ہی ہیں جو برسہا برس سے آپ کی کارٹون کہانیاں اپنے اخبارات میں چھاپ رہے ہیں اور ہم اپنی حماقت سے اب تک یہ سمجھتے رہے کہ آپ کا وجود محض ایک فرضی کردار ہے۔" ٹارزن اس لمبی تمہید سے اُکتا گیا۔ اس نے بات کاٹ کر کہا "شکریہ، لیکن پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

... انسپکٹر نے دیکھا کہ ٹارزن کے اس خشک رویے سے صحافیوں کے چہرے اُتر گئے۔ اس نے فوراً ٹارزن کو ٹہوکا دیا۔ "ٹارزن! یہ اخباری نمائندے ہیں۔ ان سے احتیاط سے گفتگو کرنی چاہیے۔"

"جی ہاں تو آپ کیا فرما رہے تھے؟" ٹارزن نے سنبھل کر نرمی سے کہا۔

"ٹارزن! آپ کراچی میں کیا محسوس کر رہے ہیں؟" ایک دوسرے صحافی نے سوال کیا۔

"گرمی... میں سخت گرمی محسوس کر رہا ہوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں، پسینے سے میرا بُرا حال ہو گیا ہے۔"

"پسینہ تو خیر ہم سب کو آ رہا ہے۔ آپ یہ فرمائیے کہ جنگل کی زندگی اور شہر کی زندگی میں آپ نے کیا فرق پایا ہے؟" ایک پستہ قامت صحافی نے پوچھا۔

"جنگل میں اتنی گرمی نہیں پڑتی۔" ٹارزن نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ سے کس نے کہا؟" سفید بالوں والے صحافی نے مداخلت کی۔ "چھانگا مانگا میں موسم بے انتہا گرم ہوتا ہے۔"

"یہ کون سی جگہ ہے؟" ٹارزن نے پوچھا۔

"یہ جنگل ہے، لاہور کے قریب۔"

"چھانگا اور مانگا... یہ تو دو بھائیوں کے نام معلوم ہو رہے ہیں۔ کیا یہ دو جنگل ہیں؟"

"جی نہیں... یہ ایک ہی جنگل ہے۔"

"تو پھر یہ جنگل نہیں، جنگل کا بچہ ہوگا۔" ٹارزن بے نیازی سے بولا۔

"جنگل کا بچہ..." ایک جواں سال صحافی نے جس کے کان خرگوش کی طرح بڑے بڑے تھے، حیرت سے کہا "ٹارزن! کیا آپ کو گرمی زیادہ لگ رہی ہے؟"

"آپ کیا غضب کر رہے ہیں۔" انسپکٹر ٹارزن کے کان میں منمنایا۔ "یہ ساری باتیں کل کے اخبارات میں شائع ہوں گی۔"

یہ سُن کر ٹارزن نے پہلو بدلا۔ "شاید آپ صحیح کہہ رہے ہوں۔ آپ پریس رپورٹرز ہیں۔ جنگل کے متعلق آپ لوگوں کی معلومات یقیناً مجھ سے زیادہ ہوں گی۔"

"ٹارزن! آپ کا آئندہ کیا پروگرام ہے؟"

"پروگرام شہر کے لوگ بناتے ہیں۔ ٹارزن کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے۔"

یکایک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ انسپکٹر نے ریسیور اُٹھایا۔ "ہیلو" کہنے کے بعد اس کا لہجہ مؤدبانہ ہو گیا۔ بلکہ وہ تقریباً کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ریسیور کریڈل پر رکھ کر اُس نے پُرمسرت لہجے میں بتایا کہ کمشنر صاحب

کو ٹارزن کی آمد کی اطلاع مل چکی ہے اور انھوں نے مطلع کیا ہے کہ ٹارزن اب سرکاری مہمان ہیں۔

"ٹارزن تو اس وقت بھی سرکاری مہمان خانے ہی میں ہیں۔" کسی صحافی نے پیچھے سے آواز لگائی اور ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ انسپکٹر بوکھلا کر میز کی دراز کھولنے اور بند کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ٹارزن کو سرکاری کوٹھی پر لے جانے کے لیے گاڑی آگئی۔

ٹارزن جب سرکاری کوٹھی پر پہنچا تو وہاں استقبال کے لیے شہر کے میئر، ڈپٹی میئر، کمشنر اور دیگر اعلیٰ سرکاری افسران موجود تھے۔ ٹارزن نے سب سے ہاتھ ملایا۔ میئر نے ٹارزن کو خوش آمدید کہا اور ساتھ ہی اُمید ظاہر کی وہ کراچی میں زیادہ سے زیادہ عرصہ تک قیام کریں گے اور یہ کہ ان کی آمد کراچی کے شہریوں کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ رسمی بات چیت کے بعد ٹارزن کو اس کے کمرے تک پہنچا دیا گیا۔ کمرہ ایئر کنڈیشنڈ تھا، جس میں ایک بستر، چند صوفے، ایک ریفریجریٹر اور ریفریجریٹر میں کھانے پینے کا سامان بھرا ہوا تھا۔ بستر کے ساتھ سائیڈ ٹیبل پر ٹیلی فون دھرا تھا۔ ٹارزن نے کمرے میں پہنچنے کے بعد کچھ تھکن سی محسوس کی، وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ وہ سونا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی جسامت کے لحاظ سے بستر بے حد مختصر تھا۔ اگر وہ لیٹنے کی کوشش بھی کرتا تو مشکل سے اس کا آدھا دھڑ ہی بستر میں سما سکتا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ ٹارزن نے گڑبڑا کر ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ پھر اُسے یاد آیا کہ پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر نے کس طرح فون پر گفتگو کی تھی۔ اس نے جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیا۔ اور کان سے لگایا لیکن دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آئی۔ آواز آتی بھی کیسے اس نے ریسیور جو اُلٹی طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ تنگ آکر اُس نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اور سوٹ میں ملبوس ایک اسمارٹ آدمی کمرے میں داخل ہوا۔

"خوش آمدید مسٹر ٹارزن!"

"خوش آمدید"۔

"میرا نام ماسٹر غیاث الدین ہے۔ میں سرکاری ٹیلر ہوں اور آپ کا ناپ لینے آیا ہوں۔" آنے والے نے اپنا تعارف کرایا۔

"کیا آپ میری گردن کا ناپ لینے آئے ہیں؟" ٹارزن نے سادگی سے پوچھا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" غیاث الدین نے جھینپ کر کہا۔ "بات یہ ہے کہ اب آپ سرکاری مہمان ہیں اور آپ کو آئندہ چند دنوں میں مختلف تقریبات میں شرکت کرنی ہے اور اس کے لیے آپ کا لباس..." اُس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سر جھکا لیا۔

"کیوں ؟ میرے لباس کو کیا ہُوا" ٹارزن نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کے لباس کو کچھ بھی نہیں ہُوا" سرکاری ٹیلر نے جلدی سے کہا "کیونکہ آپ کے پاس تو کوئی لباس ہی نہیں ہے"

"تو آپ چاہتے کیا ہیں ؟"

"دیکھئے سادہ سی بات ہے۔ چونکہ آپ براہِ راست جنگل سے تشریف لا رہے ہیں اس لیے آپ نے صرف جانگیہ پہن رکھا ہے، لیکن شہر میں صرف جانگیہ پہن کر گھومتے پھرنا سخت نامناسب بات ہے"

"آپ کی بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آگئی ہے" ٹارزن نے کہا "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں نے آج تک جانگیہ کے سوا کچھ پہنا ہی نہیں"

"ہا ہا ہا" ماسٹر غیاث الدّین نے قہقہہ لگایا "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ جب میں چھوٹا تھا تو میں خود جانگیہ پہنتا تھا۔ لباس پہننے کا تعلق تو صرف عادت سے ہے۔ ممکن ہے شروع شروع میں آپ کو شلوار قمیض یا سوٹ میں عجیب سا محسوس ہو، لیکن آپ آہستہ آہستہ اس کے عادی ہو جائیں گے"

"جیسی آپ کی مرضی" ٹارزن، جس نے آج تک کسی سے شکست نہیں کھائی تھی۔ ماسٹر غیاث الدین کے دلائل کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

ماسٹر غیاث الدّین نے بڑی مشکلوں سے میز کے اوپر کرسی رکھ کر اور پھر کرسی پر کھڑے ہو کر ٹارزن کے جسم کی پیمائش کی۔ البتہ جب وہ ٹارزن کی کمر اور پیٹ کا ناپ لے رہا تھا تو ٹارزن ہنس ہنس کر بے حال ہو گیا۔ ماسٹر غیاث الدّین پہلے تو پریشان ہو گیا۔ اس کے پوچھنے پر ٹارزن نے بتایا کہ اُسے گُدگُدی محسوس ہو رہی ہے۔ سرکاری ٹیلر کے رخصت ہونے کے بعد ٹارزن قالین پر ہی دراز ہو گیا اور چند ہی لمحوں میں نیند نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

ٹارزن کو سرکاری کوٹھی میں دو دن تک تقریباً قید رہنا پڑا۔ اس کا لباس ابھی تک تیار نہیں ہُوا تھا۔ اور جانگیہ میں اُسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ دو دن اس کے لیے بہت کڑے تھے۔ اس کی دلچسپی کی چیز تو بس اخبارات تھے جس میں اس کی بڑی بڑی رنگین تصویریں شائع ہوئی تھیں۔ چونکہ وہ پڑھنا نہیں جانتا تھا اس لیے پروٹوکول آفیسر نے اُسے اخبارات میں اس کے متعلق چھپنے والی خبریں اور فیچرز پڑھ کر سُنائے۔ بعض اخبارات نے تو ٹارزن پر خصوصی ضمیمے شائع کیے تھے۔ ان ضمیموں میں اس کی شاندار تصویریں، کارٹون کہانیاں، پولیس اسٹیشن پر صحافیوں سے بات چیت کی تفصیلات، سبھی کچھ درج تھیں۔ شام کے اخبارات نے تو ٹارزن کے متعلق خوب نمک مرچ لگا کر خبریں شائع کی تھیں۔ اخبارات دیکھنے کے بعد ٹارزن کو اپنے اندر ایک نئی قوّت کا احساس ہُوا۔ اس قوّت

میں بڑا نشہ تھا۔ جس سے وہ پہلی بار آشنا ہوا تھا۔ اُسے ایسا لگا کہ اس کی گردن ذرا سی اکڑ گئی ہے۔ اس نے میز پر رکھا ہوا گلاس ہاتھ مار کر زمین پر گرا دیا اور گرج کر کہا: "کمشنر کہاں ہے؟"

پروٹوکول آفیسر گھبرا گیا: "مسٹر ٹارزن... ہوش میں آیئے۔ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

ٹارزن نے چیخ کر کہا "میں دو دن سے یہاں مکھیاں مار رہا ہوں۔ میرا لباس کہاں ہے؟"

اسی دن ٹارزن کا نیا گرے رنگ کا سوٹ سِل سِلا کر آ گیا۔ جسے دو آدمیوں نے مل کر ٹارزن کو پہنایا۔ سوٹ میں تو ٹارزن کی شخصیت ہی بدل گئی۔ اب وہ انگریزی فلموں کا کوئی کردار دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کمرے کے فرش پر وقار سے چلنے کی مشق کرتا رہا۔ پروٹوکول آفیسر اُسے سرکاری تقریبات میں شرکت کے آداب بتاتا رہا۔ دفعتاً ٹارزن ٹھٹکا اس نے ٹائی کی ناٹ کو نیچے کھینچا۔

"میری سانس اُلجھ رہی ہے" اس نے بے بسی سے کہا۔

پروٹوکول آفیسر اُسے سمجھانے لگا "فکر کی کوئی بات نہیں آپ تھوڑے دنوں میں اس کے عادی ہو جائیں گے۔ ٹائی پہننے سے شروع میں آدمی کی سانس اُلجھتی ہے، لیکن ٹائی نہ لگانے سے دوسروں کی سانس اُلجھنے لگتی ہے۔ اور وہ عزت نہیں کرتے۔ ہمارے ہاں ٹائی پہننے والوں کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ اس لیے بعض لوگ تو سخت چلچلاتی گرمی میں بھی ٹائی لگاتے ہیں" ٹارزن چُپ چاپ خلاؤں میں گھورتا رہا اُسے جنگل کی زندگی بے انتہا یاد آنے لگی، جہاں اُسے ایسے مسائل کا کبھی سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد اُسے میئر کے استقبالیے میں شرکت کے لیے روانہ ہونا تھا پروٹوکول آفیسر نے اسے استقبالیے کے پروگرام اور اس کی نزاکتوں سے خوب اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔

باغِ جناح میں معززینِ شہر کا زبردست اجتماع تھا۔ ٹارزن کو دیکھنے کے شوق میں لوگ وقت سے پہلے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ اسٹیج پر ٹارزن کو میئر کے پہلو میں جگہ دی گئی تھی۔ میئر نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں ٹارزن کی شان میں زوردار تقریر کی۔ انھوں نے کہا۔

"جیسا کہ آپ کو معلوم ہے جنگلوں میں وہ مسائل نہیں ہوتے جو شہروں میں ہوتے ہیں۔ نہ وہاں سڑکوں کی تعمیر کا مسئلہ ہوتا ہے، نہ ٹریفک کے ہجوم کا، نہ وہاں گٹر اُبلتے ہیں اور نہ ہی گٹر کے ڈھکن چُرائے جاتے ہیں۔ جنگل میں کچی آبادی کا بھی مسئلہ نہیں ہوتا اور نہ ہی وہاں پائپ لائنیں پھٹتی ہیں۔ جنگل میں الیکشن بھی نہیں ہوتے۔ جنگل کا اپنا قانون ہوتا ہے جسے قانونِ فطرت کہتے ہیں... اور فطرت جب اپنا معجزہ دکھاتی ہے تو ٹارزن کو پیدا کرتی ہے۔"

(تالیاں) "عام خیال ہے کہ جنگل میں جنگلی بستے ہیں۔ ٹارزن بھی جنگل سے تشریف لائے ہیں۔ اور کیوں تشریف لائے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم اور نہ ہی ہم جاننا چاہتے ہیں۔ یہ ٹارزن کا اپنا معاملہ ہے۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ٹارزن عظیم طاقتور انسان ہیں۔ ان کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ یہ اپنی طاقت کا کبھی جا و بے جا استعمال نہیں کرتے۔ بے شک مسٹر ٹارزن ایک شریف آدمی ہیں۔" (تالیاں) "جتنی طاقت مسٹر ٹارزن کے پاس ہے اگر اس کی نصف طاقت بھی ہم میں سے کسی کے پاس ہوتی تو اس کے پیر زمین پر نہیں ٹکتے۔ اور وہ سارے شہر کو سر پر اُٹھائے پھرتا اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ہمیں ٹارزن سے ابھی بہت کچھ سیکھنا ہے اور ٹارزن کے حوالے سے اس سوال پر غور کرنا ہے کہ وحشی انسان تو آسانی سے مہذب ہو جاتے ہیں لیکن مہذب انسان جنگلیوں اور وحشیوں کی طرح آپس میں لڑنے سے باز کیوں نہیں آتے۔" (تالیاں۔ تالیاں۔ تالیاں)

ٹارزن پہلے پہل تو ان تالیوں کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔ میئر کی تقریر پر جب پہلی بار تالیاں بجائی گئیں تو اس نے ڈپٹی میئر سے سرگوشی میں پوچھا تھا کہ "یہ لوگ کیا کر رہے ہیں"؟

ڈپٹی میئر نے بتایا کہ "یہ سب تالیاں بجا رہے ہیں اور تالیاں اُس وقت بجائی جاتی ہیں جب تقریر میں کوئی عمدہ نکتہ بیان کیا جائے۔ تالیاں بجانے کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ سُننے والوں کو مقرر کی تقریر پسند آ رہی ہے"۔

ٹارزن نے سوال کیا کہ "اگر سُننے والوں کو کسی کی تقریر پسند نہ آئے تو وہ کیا کرتے ہیں"؟

ڈپٹی میئر نے جواب دیا کہ "اس صورت میں وہ چُپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں اور تقریر ختم ہونے کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں"۔

میئر کی تقریر کے بعد ٹارزن کو دعوت خطاب دی گئی۔ ٹارزن تالیوں کے شور میں روسٹرم پر پہنچا۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں پر نگاہ ڈالی جو اس کی طرف نہایت تجسس اور اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ کچھ بولے لیکن اُسے ایسا لگا جیسے حلق میں کانٹے سے پڑ گئے ہیں، اُسے اپنی ٹانگیں لڑکھڑاتی ہوئی محسوس ہوئیں، ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئیں، نظروں کے سامنے ننھی ننھی موی شمعیں جلنے لگیں۔ اُسے ساکت و خاموش کھڑے دیکھ کر حاضرین میں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ میئر نے پروٹوکول آفیسر کو گھورا۔ سامنے کی کرسیوں پر سے ایک شخص اُٹھا، شاید وہ نروس ٹارزن کو نفسیاتی طور پر سہارا دینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا رُخ حاضرین کی طرف کیا اور پوری قوت سے چیخا۔

"جنگل کا بادشاہ ٹارزن"۔

حاضرین نے فلک شگاف نعرہ لگایا "زندہ باد"

"ہمارا بھائی تمھارا بھائی" وہ پھر دھاڑا۔

"ٹارزن بھائی، ٹارزن بھائی" حاضرین نے پوری قوت سے اس کا ساتھ دیا۔

اس نعرے بازی سے ٹارزن ہراساں ہوگیا۔ اس نے نعرے زندگی میں پہلی بار سُنے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور یہ لوگ کیوں چیخ رہے ہیں۔ اسے جنگل کی زندگی میں فطرت نے یہی تربیت دی تھی کہ چیخ و پکار اور ہنگامے کا ایک ہی مفہوم ہوتا ہے... خطرہ...

اس کی چھٹی حس ایک دم بیدار ہوئی۔ اُس نے خطرے کی بُو سونگھ کر چھلانگ لگائی اور گیٹ کی طرف بھاگا۔ اُسے پکڑنے کے لیے منتظمین اس کے پیچھے پیچھے بھاگے۔ میئر اور ڈپٹی میئر بھی دوڑے۔ حاضرین میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔ وہ تو اچھا ہُوا کہ کسی نے عقل مندی کی اور ٹارزن کو بھاگتے دیکھ کر گیٹ باہر سے بند کر دیا۔ ٹارزن نے گیٹ بند پا کر قریب پڑی کرسی اُٹھالی اور خونخوار لہجے میں بولا۔

"خبردار اگر کسی نے قریب آنے کی کوشش کی" اتنی دیر میں میئر قریب آچکا تھا۔ اُس نے نرمی سے مُسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹارزن! تمھیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمھارے دوست ہیں، کرسی نیچے پھینک دو"

ٹارزن کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔ میئر نے کہا۔

"لوگ کیا سوچیں گے ٹارزن۔ یہ بڑی غیر مہذبانہ بات ہے۔ لوگ تمھیں سُننا چاہتے ہیں۔ وہ تمھارے دشمن نہیں ہیں"۔ میئر سمجھ چکا تھا کہ ٹارزن نعروں سے خوف زدہ ہے۔ ٹارزن نے آہستگی سے کرسی نیچے رکھ دی۔ لوگ اُسے گھیر گھار کر اسٹیج کی طرف لے کر چلے۔ اب انھوں نے نعرے لگانے بند کر دیے تھے۔ میئر نے مائیک پہ آکر لوگوں کو پُرامن رہنے کی تلقین کی۔ ٹارزن کو پھر سے تقریر کی دعوت دی گئی۔ ٹارزن کی وحشت اب کم ہو چکی تھی۔ وہ پشیمان پشیمان سا تھا۔ اس نے مائیک سنبھالا۔

"مجھے تقریر نہیں آتی" اس نے کہا "لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ سب کا دوست ہوں۔ میں دوستوں کا دوست ہوں" (تالیاں) "مجھے کراچی پسند آیا ہے۔ مجھے یہاں کے لوگ بھی پسند آئے ہیں، لیکن یہاں گاڑیاں بہت ہیں، عمارتیں بھی بہت ہیں، شور اور ہنگامہ بھی بہت ہے اور مجھے یہ چیزیں پسند نہیں ہیں۔ یہاں اکثریت کی صحت اچھی نہیں ہے۔ شاید لوگ ورزش نہیں کرتے نہ ہی اپنی صحت کا خیال رکھتے ہیں۔ مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس شہر میں میدان نہیں ہیں، باغات نہیں ہیں۔ جھیلیں نہیں ہیں۔ یہاں پینے کے لیے صاف پانی بھی نہیں ملتا۔ جو پانی میں نے پیا اس سے میرے پیٹ میں تکلیف ہو گئی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس شہر میں سال بھر

بھی رہ گیا تو میری اپنی صحت تباہ ہو جائے گی۔" ٹارزن بولتا گیا اور جیسے جیسے وہ بولتا گیا اس میں اعتماد پیدا ہوتا گیا۔ اس نے شہریوں کو مشورہ دیا کہ وہ باقاعدگی سے ورزش کریں۔ روزانہ صبح دو میل تک دوڑ لگائیں اور اپنی صحت کو اہمیت دیں۔ ٹارزن کی تقریر ختم ہوئی تو پانچ منٹ تک تالیاں بجتی رہیں۔ میئر نے ٹارزن کو "شہر کی کنجی" پیش کی۔ پھر تو ٹارزن سے ہاتھ ملانے اور آٹوگراف لینے والوں کا ہجوم ٹوٹ پڑا۔ آٹوگراف تو وہ کیا دیتا، آٹوگراف بک پر روشنائی لگے انگوٹھے کا نشان ثبت کرتا گیا۔ منتظمین نے اُسے بڑی مشکل سے ہجوم سے نکالا۔ بعد ازاں میئر نے اُسے بلدیہ کی جانب سے تعمیر کردہ ایک اکھاڑے کے افتتاح کی دعوت دی جسے ٹارزن نے بخوشی قبول کر لیا۔

ٹارزن جب سرکاری کوٹھی پر واپس لوٹا تو ذہنی طور پر وہ تھک چکا تھا۔ لیکن اس کا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ رات اُسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ گزرے ہوئے واقعات پر غور کرتا رہا۔ اب اُسے جنگل میں گزاری ہوئی زندگی پھیکی پھیکی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ اُس نے اب تک جنگل کی ویرانی اور تنہائی میں اتنے دن کیسے گزار لیے۔ رات اُس نے عجیب سا خواب دیکھا کہ کسی گھنے جنگل سے گزرتے ہوئے اچانک اس کا سامنا ایک شیر سے ہو گیا ہے جسے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے ہیں اور وہ تھر تھر کانپنے لگا ہے۔ آنکھ کھلی تو وہ پسینے سے شرابور تھا۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے خواب دیکھے ہی کتنے تھے لیکن اگر خواب دکھائی بھی دیے تھے تو ان خوابوں میں وہ ایک بہادر اور جیالا ٹارزن تھا۔ لیکن کیا اب شہریوں کی روایتی بزدلی اس کے اندر جراثیم کی طرح پھیل رہی تھی؟ یہ سوال اس کے ذہن میں کھٹکتا رہا۔

اگلی صبح وہ کاہلی سے بستر پر پڑا تھا کہ پروٹوکول آفیسر بھاگا بھاگا آیا اس کے ہاتھ میں اخبارات کا پلندہ تھا۔

"ٹارزن آپ کے لیے ایک دلچسپ خبر!"

"کون سی خبر؟" ٹارزن نے لمبی جماہی لے کر کہا۔

"جھارا پہلوان نے آپ کو کشتی لڑنے کا چیلنج دیا ہے۔"

"مگر میں اکھاڑے کا پہلوان تو نہیں ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جناب۔ لیکن اگر آپ نے اس چیلنج کو قبول نہ کیا تو بڑی بے عزتی ہوگی۔ پبلک کیا کہے گی۔ یہی نا کہ ٹارزن میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ٹارزن جس کی طاقت و عظمت کے دنیا گُن گاتی ہے۔ ایک پہلوان سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔"

"میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہوں۔" ٹارزن کو غصہ آ گیا۔ "بلکہ بات ساری یہ ہے کہ میں بلا وجہ کسی سے لڑنا پسند

نہیں کرتا۔"

"جناب یہ اسٹریٹ فائٹ نہیں ہوگی کُشتی ہوگی کُشتی۔ دُنیا بھر میں اس کی شہرت ہوگی۔ اخبارات سُرخیاں لگائیں گے۔

"ٹارزن بمقابلہ جبارا پہلوان" ٹی وی پر اس مقابلے کی فلمیں دکھائی جائیں گی۔ آپ تصوّر نہیں کر سکتے۔ مسٹر ... سے آپ کو بڑا فائدہ ہوگا۔ اس کا آپ کو معاوضہ بھی ملے گا۔"

"پروٹوکول آفیسر صاحب۔ آپ میری بات نہیں سمجھ رہے ہیں" ٹارزن نے جھنجھلا کر کہا "میں کشتی وشتی لڑنا نہیں جانتا۔ میں لڑ ... مر جاؤں گا یا دشمن کو جان سے مار دوں گا۔"

"ایسا غضب نہ کیجیے گا۔ اس طرح تو آپ پر قتل کا مقدمہ بن جائے گا" پروٹوکول آفیسر بوکھلا گیا "آپ صرف اُسے اکھاڑے میں چت کر دیں۔ یہی بہت کافی ہے۔"

"ٹھیک ہے ... میں سوچ کر جواب دوں گا" ٹارزن ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔

"ارے ٹارزن صاحب۔ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ ہمت کریئے" پروٹوکول آفیسر نے اُسے اُکسایا۔

"میں اخبارات کو خبر جاری کر رہا ہوں کہ آپ نے چیلنج قبول کر لیا ہے" یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

ٹارزن پروٹوکول آفیسر کے جانے کے بعد دوبارہ قالین پر دراز ہوگیا۔ اس پر اب ایک نئی اُفتاد آپڑی تھی۔ اُسے یہ سب کچھ بڑا گھٹیا لگ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں جبارا پہلوان سے ہونے والی کشتی کا منظر گھومنے لگا۔ اکھاڑے کے گرد لوگ باگ جمع ہیں۔ نعرے لگ رہے ہیں، سیٹیاں بج رہی ہیں۔ اور ٹارزن، شیروں، چیتوں اور درندوں سے مقابلہ کرنے والا ٹارزن اپنے ہی جیسے ایک انسان سے گتھم گتھا ہے۔ اور لوگ شور مچا رہے ہیں۔ ٹارزن کا ذہن اُلجھ گیا۔ وہ سارا دن کمرے ہی میں پڑا رہا۔ اس نے تمام تقریبات میں شرکت کا پروگرام منسوخ کر دیا۔ اسی طرح دوپہر ہوگئی، شام ہوگئی، رات ہوگئی اور جب رات ہوگئی تو باہر اندھیروں میں کُتّے بھونکنے لگے، جھینگر بولنے لگے۔ رات کا سیاہ پرندہ دریچے سے پر پھڑپھڑاتا ہُوا گزر گیا۔ ٹارزن کو ایسا لگا جیسے اُسے جنگل آواز دے رہا ہے۔ بُلا رہا ہے، گھنے درخت، ان کی شاخیں اپنی باہیں پھیلائے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ ٹارزن تمھارے بغیر ہم اُداس ہیں۔

وال کلاک نے تین کا گھنٹہ بجایا۔ سرکاری کوٹھی سے ایک دیو قامت سایہ اندھیرے میں نمودار ہوا اور تیز تیز قدموں سے کسی نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا۔

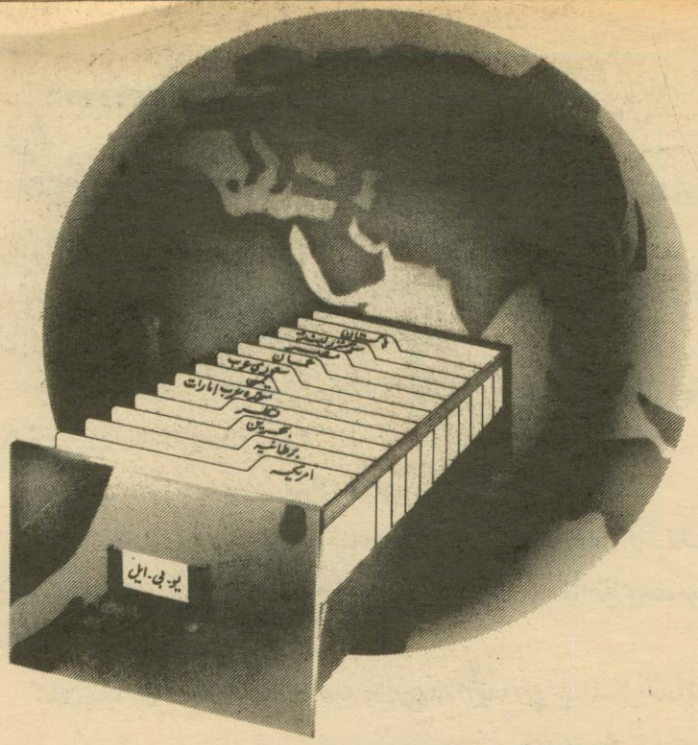

جِدّت و بَصیرت

یو۔ بی۔ ایل نے اپنی ۱۶۰۰ سے زائد مقامی و بیرونی شاخوں و دفاتر
اور وسیع تجربے کی مدد سے بیرونِ ملک منڈیوں سے واقفیت کو اس طرح یکجا
کرلیا ہے کہ اپنے کرم فرماؤں کو بہترین تجارتی معلومات، ضروری سہولتیں
بروقت بہم پہنچانا اور ضرورت کے مطابق ان کے مابین رابطے کا اہم فریضہ انجام دینا
اس کا امتیازی نشان بن گیا ہے

یونائیٹڈ بینک درآمدات اور برآمدات کے لئے سرمائے کی فراہمی، غیرملکی کرنسی میں قرضہ جات،
آئی ڈی اے قرضہ جات، چھوٹے قرضہ جات، زرعی قرضہ جات، غیر ملکی و ملکی ضمانتیں،
ترسیلاتِ زر اور ماہرانہ مشاورتی خدمات بہم پہنچاتا ہے۔

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ

— آپ کی خدمت کے لئے کوشاں

UBL-K-1/31-5-88

Orient

حارث شمیم

بچّی کتنی اچھّی

بچپن تو کھیل کود کا زمانہ ہوتا ہے۔ ہر طرح کی فکر سے آزادی کا زمانہ۔ یہی دور تو ہے جس میں تتلیوں کے پیچھے بھاگنا اور رات کو دادی اماں سے کہانی سُننے کے لیے دیر تک جاگنا بھلا لگتا ہے۔ یہی تو وقت ہے جس میں چاند چڑیوں، پھولوں اور گڑیوں سے گفتگو کرنا اچھا لگتا ہے۔

لیکن آج ہم آپ کی ملاقات ایک ایسی بچّی سے کروا رہے ہیں جو عام بچّوں سے مختلف ہے۔ یہ بچّی ان کھیلوں میں ذرا کم ہی دلچسپی رکھتی ہے جنھیں بچّے کھیلتے ہیں۔ اس کی خواہش اور خواب عام لڑکیوں جیسے نہیں ہیں۔

امریکی ریاست کیلی فورنیا سے تعلق رکھنے والی اس بچی کا نام مچل الیگزینڈر ہے، جو اب دُنیا بھر میں مشہور ہو چکی ہے۔ اس وقت اس کی عمر گیارہ سال ہے۔ مچل جب نو برس کی تھی۔ تب اُس نے دنیا میں امن کا پیغام عام کرنے کی غرض سے ایک کھیل ایجاد کیا۔ جس کا نام اُس نے "GIVE PEACE CHANCE" یعنی امن کو موقع دیجئے رکھا۔ یہ کھیل ٹوڈو کی طرح گتے پر کھیلا جاتا ہے۔

امن اور بھائی چارے کے پیغام کو عام کرنے کے لیے مچل کھیل کی ایجاد سے لے کر اب تک اپنے کھیل کے ہمراہ دنیا کے بہت سے ممالک کا دورہ کر چکی ہے۔ یہ لڑکی دنیا کے مختلف ممالک کے سربراہوں اور دیگر اعلیٰ حکام کو اس کھیل کا ایک میچ کھیلنے کا چیلنج کرتی ہے اور دنیا کے مختلف ممالک کے سربراہ عالمی امن کے لیے کام کرنے والی اس پیاری سی بچی کو بلا کر اس کے ساتھ میچ کھیلتے ہیں۔ مچل نے اب تک تقریباً تمام ہی مقابلے جیتے ہیں۔

مچل اب تک جن اہم عالمی شخصیات کے ساتھ میچ کھیل چکی ہے اُن میں ناروے کے شہنشاہ اور وزیرِ اعظم چین کے نائب صدر، ہانگ کانگ کے نائب صدر، ہندوستان کے وزیرِ اعظم راجیو گاندھی اور روس کے صدر آندرے گرومیکو شامل ہیں۔

آندرے گرومیکو سے مقابلے کے بعد مچل کو دوبارہ روس بلایا گیا اور اُس سے درخواست کی گئی کہ وہ اس کھیل کا روسی زبان میں ترجمہ کرنے میں مدد دے ۱۹۸۵ء میں مچل کو مصر کے سابق مقتول صدر انور سادات کی بیوہ مادام جیہاں سادات کی جانب سے بچوں کا امن انعام دیا گیا۔

۴ر فروری ۱۹۸۸ء کو مچل اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل پیریز ڈی کویار سے میچ کھیلنے اُن کے دفتر پہنچی۔ مچل اور سیکریٹری جنرل کے درمیان یہ میچ بیس منٹ تک جاری رہا۔ اپنے دوسرے میچوں کی طرح مچل نے یہ میچ بھی جیت لیا۔

مچل کے ایجاد کردہ اس کھیل میں اب تک کئی تبدیلیاں ہو چکی ہیں اور اب یہ کھیل بڑے پیمانے پر تیار ہو کر عام مارکیٹ میں فروخت ہو رہا ہے۔ اس کھیل کی فروخت سے ہونے والی نصف آمدنی کو مچل دنیا بھر میں پھیلی ہوئی اُن تنظیموں میں تقسیم کر دیتی ہے جو کسی نہ کسی طریقے سے دنیا میں امن کو پھیلانے کا کام کر رہی ہیں۔

امن و محبت کے ساتھ مچل کی دلچسپی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مچل بڑی ہو کر بین الاقوامی جھگڑوں کو پُرامن مذاکرات کے ذریعہ حل کرانا چاہتی ہے اور اس میں وہ وہی کردار ادا کرنا چاہتی ہے جو مصالحت کرانے والے کا ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہو سکا تو دُنیا میں امن و آشتی کی فضا پیدا کرنے کا کام انجام دے گی۔ یعنی وہ عظیم کام جو اب تک اقوام متحدہ بھی ٹھیک طریقے سے انجام نہیں دے سکا۔

مچل کا عزم، اور حوصلہ گواہی دے رہا ہے کہ ایک دن ضرور اس کا خواب پورا ہو گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

بچّے کی آرزو

شفیع الدین نیّر

لو آسمان دیکھو — تاروں کی شان دیکھو
قدرت کی صنعتوں کا — روشن نشان دیکھو
کیسے چمک رہے ہیں — جھم جھم جھمک رہے ہیں
کرتے ہیں یہ اشارے — یا ہم کو تک رہے ہیں
ہے روشنی بھی پیاری — ہر چھب ہے اِن کی نیاری
ایسے نظر ہیں آتے — پھولوں کی جیسے کیاری
جب رات کا اندھیرا — ہے اِس جہاں پہ چھاتا
اس وقت اُن کا ہونا — ہم سب کو ہے لبھاتا
راہ گیر آتے جاتے — راحت ہیں ان سے پاتے
بھولے ہوؤں کو اکثر — رستہ ہیں یہ دکھاتے
میری ہے یہ تمنّا — بَن جاؤں میں بھی تارا
دُنیا سے دُور کر دوں — پاپوں کا یہ اندھیرا
نیّر جہاں بھی جاؤں — اندھیر یہ مٹا دوں
نیکی کی روشنی سے — دُنیا کو جگمگا دوں

چراغ تلے

غلام رضا جعفری

فرحان انگلیوں میں پینسل دبائے بالوں میں انگلیاں ڈالے، کاپی پر جھکا ہوا تھا۔ وہ مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ کیا لکھے؟ سوچ سوچ کر اُس کا سر دُکھنے لگا تھا۔ وہ لکھنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا مگر کچھ بھی نہ لکھ پاتا۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح سر کھپاتا رہا۔ مگر اُس کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ اُس نے سر جھٹکا اور کاپی بند کر کے بستے میں رکھ کر بستہ ایک طرف پٹخ دیا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ "کچھ دن رہ گئے ٹیسٹ ہونے میں" اُسے خیال آیا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اُف، ایک تو یہ لوگ کتابیں اتنی مشکل بناتے ہیں کہ بس۔ پتا نہیں کیا فائدہ ہوتا ہے اُن کو۔" فرحان غصّے میں بڑبڑایا۔ "صبح پھر مس ڈانٹیں گی اور سب کے سامنے بے عزتی ہوگی۔ میں بھی صبح اسکول نہیں جاؤں گا۔" اس نے بڑبڑا کر کہا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔

"فیل بھی تو تم ہی ہو گے!" اس کے اندر سے کوئی بولا۔ اور وہ اُٹھ گیا۔ اس نے بستہ کھولا اور حساب کی کتاب نکال کر بیٹھ گیا۔ گھڑی دیکھی تو رات کے دس بج رہے تھے۔ اگر وہ دیر سے سویا تو صبح اسکول کے لیے جلدی نہیں اُٹھ سکے گا، مگر نیند تو جب آئے، جب اس کی پریشانی دُور ہو۔ اُس نے کاپی لی اور ممّا کے کمرے میں گیا۔

"ممّا... احساب سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"اُفوہ"۔ بیٹا! یہ کوئی وقت ہے پڑھنے کا جاؤ، سو جاؤ۔ اس وقت مت پڑھو۔" اس کی ممّا نے تیز لہجے میں کہا۔

"ممّا! آپ سوال سمجھا دیں۔ میں صبح حل کر لوں گا۔" فرحان نے زور دیا۔

"سُنا نہیں تم نے" ممّا نے اُونچی آواز میں کہا۔ فرحان آنکھوں میں آنسو لیے کمرے سے باہر نکل آیا۔ کچھ دیر تک باہر کھڑا وہ شکوہ بھری نظروں سے اپنی ماں کے کمرے کو دیکھتا رہا۔ پھر ساتھ والے کمرے میں گھس گیا۔ اس کے پاپا آفس کے کام میں مصروف تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُن کے پاس گیا۔

"کیا بات ہے؟" پاپا نے پوچھا۔

"پاپا! حساب سمجھا دیں۔ ورنہ مس صبح ڈانٹیں گی۔ آج بھی سزا ملی تھی۔" فرحان بیچارگی سے بولا۔

"اس وقت میں آفس کا ضروری کام کر رہا ہوں۔ صبح بتا دُوں گا۔" پاپا نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا...

"پلیز پاپا...! مس ڈانٹیں گی۔ آپ آفس کا کام آفس میں کر لیجئے گا۔" فرحان نے پھر کہا۔

"جاؤ، جا کر سو جاؤ۔ ڈسٹرب نہ کرو۔ میں فون کر دُوں گا۔ تمھاری مس کو" پاپا نے جواب دیا۔

فرحان مایوسی سے قدم اٹھاتا ہُوا واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ کاپی ایک طرف پھینک کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ "آخر ممّا پاپا کو کب وقت ملے گا؟ آج بھی پاپا نے کہا تھا' فون کر دُوں گا۔ مگر سزا تو پھر بھی ملی تھی۔" وہ کافی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر نجانے کس وقت اُس کی آنکھ لگ گئی اور وہ سپنوں کی وادیوں میں کھو گیا۔

صبح ممّا فرحان کے کمرے میں آئیں تو وہ سو رہا تھا۔ "اُٹھو فرحی بیٹا! دیکھو دن چڑھ آیا ہے۔ اسکول کی تیاری کرو۔ ورنہ لیٹ ہو جاؤ گے۔" ممّا نے اُس کا بازو پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

"آج میں اسکول نہیں جاؤں گا۔" فرحان نے اپنا فیصلہ سُنایا۔

"کیوں...؟ چلو جلدی سے اُٹھ جاؤ۔ اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔ چلو شاباش۔" ممّا نے لحاف کھینچ لیا۔ تو فرحان بے دلی سے اُٹھا اور تیار ہو کر اسکول چلا گیا۔

فرحان کو لکھائی پڑھائی سے بہت دلچسپی تھی وہ بڑی محنت اور لگن سے پڑھتا۔ اس کی ممّا اُسے صبح سویرے تیار کر دیتیں اور پاپا بڑی پابندی سے اُسے اسکول چھوڑ آتے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ اوّل آتا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ فرحان تعلیمی مراحل طے کرتا گیا اور چھٹی میں پہنچ گیا۔ اس کے ماں باپ کی مصروفیات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کے پاپا اپنے آفس کے کاموں اور دوستوں کی پارٹیوں میں اُلجھے رہتے اور ممّا سماجی کاموں میں مصروف رہتیں۔ ممّا ایک کالج میں پرنسپل بھی تھیں۔ وہ دونوں اپنے کاموں میں اس قدر اُلجھے رہتے کہ فرحان کو وقت ہی نہ دے پاتے۔

"آج کے بچے کل کے معمار ہیں۔ بچے ہمارا مستقبل ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان پر محنت کر کے ان کے مستقبل کو روشن کریں۔ ان کو پورا پورا وقت

دیں۔ ان کے تعلیمی مسائل حل کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔ ان کے سوالات کا بہتر انداز میں جواب دے کر انھیں سمجھائیں۔ تاکہ وہ کچھ سیکھیں" مسز تقی پُرجوش انداز میں تقریر کر رہی تھیں اور پورا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ دروازے کی چرچراہٹ سُن کر وہ خیالوں کی دُنیا سے نکل آئیں اور کاغذ پر لکھی ہوئی تقریر سے سر اُٹھا کر سامنے دیکھا، فرحان کاپی اُٹھائے ان کے پاس آیا۔

"ممّا! تھوڑا سا حساب سمجھا دیں۔" فرحان نے کہا۔۔۔

"اُفوہ بیٹا!" اس کی ممّا نے اُکتاتے ہوئے انداز میں کہا۔ "تم دیکھ رہے ہو کہ میں مصروف ہوں مجھے شام کے جلسے میں تقریر کرنی ہے اور تم مجھے ڈسٹرب کرنے آگئے!"

"ممّا! میں کیا کروں۔ ٹیسٹ قریب ہے۔ مجھے ذرا بھی حساب نہیں آتا۔" فرحان نے بڑی بے بسی سے کہا۔ اس کا انداز رونے کا سا تھا۔

"اُفوہ۔ جاؤ اپنے کمرے میں، ذہن پر زور دو۔ آجائے گا سمجھ میں۔ مجھے پریشان مت کرو۔" ممّا بیزاری سے بولیں اور دوبارہ کاغذ پر جُھک گئیں فرحان چند لمحے کھڑا اُن کی طرف آنسو بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر تیزی سے نکل کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ پاپا آفس گئے ہوئے تھے اور دوسرا کوئی تھا نہیں، جس سے وہ مدد حاصل کر سکتا۔

فرحان اپنے کمرے میں بیٹھا سسک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے اس کے رُخسار پر لکیریں بنا دی تھیں۔ اس کی کاپیاں کتابیں کمرے میں بکھری پڑی تھیں۔ باہر سے لائے گئے بیش قیمت کھلونے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ زندگی میں پہلی بار فیل ہوا تھا۔ فرحان کی ممّا جب کمرے میں آئیں۔ تو کمرے کی حالت دیکھ کر چونک گئیں۔

"یہ کیا کیا تم نے۔۔۔ اور رو کیوں رہے ہو۔ کیا ہُوا تمھیں؟" ممّا نے پریشان ہو کر پوچھا۔ فرحان نے کچھ کہے بغیر رپورٹ کارڈ اُن کی طرف بڑھا دی۔

"فیل!" انھوں نے رپورٹ پڑھ کر حیرانگی سے کہا۔ رپورٹ کارڈ کے ساتھ ایک پرچہ بھی منسلک تھا۔ جو فرحان کی کلاس ٹیچر نے لکھا تھا۔ انھوں نے پرچہ پڑھنا شروع کیا۔

"مسز تقی۔۔۔! ماشاءاللہ آپ بہت اچھی سماجی کارکن ہیں۔ آپ کی خدمات معاشرے کے لیے قابلِ فخر ہیں۔ آپ پروگراموں کا انعقاد کرتی ہیں۔ آپ نے ٹیوشن سینٹرز بنوائے۔ آپ بچوں کو وقت دیتی ہیں۔ مگر افسوس! آپ نے اپنے بیٹے فرحان کو بالکل وقت نہ دیا۔ جس کی وجہ سے آپ کا بیٹا فیل ہو گیا ہے۔ اس دن میں آپ کی تقریر سے بہت متاثر ہوئی۔ جس میں آپ نے بچوں کے متعلق بہت کچھ کہا، مگر سمجھ میں نہیں آتا، چراغ تلے اتنا اندھیرا کیوں ہے۔ یاد رکھیے!! بیکار ہے، وہ علم جس پر عمل نہ ہو!"

چیری
بلاسم
لکوئیڈ وائٹ
دیرپا صاف شفاف سفیدی
کامیاب کھلاڑیوں کا انتخاب
CHERRY BLOSSOM
LIQUID WHITE CLEANER
CHERRY BLOSSOM
اسکول ہو یا کھیل کا میدان اُجلے سفید جوتے
آپ کی شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں۔
نہ اترنے والی چیری بلاسم لکوئیڈ وہائٹ پالش
سے اپنے جوتے، کرکٹ پیڈ وغیرہ
چمکدار اور اُجلے رکھیئے
یہ پالش اپنی سفیدی اور چمک کو
برقرار رکھتی ہے
WITH APPL
میدان میں آپ کی شخصیت کو اجاگر کرتی ہے۔
چیری بلاسم
لکوئیڈ وائٹ

رسیلی
سپاری
وہ لُطف جو آپ بار بار چاہیں...
.....یقیناً وہ لطف رسیلی سپاری ہی کا ہے جسے ایک بار آزمانے کے بعد ہر ایک اِس کے خوشگوار ذائقے اور لطیف مہک کا قائل ہو جاتا ہے۔
سپاری کے صاف ستھرے ٹکڑوں کو قدرتی خوشبویات میں بسا کر ایک منفرد اور خوشگوار ذائقہ عطا کیا جاتا ہے اور پھر خوبصورت پیکٹوں میں بند کر کے اِسے رسیلی کا نام دیا جاتا ہے۔
RASILY
SUPARI
شالیمار
رسیلی
سپاری
شالیمار فوڈ پروڈکٹس

کارٹون کہانی

تصاویر:۔ عارف یحییٰ

کہانی:۔ شانی ایوب

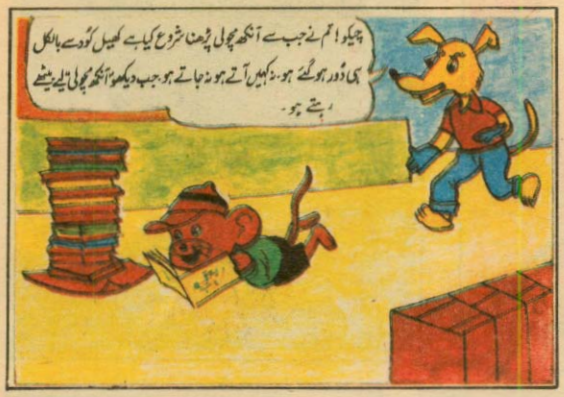

پیڑ کو زور سے ہلانا
چاہیئے تاکہ پکے ہوئے
آم نیچے گر جائیں۔

اُف کس قدر میٹھے آم ہیں ؟

پیٹ بھر گیا ہے
اب تھوڑا آرام
کرنا چاہیئے۔

بچّو ! ڈھینچوں گہری نیند سو رہا ہے
اسے پکڑ لو۔

بچاؤ ! بچاؤ ! بچاؤ !
شیرو اسے پیڑ سے
باندھ دو۔

بچّو ! آج تو پکڑے ہی گئے۔
اب ہم تمہیں کھائیں گے۔

بچّو! میں بازار سے نمک مرچ لینے جا رہا ہوں تاکہ ڈھینچوں کے گوشت سے مزیدار کباب بنا کر کھا سکیں۔ اس پر گہری نظر رکھنا۔

آپ بے فکر ہو کر جائیں ڈیڈو۔

بے چارا ڈھینچو بُرا پھنسا۔
شاید اس کے دوست چیکو کو اس کے پکڑے جانے کی خبر نہیں۔

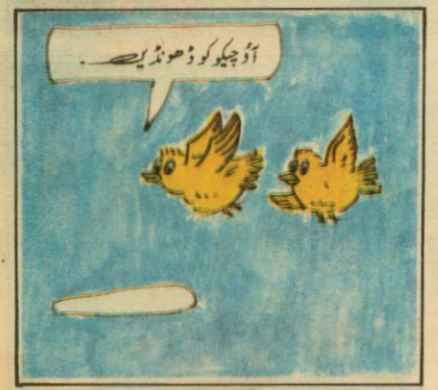
آؤ چیکو کو ڈھونڈیں۔

اچھا!
ارے تمھیں کچھ خبر ہے۔ تمھارے دوست ڈھینچو کو شیرا نے پکڑ لیا ہے۔

میں ابھی اُسے چھڑا لاتا ہوں۔

دیکھو! دیکھو! اس کی مٹھی سے
آنکھ مچولی کے کئی شمارے گر گئے ہیں
چمکو کو چھوڑو۔ آنکھ مچولی لوٹو۔

اسے بھی پکڑ لو۔
وہ۔ دیکھو چمکو ادھر ہی آ رہا ہے۔

وہ دونوں آنکھ مچولی پڑھنے
میں مگن ہیں، بھاگ چلو۔

واہ۔ دلچسپ رنگین تصاویر مزیدار
سلیقے اور انعامات کے کئی سلسلے!
مزہ آگیا۔

کمبختو! ڈھینچو کہاں ہے؟
?

اگر آج آنکھ مچولی نہ ہوتا تو جان بچنا
مشکل تھی۔

رابرٹ ریپلے

ایک ناقابلِ یقین انسان!

ریپلے کا ذاتی اسکیچ

عقیل عباس جعفری

ہم میں سے شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جس نے کبھی نہ کبھی رابرٹ ریپلے کا مشہور اور معروف سلسلہ "مانیں یا نہ مانیں" BELIEVE IT OR NOT نہ پڑھا ہو۔ یہ وہ سلسلہ ہے جو ایک زمانے میں دنیا کا مقبول ترین سلسلہ ہُوا کرتا تھا۔ اور اب بھی دُنیا کے ہزاروں افراد اس سلسلے کے مستقل پڑھنے والوں میں شامل ہیں۔ آئیے آج ہم آپ کو اس مشہور سلسلے اور اس کے خالق کے بارے میں کچھ بتائیں۔

رابرٹ ریپلے کیلیفورنیا (امریکہ) کے ایک غریب گھرانے میں ۲۵ دسمبر ۱۸۹۳ء کو پیدا ہُوا۔ اس کے والد پیشے کے اعتبار سے بڑھئی تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ریپلے بھی بڑا ہو کر پلمبر یا اینٹیں چُننے والا مزدور بن جائے۔ جبکہ اس کے برعکس ریپلے کو مصوّری سے گہری دلچسپی تھی۔ اگرچہ اس نے کسی ادارے یا استاد سے مصوّری کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی مگر اس نے اپنی محنت اور مسلسل کوششوں سے اس شعبے میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کے کارٹون دنیا میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا سلسلہ بن چکے تھے۔

بچپن میں ریپلے کو مصوّری کے علاوہ ایک کھیل سے بھی گہری دلچسپی تھی اور وہ کھیل تھا بیس بال۔ ریپلے اس کھیل کا پیشہ ور کھلاڑی بننا چاہتا تھا۔ مگر اُس کی بدقسمتی کہ وہ ایک مرتبہ کھیل کے دوران اپنا بازو تڑوا بیٹھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے اس شوق کا نعم البدل یوں ڈھونڈا کہ مختلف کھیلوں پر مبنی کارٹون بنانا شروع کر دیے۔

ریپلے نے جب کارٹونسٹ کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تو اُسے یکے بعد دیگرے تین اخبارات میں تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تینوں اخبارات کے مالکوں نے اُسے تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد ملازمت سے برطرف کر دیا۔ یہ ۱۹۱۸ء کی بات ہے۔ ریپلے ان دنوں نیویارک کے روزنامے "گلوب" سے وابستہ تھا۔ کرسمس کا موسم اپنے عروج

پر تھا اور اخبار کا ہفتہ وار ایڈیشن چھپنے کے لیے پریس جانے والا تھا۔ ریپلے کو اپنا کالم مکمل کرکے اشاعت کے لیے دینا تھا اور اُسے کوئی نئی بات نہیں سُوجھ رہی تھی کہ اچانک اپنی پینسل کا پچھلا سرا چباتے چباتے اسے بالکل ایک اچھوتا خیال سُوجھا "کیوں نہ ایسے واقعات پر اسکیچ بنائے جائیں جو بظاہر ناقابل یقین معلوم ہوں۔" خیال کا سُوجھنا تھا کہ ریپلے کی پنسل خود بخود چلنی شروع ہوگئی۔ پہلا واقعہ ایک ایسے کھلاڑی کے بارے میں تھا جس نے سو گز کا فاصلہ پیچھے کی سمت دوڑتے ہوئے صرف ۱۴ سیکنڈ میں طے کیا تھا۔ دوسرا واقعہ اس شخص کے بارے میں تھا جس نے پورا براعظم اُلٹا چلتے ہوئے عبور کیا تھا۔ ریپلے نے اسی طرح کے چھ سات واقعات اور جمع کیے اور ان کے اسکیچ بنا کر اپنے ایڈیٹر کے پاس جا پہنچا۔

ایڈیٹر کو ریپلے کا خیال بڑا منفرد اور اچھوتا لگا۔ ریپلے نے اس سلسلے کا عنوان "CHAMPS AND CHUMRS" تجویز کیا تھا۔ مگر اخبار کے ایڈیٹر نے ریپلے کو عنوان بدلنے کے لیے کہا۔ ریپلے نے نیا عنوان دیا "BELIEVE IT OR NOT !" (مانیں یا نہ مانیں) اور اگلے دن ۱۹ دسمبر ۱۹۱۸ء کو یہ واقعات اور اسکیچز اسی عنوان کے تحت شائع کر دیے گئے۔

ریپلے کا یہ سلسلہ قارئین نے بے حد پسند کیا اور جلد ہی یہ سلسلہ ہفتے میں دو مرتبہ اور پھر روزانہ شائع ہونے لگا۔ ۱۹۲۳ء میں گلوب میں یہ سلسلہ ختم ہوا تو "نیویارک پوسٹ" میں شائع ہونے لگا۔ اب اس سلسلے میں کھیلوں کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، حیوانات، نباتات اور عام معلومات کی مختلف دلچسپ چیزیں جگہ پانے لگی تھیں۔

مشہور مصنف ڈیل کارنیگی نے ریپلے کے متعلق ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ریپلے نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ آپ شہرت کے لیے دس برس تک تابڑ توڑ محنت کرتے رہیں لیکن یہ حاصل نہیں ہوتی اور جب یہ حاصل ہوتی ہے تو دس منٹ بھی نہیں لگتے۔

یہی کچھ رابرٹ ریپلے کے اپنے ساتھ ہوا۔ ستمبر ۱۹۲۸ء میں اُس نے ایک ایسا کارٹون بنایا جس نے لاکھوں افراد کو حیرت زدہ کر دیا۔

ہُوا یوں کہ مئی ۱۹۲۷ء میں مشہور ہوا باز چارلس لنڈبرگ نے اپنے ہوائی جہاز "اسپرٹ آف سینٹ لوئی" میں تن تنہا بحرِ اوقیانوس عبور کیا۔ ساری دنیا میں اس واقعے کی بڑی تشہیر ہوئی اور چارلس لنڈبرگ اس واقعے کی بدولت دنیا کا مشہور ترین شخص بن گیا۔

کچھ عرصے بعد ریپلے نے اپنے سلسلے "مانیں یا نہ مانیں" کے تحت چارلس لنڈبرگ کے جہاز کا ایک اسکیچ بنایا اور اس کے نیچے تحریر کیا "چارلس لنڈبرگ بحرِ اوقیانوس کو فضا میں عبور کرنے والا ۶۷ واں شخص ہے۔"

اس اسکیچ کا شائع ہونا تھا کہ نیویارک پوسٹ کے دفتر میں خطوط اور ٹیلی گراموں کا انبار لگ گیا۔ جو اس اسکیچ کی وضاحت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ریپلے کا دعویٰ غلط ہے اور اُسے اس مذاق کی معافی مانگنی چاہیے۔

پہلے دن ریپلے کو جو خطوط اور ٹیلی گرام موصول ہوئے ان کی تعداد تین ہزار تھی۔ جب ان کی تعداد دو لاکھ تک پہنچ گئی تو ریپلے نے اپنی وضاحت شائع کی۔ اس نے بتایا کہ لنڈبرگ سے کئی سال پہلے براؤن اور الکاک نامی دو افراد بحر اوقیانوس پر پرواز کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ برطانوی جہاز آر ۳۴ اور جرمن جہاز زیڈ آر۔ سی میں بالترتیب ۳۱ اور ۳۳ افراد بحر اوقیانوس پر سے پرواز کر چکے ہیں۔ ریپلے نے کہا اس طرح لنڈبرگ بحر اوقیانوس فضا کے ذریعے عبور کرنے والا ۶۷ واں شخص ہے۔ البتہ اگر اس کی کوئی انفرادیت ہے، تو صرف اتنی کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے بحر اوقیانوس تن تنہا عبور کیا ہے۔

ریپلے کی یہ وضاحت چھپنی تھی کہ اس کی شہرت دُور دُور تک جا پہنچی۔

۳ر نومبر ۱۹۲۹ء کو ریپلے کی "مانیں یا نہ مانیں" میں ایک اسکیچ اس عنوان کے تحت شائع ہوا "امریکہ کا کوئی قومی ترانہ نہیں ہے"۔ ریپلے نے دعویٰ کیا کہ امریکہ کا سرکاری طور پر کوئی قومی ترانہ موجود نہیں ہے اور جو گیت وہ ترانے کے طور پر گاتے ہیں وہ کسی زمانے میں انگریز شرابی گایا کرتے تھے۔

اس اسکیچ کے چھپتے ہی امریکہ کے پچاس لاکھ شہریوں نے امریکی کانگرس سے اس کی وضاحت کے لیے کہا۔ چنانچہ ۳ر مارچ ۱۹۳۱ء کو "ستاروں سے بھرے پرچم" کو سرکاری طور پر امریکہ کا قومی ترانہ قرار دے دیا گیا۔ جو آج بھی امریکہ کا قومی ترانہ ہے۔

اب ریپلے لوگوں کا ہر دل عزیز مصنف بن چکا تھا۔ وہ بھی لوگوں کو محیر العقول واقعات پیش کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کا عادی بن چکا تھا۔ اس نے دنیا کے گرد کئی چکر لگائے۔ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جہاں اُس کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ بعض اوقات تو اس نے صرف ایک ہی بات کی تصدیق کے لیے ہزاروں میل کا سفر طے کیا۔ اسی لیے اس کو "جدید مارکوپولو" کا خطاب بھی عطا کیا گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اس کا کالم بیک وقت ۳۰۰ اخبارات میں شائع ہوتا تھا۔ جو فوراً دنیا کی متعدد زبانوں میں منتقل ہو جاتا تھا۔ اس کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ ڈالر سے بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ ایک مرتبہ مشہور فلم ساز ادارے وارنر برادرس نے اس سے اس کے سلسلے کو فلم کے قالب میں ڈھالنے کے معاہدے کے عوض ۲۵ لاکھ ڈالر ادا کیے تھے۔

ریپلے کے پاس سال بھر میں دنیا بھر سے تقریباً دس لاکھ خطوط آتے تھے۔ ہزاروں خطوط پر اس کا نام بھی لکھا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ فقط یہ لکھا ہوتا تھا "یہ خط دنیا کے سب سے جھوٹے شخص کو ملے"۔ کچھ خطوط پر مختلف زبانوں میں نقش و نگار بنے ہوتے تھے۔ کچھ پر صرف "مانیں یا نہ مانیں" تحریر ہوتا تھا۔ محکمۂ ڈاک ایسے تمام خطوط ریپلے کو پہنچا دیا کرتا تھا۔

تقریباً اسی زمانے میں ریپلے کی ملاقات ایک بینک مینیجر نوربرٹ پرل روتھ سے ہوئی۔ پرل روتھ دنیا کی گیارہ زبانیں

جانتے تھے۔ جلد ہی وہ رپلے کے ریسرچ اسسٹنٹ بن گئے اور انھوں نے بھی رپلے کے لیے "مانیں یا نہ مانیں" کے آئٹمز کا ڈھیر لگا دیا۔ رپلے اور پرل روتھ کی یہ رفاقت رپلے کی وفات تک جاری رہی۔ رپلے کے انتقال کے بعد انھوں نے رپلے کے ادارے کا انتظام سنبھال لیا اور اس ادارے کو انھی خطوط پر چلاتے رہے جن پر وہ رپلے کی زندگی میں چلتا تھا۔

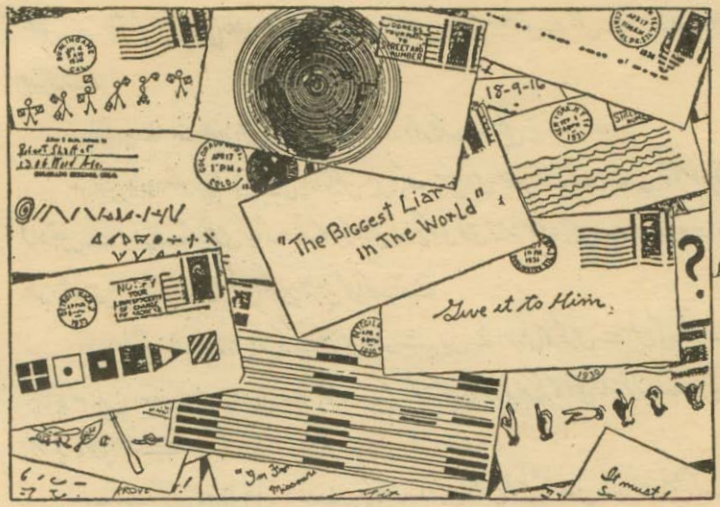

رپلے کے نام آنے والے خطوط

ایک مرتبہ پرل روتھ سے پوچھا گیا کہ انھیں "مانیں یا نہ مانیں" سلسلے کا کون سا آئٹم سب سے زیادہ حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین لگتا ہے۔ پرل روتھ نے بتایا کہ جنوبی امریکہ میں کولمبیا کے علاقے کے ایک پہاڑی سلسلے میں ایک اسکول خاصی بلندی پر واقع تھا۔ وہاں تک پانی پہنچانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ چنانچہ اسکول کی انتظامیہ نے ایک کنواں کھودر رکھا تھا۔ یہ کنواں کچھ عرصے بعد خشک ہوگیا۔ اب اسکول کے منتظمین نے ایک اور کنواں کھودنا چاہا مگر وہ چاہتے تھے کہ کنواں بالکل صحیح مقام پر کھودا جائے تاکہ محنت اور پیسہ اکارت نہ جائے۔ چنانچہ انھوں نے سوئٹزرلینڈ میں مقیم ایک پادری ایلکسس میرمٹ کو اپنا مسئلہ لکھ بھیجا۔ یہ پادری صاحب پانی تلاش کرنے کے سلسلے میں خاصے مشہور تھے۔ پادری صاحب نے اسکول کی انتظامیہ کو لکھا کہ وہ بیماری کے باعث طویل سفر نہیں کر سکتے۔ چنانچہ آپ مجھے اپنے علاقے کا ایک تفصیلی نقشہ بھیج دیجیے۔ اسکول کی انتظامیہ نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ اب پادری ایلکسس نے جو اس اسکول سے چھ ہزار میل دور سوئٹزرلینڈ میں بیٹھے تھے،

وہ نقشہ اپنی میز پر پھیلایا اس پر ایک پنڈولم لٹکا کر کچھ حساب لگایا اور ایک مقام پر کراس (×) کا نشان لگا دیا۔

انھوں نے وہ نقشہ واپس بھیجتے ہوئے لکھا کہ جس مقام پر کراس کا نشان بنایا گیا ہے۔ اس مقام پر کھدائی کی جائے تو ۸۸ فٹ ۹ انچ کی گہرائی پر پانی مل جائے گا۔ جو ۵۰۰ لیٹر فی منٹ کی رفتار سے اُبل رہا ہوگا۔

چنانچہ اسی مقام پر کھدائی کی گئی اور واقعی ۸۸ فٹ ۹ انچ کی گہرائی پر پانی مل گیا اور اس کی رفتار بھی وہی تھی جو پادری صاحب نے بتائی تھی۔

یہی نہیں بلکہ پادری صاحب نے ایک مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ انھیں اس مقام پر کسی دھات کی موجودگی محسوس ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس مقام کی بھی کھدائی کی گئی تو وہاں سے کئی انسانی لاشیں برآمد ہوئیں جو دھات کے کفن باکس میں دفنائی گئی تھیں۔

رابرٹ رپلے کا اوڑھنا بچھونا اس کا یہی شوق تھا۔ دُور دُور سے اُسے تقریریں کرنے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پروگرام پیش کرنے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ ۲۴ مئی ۱۹۴۸ کو وہ ٹیلی ویژن پر اپنے ہفتہ وار مانیں یا نہ مانیں پروگرام کے سلسلے میں پیش ہوا اور تین دن بعد ۲۷ مئی ۱۹۴۸ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔

مگر اس کے مرنے کے بعد اس کی شہرت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی اور آج بھی اس کا سلسلہ دنیا کے مقبول ترین سلسلوں میں سے ایک ہے۔ اب اس کا یہ سلسلہ اس کا قائم کردہ ایک ادارہ چلا رہا ہے۔ جس کے امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ کے متعدد شہروں میں دفاتر ہیں۔ اور "مانیں یا نہ مانیں" سلسلے کے مختلف آئٹمز پر مبنی میوزیم بھی قائم ہیں۔

Believe it or Not!

○ یمن کے بادشاہ امام یحییٰ کو وہم تھا کہ اگر کبھی ان کی کوئی تصویر کھینچی گئی اور شائع کی گئی تو ان کی موت واقع ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ کبھی کسی کو اپنے سامنے کیمرہ لے کر آنے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے۔ مگر ایک اطالوی مصور نے کوئی ایک گھنٹے تک ان سے ملاقات کی اور ان کے چہرے کے نقوش اپنے ذہن میں محفوظ کر لیے۔ گھر پہنچ کر اُس نے اپنے حافظے کی مدد سے امام یحییٰ کا ایک پورٹریٹ بنا ڈالا۔

رپلے کو یہ بات معلوم ہوئی تو اُس نے اطالوی مصور کے بنائے ہوئے پورٹریٹ کی مدد سے اپنے سلسلے "مانیں یا نہ مانیں" میں ایک اسکیچ اس کیپشن کے ساتھ شائع کر دیا۔

"یمن کے بادشاہ امام یحییٰ، اقوام متحدہ کے رُکن ممالک کے سربراہوں میں سے واحد سربراہ ہیں جن کی آج تک کوئی تصویر

نہیں کھینچی۔ انھیں یہ وہم ہے کہ جس دن ان کی تصویر کھینچی یا کہیں شائع ہوئی "اس دن اُن کی موت واقع ہو جائے گی"۔

یمن کے بادشاہ امام یحییٰ

امام یحییٰ کی موت کی خبر

Sec. II TIMES-HERALD Friday, Feb. 20, 1948

Ruler of Yemen And Sons Killed

CAIRO, Egypt, Feb. 20 (AP). Yehia Hamid el Din, 82, ruler of Yemen, three of his 16 sons and a chief adviser are dead and a new king and government proclaimed, a dispatch from that Arabian kingdom said yesterday. The dispatch gave few details, but Yemenite circles here expressed the belief the five had been killed in a coup d'etat as the result of one of the recurring plots among the king's sons.

جس دن یہ اسکیچ شائع ہُوا اور امریکی اخبارات فروخت کے لیے نیوز اسٹالز پر پہنچے۔ تقریباً اسی وقت یمن میں امام یحییٰ اور ان کے بیٹوں پر قاتلانہ حملہ ہُوا اور امام یحییٰ اور ان کے تین بیٹے ہلاک کر دیے گئے۔

○ انسان واحد جانور ہے جو بیٹھ کے بل سوتا ہے۔

○ بروک لین کا ایک ڈاکیہ فرینک ڈرک مین ایک گلی میں سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک مکان کی بالائی منزل کی کھڑکی سے ایک بچہ گر پڑا۔ فرینک ڈرک مین نے فوراً اپنا تھیلا اس کے نیچے کر دیا۔ وہ بچہ اس تھیلے میں آ گرا اور خوش قسمتی سے اُسے ذرا سی بھی خراش نہیں آئی۔

○ کبوتر واحد پرندہ ہے جو سر جھکائے ہوئے پانی پینے پر قادر ہوتا ہے۔ باقی تمام پرندے اپنا سر پیچھے کر کے پانی گلے سے نیچے اُتارتے ہیں۔

- ترکی کے سلطان مصطفیٰ سوم کے ۵۸۲ بیٹے تھے اور بیٹی ایک بھی نہیں تھی۔

- کینیا (افریقہ) کی جھیل رڈولف کے ایک جزیرے میں ایک ایسا قبیلہ آباد ہے جس کا نام "۹۹" ہے۔ گزشتہ دو سو برس سے اس قبیلے کے افراد کی تعداد نہ ۹۹ سے زیادہ ہوئی ہے اور نہ ہی کبھی ۹۹ سے کم ہوئی ہے۔

قبیلہ "۹۹" کا ایک شخص۔

فارسی کا مشہور شاعر رودکی

- فارسی کا مشہور شاعر رودکی ۸۷۰ء - ۹۵۴ء پیدائشی طور پر نابینا تھا۔ اس نے شراب کی خوبیوں پر ایک ایسی نظم تحریر کی جس میں ۱۳ لاکھ اشعار تھے اور جو ۱۰۰ سے زیادہ جلدوں پر مشتمل تھی۔ رودکی نے یہ نظم شاہ نصر ثانی کے نام معنون کی تھی۔

رودکی کی زندگی کا ایک حیرت انگیز واقعہ یہ بھی تھا کہ ایک ہی دن اس کے یہاں چار بیٹے، تین پوتے اور دو پڑپوتے پیدا ہوئے تھے۔

- عقل مند شخص اپنی محنت پر بھروسا کرتا ہے اور نادان اپنی خواہش پر۔ (حضرت علیؓ)
- خاموشی اظہارِ نفرت کا سب سے بڑا اور بہتر طریقہ ہے۔ (جارج برنارڈ شاہ)
- بہت سے نقصانات آدمی کو اس لئے پہنچتے ہیں کہ وہ لوگوں سے مشورہ نہیں لیتا۔ (افلاطون)

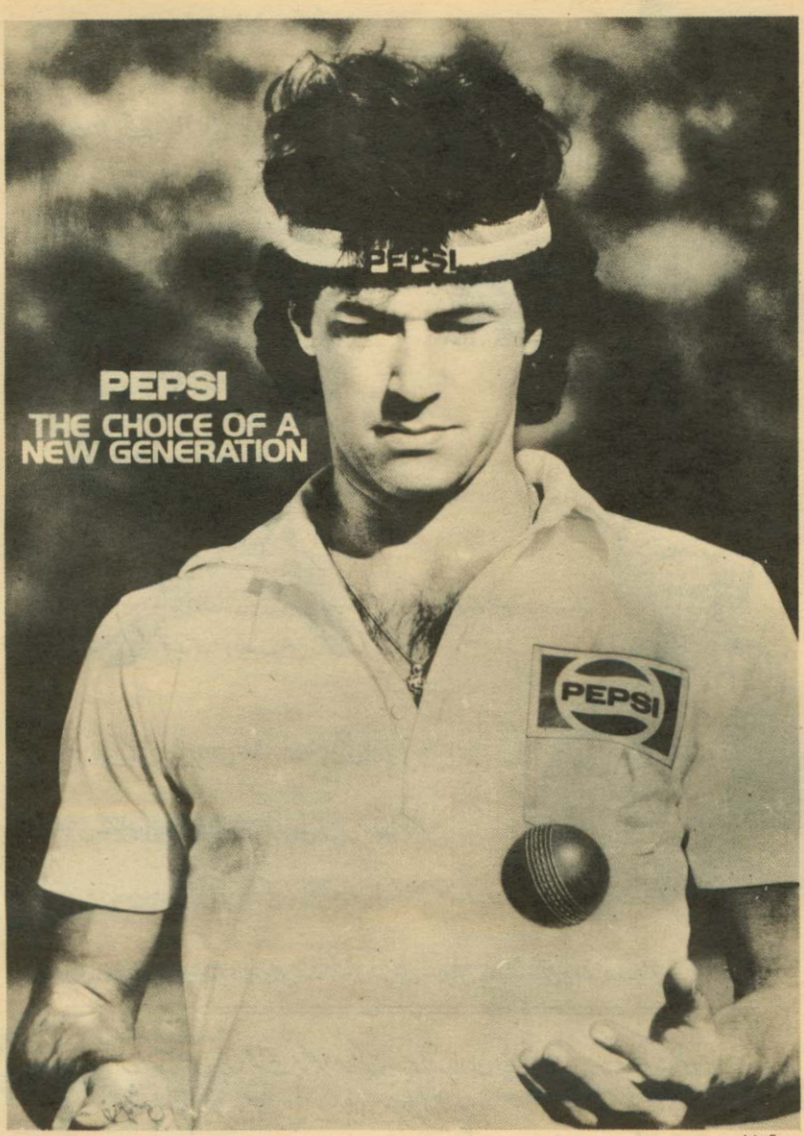

Interflow

میرزا ادیب

امّاں بشیراں

امّاں بشیراں سے سارا محلّہ محبت کرتا تھا۔ ان محبت کرنے والوں میں بڑے بھی تھے اور چھوٹے بھی۔ خاص طور پر بچّے تو اُسے دیکھتے ہی کھیل کُود چھوڑ کر امّاں، امّاں کہتے ہوئے اُس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ امّاں ہر ایک کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتی تھی۔ جیب میں میٹھے چنے ہوتے تھے تو سب میں بانٹ دیتی تھی اور خالی جیبیں لے کر خوش خوش گھر آجاتی تھی۔

امّاں بشیراں محلّے کے آخر میں ایک چھوٹے سے مکان کے اندر ویسے تو تنہا رہتی تھی۔ اس کا کوئی بیٹا بیٹی نہیں تھی۔ کوئی عزیز رشتہ دار بھی نہیں تھا مگر محلّے کے بچّے اسکولوں سے لوٹ کر اپنے گھروں میں آتے تھے تو ان میں چند ایک بار ضرور اس کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ امّاں کوئی کام کہتی تھی تو فوراً کر دیتے تھے۔ محلّے کے دو تین بوڑھوں کے سوا کسی کو بھی امّاں کے بارے میں یہ خبر نہیں تھی کہ وہ کب وہاں آئی تھی اور اس کے

ساتھ کیا بیتی تھی۔ یہ بوڑھے اس کے متعلق کچھ کہنا سننا پسند نہیں کرتے تھے ممکن ہے وہ خود بھی اُس سے زیادہ واقف نہ ہوں۔ بہرحال اماں بشیراں سارے محلے میں بس ایک اماں تھی اور کسی کو بھی یہ جاننے کی پروا نہیں تھی کہ اس کا ماضی کیا تھا اور اس کے پاس اس کا کوئی عزیز کیوں نہیں رہتا؟

اماں بشیراں کام کرنے میں خاصی پھرتیلی تھی۔ کسی کے گھر کوئی تقریب ہوتی تو سب سے پہلے وہاں پہنچ جاتی تھی۔ جتنا کام کر سکتی تھی اُس سے کچھ زیادہ ہی کرتی تھی۔ مگر کسی سے ایک پیسہ تک نہیں لیتی تھی۔ کہتی تھی اللہ کے فضل سے میرے پاس سب کچھ ہے۔ شفیع بڑے اچھے پیسے دے دیتا ہے۔

یہ شفیع اس کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ محلے ہی میں رہتا تھا اور جس دکان میں بیٹھتا تھا وہ اس کی اپنی نہیں تھی اماں بشیراں کی تھی۔ شفیع ہر ماہ باقاعدگی سے اس دکان کا کرایہ ادا کر دیتا تھا اور یہی اماں کے لیے واحد آمدنی تھی جس سے اس کی بہت اچھی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی۔ اس کے اخراجات معمولی قسم کے تھے۔ صبح سویرے ہانڈی پکا لیتی تھی۔ روٹیاں ایک تنور سے لے آتی تھی۔ سال میں دو تین جوڑے بنوا لیتی تھی۔ لباس کی اُسے کبھی فکر نہیں ہوتی تھی۔ ہاں میٹھے چنوں سے عام طور پر اس کی جیبیں بھری رہتی تھیں اور یہ میٹھے چنے بچوں کے ہوتے تھے۔

یہ ساری باتیں تو عام سی تھیں۔ اماں کی ایک خاص بات بھی تھی۔ دن ہو یا رات اس کے گھر کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا تھا ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ وہ گھر میں ہو یا نہ ہو' دروازہ بند نہیں ہوتا تھا۔

یہ دروازہ کیوں کھلا رہتا تھا۔ اس کی وجہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھی اور کسی کو معلوم تھی بھی تو وہ بتاتا نہیں تھا۔

بچو! تم پوچھو گے کہ گھر کا دروازہ کھلا رکھنے میں اماں کو چوری کا ڈر نہیں تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں تھا۔ ڈر کیوں ہوتا بھلا محلے میں جتنے لوگ رہتے تھے وہ سب کے سب اماں سے محبت کرتے تھے اور کسی سے محبت کی جائے تو اسے کبھی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

اماں کے گھر میں تھا بھی کیا۔ دو چارپائیاں' دو پرانے کنستر' مٹی کے دو تین گھڑے' دو چار ٹرنک' کھانا پکانے کا سامان' اماں کے کپڑے' چند معمولی برتن' کسی کو ان چیزوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی اور پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ محلے کا ہر شخص اماں کی عزت کرتا تھا۔ اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ سب کے کام آتی تھی۔ کام کرنے میں اپنے آرام کا بالکل خیال نہیں کرتی تھی۔ بھلا کوئی اُسے تکلیف پہنچانے کا خیال بھی کر سکتا تھا؟

اماں ٹھیک ٹھاک چاق و چوبند تھی۔ اسے بہت کم بیمار دیکھا گیا تھا۔ بیمار رہتی بھی تھی تو بستر پر لیٹ جانے کی عادی قائل نہیں تھی۔ آدمی مناسب خوراک کھائے اور زیادہ سے زیادہ کام کرے تو بہت کم بیمار ہوتا ہے۔ یہی حالت اماں کی تھی، مگر دیکھو نا۔ آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کے اعضا ویسے نہیں رہتے جیسے جوانوں کے ہوتے ہیں۔ یہ بات

کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اماں کی عمر کتنی ہے، کسی نے کبھی اس سے ایسا سوال کیا ہی نہیں تھا، مگر ایسا ہوا کہ وہ کچھ دنوں سے تھکی تھکی رہنے لگی۔ محلے میں کسی کے ہاں بیاہ شادی کی خبر سُنتی تھی تو گھر میں بیٹھے رہنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا تھا۔ لیکن اب محلے میں دو شادیاں ہوئیں، ایک میں تو وہ گئی ہی نہیں، دوسری میں گئی تو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہر کر واپس گھر آ گئی۔

محلے کے بڑوں اور چھوٹوں کو اماں کی طرف سے کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ نہ جانے ان سب کے دلوں میں یہ یقین کیوں پیدا ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ بیمار کبھی نہیں ہوگی اور وہ اُسے جس طرح چاق و چوبند دیکھتے رہے ہیں۔ آئندہ بھی دیکھتے رہیں گے، مگر اماں کی حالت خراب سے خراب تر ہو گئی۔ اُسے اسپتال بھی لے گئے۔ چند روز کے بعد ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ اور محلے کے لوگ اُسے واپس اس کے گھر لے آئے۔

اتوار اور پیر کی درمیانی رات کو جب میاں صاحب بھی اماں کے یہاں موجود تھے، وہ دنیا سے چلی گئی۔

سب کو بڑا دُکھ ہُوا۔ خاص طور پر بچے تو زار و قطار رو رہے تھے، جیسے اُن کی بہت ہی عزیز ہستی فوت ہو گئی ہے۔

صبح اماں کو دفن کر دیا گیا۔ اس وقت یہ سوال اُٹھا کہ اماں کے گھر میں رہے گا کون؟ اماں کا اپنا تو کوئی عزیز تھا نہیں میاں جی نے اعلان کر دیا کہ جو بھی بشیراں کے گھر میں رہنا چاہتا ہے اُسے گھر کا دروازہ کُھلا رکھنا پڑے گا۔ جیسا کہ اُس کی زندگی میں کُھلا رہا ہے۔

یہ معاملہ سب کے لیے ایک معمّہ بن گیا تھا۔

"آخر دروازہ کیوں کُھلا رکھا جائے؟" محلے کے ایک بزرگ آدمی نے میاں صاحب سے دریافت کیا۔

میاں صاحب نے جواب دیا۔

"اس لیے کُھلا رکھا جائے کہ بشیراں کی زندگی میں یہ دروازہ رات دن کُھلا رہا ہے! اور یہ بشیراں کی وصیت ہے۔"

"مگر میاں صاحب! ایسا کیوں ہے؟"

"اماں بشیراں کی یہ مرضی کیوں تھی؟" ایک اور صاحب نے پوچھا۔ میاں صاحب نے اس سوال کا جواب دینے کی بجائے پوچھا۔

"تو کون بشیراں کے گھر میں رہنے کے لیے تیار ہے!"

کوئی بھی یہ شرط پوری کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میاں جی نے کہا۔ "اگر کوئی تیار نہیں ہے تو میں رہوں گا۔"

یہ بات کسی کو بھی پسند نہیں تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میاں جی خود بڑے کمزور اور ضعیف ہو چکے تھے۔ انھیں اماں کے گھر میں آئے ابھی ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا ہو گا کہ شفیع جو اماں کی دکان پر بیٹھا کرتا تھا۔ میاں جی کے پاس آیا اور بولا

"میاں جی! میری ماں نے اجازت دے دی ہے کہ اماں کے گھر میں رہوں!"

"دروازہ کھلا رکھو گے؟" میاں جی نے سوال کیا۔

"جی ہاں"۔

"دیکھ لو بڑا مشکل کام ہے۔ کر سکو گے؟"

"انشاءاللہ کر لوں گا"۔

تو اماں بشیراں کے مکان میں شفیع آ گیا۔

اوّل تو اماں کے مکان میں بہت ہی معمولی سامان تھا۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ اس میں سے کوئی چیز چوری کر کے سارے محلے میں بدنام ہو جاتا۔ پھر شفیع کی دکان ایسی جگہ واقع تھی کہ جب تک دکان پر رہتا تھا اماں کا گھر اس کے سامنے رہتا تھا۔ اور لوگوں کو اس کا بھی علم تھا۔

جب کوئی معاملہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کے بارے میں افواہیں اڑنے لگتی ہیں۔ اماں کے گھر کا دروازہ جو کھلا رہتا تھا یہ ایک ایسا معاملہ تھا جسے کوئی سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔ ایک یہ افواہ اڑی کہ اماں کو ڈر رہتا تھا کہ اس کا ایک دشمن اسے آ کر مار نہ دے۔ اس لیے وہ رات کے وقت گھر سے نکل کر کہیں چلی جاتی تھی۔ اور دروازہ کھلا رکھتی تھی کہ دشمن سمجھے کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ کوئی کہتا تھا اماں کو کسی کا انتظار تھا جو نہیں آیا تھا۔ اسی قسم کی اور افواہیں بھی پھیلتی رہتی تھیں۔ پچیس ۲۵ دن ہوئے تھے اور ان پچیس ۲۵ دنوں میں شفیع نے میاں جی کے کہنے کے مطابق دروازہ رات دن کھلا رکھا تھا۔ وہ خود سوچتا رہتا تھا کہ دروازہ کھلا رکھنے کا مطلب کیا ہے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

ایک رات وہ سویا تھا کہ میاں جی کے نوکر نے اسے جگا کر کہا۔

"اٹھو میاں جی تمھیں بلاتے ہیں"۔

وہ فوراً اٹھ کر نوکر کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

وہاں پہنچا تو میاں جی پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ اور ان کے اردگرد گھر کے اکثر لوگ نظر آ رہے تھے۔ شفیع کو دیکھتے ہی انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح ہلائے جیسے کہہ رہے ہوں تم لوگ چلے جاؤ۔

وہ چلے گئے تو میاں جی نے شفیع کو قریب آنے کے لیے کہا وہ آ گیا تو کمزور آواز میں کہنے لگے۔

"دیکھو بیٹا! اب میں زندہ نہیں رہوں گا۔۔۔ تم کو بتا دینا چاہتا ہوں۔۔۔ کہ بشیراں نے کیوں گھر کا دروازہ رات دن۔۔۔ کھلا رکھنے کے لیے کہا تھا۔۔۔ سنو بیٹا! یہ بڑی پرانی بات ہے۔ بشیراں کی کوئی اولاد نہیں تھی۔۔۔ جب اس کا شوہر مر گیا تو اس نے۔۔۔ اپنی دور کی ایک بہن کے بیٹے کو اپنا بیٹا بنا لیا۔۔۔ بشیراں نے اسے بڑا پیار دیا، مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ یہ لڑکا بری صحبت میں۔۔۔ پڑ کر آوارہ گرد ہو گیا۔۔۔ بشیراں نے اپنی طرف سے اسے سدھارنے کی بہت کوشش کی مگر

یہ سُدھر نہ سکا۔ ایک رات اس کی ماں سے ۔۔۔ سخت تلخ کلامی ہوئی اور گھر چھوڑ کر جانے لگا۔
بشیراں نے رو رو کر اُسے روکنے کی کوشش کی، لیکن یہ دروازے سے باہر جانے لگا۔ وہ بولی "بیٹا! خدا کے لیے نہ جاؤ۔ وہ نہ رُکا تو آخری بار بولی۔ جا رہے ہو پَر اس گھر کا دروازہ تمھارے لیے دِن رات کھُلا رہے گا۔۔۔ آجانا ۔۔۔ میرے بیٹے آجانا ۔۔۔"

اور وہ یہ کہہ کر چلا گیا "زندگی میں ایک بار ضرور آؤں گا۔"

میاں جی سے آگے بولا نہیں جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے کہنے لگے۔

"تم کو ۔۔۔ میں نے ۔۔۔ سچی بات ۔۔۔ بتا دی ہے۔ وہ کسی روز آئے گا ۔۔۔ مکان اس ۔۔۔ کے حوالے ۔۔۔ کر دینا۔ اللہ تمھیں سدا ۔۔۔ خوش رکھے۔"

میاں جی نے شفیع کو چلے جانے کا اشارہ کیا اور وہ چلا گیا۔ دو روز بعد میاں جی فوت ہو گئے۔

اس کے بعد شفیع کو ایسا لگا جیسے کسی روز وہ اماں کا وہ بیٹا ضرور آجائے گا۔ وہ اس کا بے تابی سے انتظار کرتا رہتا تھا۔

ایک دن وہ دکان کے لیے سامان خریدنے کے لیے چلا گیا اور گھر میں اپنے ایک دوست کو بٹھا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک شخص آیا، پتلا دُبلا، بال بُری طرح بڑھے ہوئے۔ لباس میلا اور گندا۔ مکان کے دروازے پر پہنچ کر وہ ذرا رُکا پھر اندر آگیا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

"کون ہو تم؟" شفیع کے دوست نے پوچھا۔

"وہ جس کے لیے دروازہ کھُلا ہے ۔۔۔ میری ماں کہاں ہے؟"

"وہ تو مَر گئی تھی۔"

"مَر گئی تھی ۔۔۔؟" اور وہ تیورا کر گر پڑا ۔۔۔ اور جب شفیع آیا تو وہ آخری سانس لے رہا تھا اور چند لمحوں بعد مَر گیا۔

جواب :۔ انعامی معمّہ

① میڑین ② کریپ ایپل ③ سن فلاور ④ ہارن پائپ ⑤ بک درم

گزشتہ شمارے میں ایک انعامی معمّہ شائع کیا گیا تھا اور قارئین کو اس کا درست جواب دینے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس معمّے میں ساتھیوں نے کافی جوش و خروش سے حصّہ لیا، مگر بہت کم ساتھی درست جواب دے سکے۔ درست جوابات ارسال کرنے والوں میں سے بذریعہ قرعہ اندازی رسلیم اقبال۔ ناظم آباد، کراچی / منتخب ہوئے انھیں ان کا انعام روانہ کیا جا رہا ہے۔

انعام حاصل کرنے پر ادارہ "آنکھ مچولی" کی طرف سے آپ کو بہت بہت مبارک باد!

پروفیسر عنایت علی خان

ٹیوٹر نامہ

یُوں تو "ٹر" ماسٹرا اور ٹیوٹر دونوں کے ساتھ لگی ہوئی ہے مگر ماسٹر کی ٹر کمرۂ جماعت تک محدود رہتی ہے۔ جب کہ ٹیوٹر کی ٹر گھر گھر اور در در، ماری ماری پھرتی ہے۔ عموماً پہلے لوگ ماسٹر بنتے ہیں پھر ٹیوٹر اور آج کل تو عموماً ماسٹر ٹیوٹری کے جملہ حقوق اپنے ہی لیے محفوظ کر لیتے ہیں۔ اس سے دونوں کو فائدہ ہوتا ہے ماسٹروں کو تنخواہ سے دگنی آمدنی کی شکل میں اور شاگردوں کو امتحانوں میں اچھے نمبروں کی شکل میں۔

لیکن میری ٹیوٹری کا زمانہ وہ تھا جب ماسٹر ٹیوشن پڑھانا اور شاگرد ٹیوشن پڑھنا عیب سمجھتے تھے اور یہ دونوں کام عموماً چھپا کر کیے جاتے تھے۔ یہ صورتِ حال ضرورتمند شاگردوں کے لیے ٹیوٹر بن جانے کے مواقع فراہم کر دیتی تھی چنانچہ میں بھی نویں جماعت میں ٹیوٹر بن گیا تھا پہلی ٹیوشن راشن ڈپو والے کے بچے کی ملی تھی جس سے پانچ روپے ماہوار ملتے تھے جو حالات کے لحاظ سے ایک معقول رقم تھی پھر شاگرد کی زبان سے "سَر اور اس کے والد

کی زبان سے "ماس صاحب" کے الفاظ ایک نشے کی سی کیفیت رکھتے تھے۔ وقت گزرتا گیا اور ٹیوشن کا سلسلہ بھی دراز ہوتا گیا پانچ روپے سے شروع ہو کر ٹیوشن سو روپے تک پہنچی اور شہر کا کوئی کھونٹ اور محلّے کی کوئی سڑک ایسی نہ بچی جس کے کسی نہ کسی گھر پہ میری ٹیوٹری کی مُہر نہ لگی ہو۔

آج یادوں کے جھروکے سے اپنے ٹیوٹری کے دور پر نظر دوڑاتا ہوں تو کئی معصوم چہرے معہ اپنے انواع و اقسام کے سرپرستوں کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ آیئے یادوں کی اس آنکھ مچولی میں آپ کو بھی شریک کر لوں۔

یہ میری دوسری ٹیوشن ہے اور فیس ایک دم ڈبل یعنی دس روپے! میں پورے مہینے دس روپے کی رقم خرچ کرنے کے بارے میں نت نئے منصوبے بناتا ہوں اشیاء کی ایک طویل فہرست ہے جس میں روزانہ ردّوبدل ہوتی رہتی ہے۔ تبّت سنو کی شیشی۔ کف کے چمکدار بٹن۔ فونٹن پین۔ رنگوں کا ڈبہ۔ پیٹھے کی مٹھائی۔ بصرے کی کھجوریں اکنّی ایک سیر۔ اور یہ ساری اشیا۔ دس نہیں پانچ روپے میں خریدنی تھیں کیوں کہ پانچ روپے تو گھر والوں کو دینے ہیں۔۔۔ چھوٹے بہن بھائیوں کو دی جانے والی رقم میں بھی روزانہ کچھ نہ کچھ ردّوبدل ہوتی رہتی۔۔۔ سب کو ایک ایک آنہ کافی ہوگا۔۔۔ نہیں دو دو آنے۔۔۔ اگر دو دو آنے دے دیے تو پھر کتنے پیسے بچیں گے۔۔۔؟ اگلے مہینے بھی تو دُوں گا! ایک ایک آنہ ہی کافی ہوگا۔۔۔! پھر کراچی سینیٹوریم میں زیرِ علاج بڑے بھائی کا خیال آتا تو ان کی ساری شفقتیں یاد آجاتی ہیں۔۔۔ بیماری میں ڈاکٹر کو لانا، گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود ان سے چھُپ کر فُٹبال میچ دیکھنے چلنے کی ضد پوری کرنا۔ گزشتہ منی آرڈر کی رسید پر لکھا ہُوا اُن کا وہ شعر یاد آکر آنکھیں بھگو دیتا ہے۔

ہم تو خزاں رسید جوانی کو رو چکے تم سے جو ہو سکے تو بُلا لو بہار کو

پھر اُن دس روپوں کے لیے بچّوں کے باپ کی دُکان کے چکّر دس تاریخ کو اُس کا کہنا کہ "ماسٹر کیا آج پڑھانے نہیں گئے تھے۔ پیسے تو میں گھر پر دے آیا تھا" اور گھر آکر معلوم کرنے پر براہِ راست بچّوں کی ماں کے الفاظ۔۔۔ وہ الفاظ آج بھی یاد ہیں۔

"ماسٹر صاب کیا کئی اُس نے۔۔۔؟ مُجھے دے گیا ئے۔۔۔ آرام جیادہ (اس لفظ کے معنی فوراً سمجھ میں نہیں آئے تھے) جھُونٹ بکے ہے۔۔۔ کوئی دے کے نئیں گیا" یہ سُن کر غُصّے سے کہہ کر چلے آنا کہ "میں کل نہیں آؤں گا" لیکن دوسرے روز وقت سے کچھ پہلے ہی اس خوف سے جا پہنچتا کہ پیسے ڈوب ہی نہ جائیں۔ اور پھر اُنہی پرائمری کے دو بچّوں کا وہ واقعہ۔۔۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو پورا سین ذہن کے پردے پر اُبھر آتا ہے۔ بچّی کی اُنگلی پکڑ کر قاعدے کے حروف پڑھا رہا ہوں، بچّہ اس کے برابر والی کُرسی پر بیٹھا پہاڑا یاد کر رہا ہے۔۔۔ "سات اَٹھے چھپّن۔۔۔ سات اَٹھے چھپّن۔۔۔"

اتنے میں ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ دھڑام سے کُھلتا ہے اور بچّوں کے نانا اپنے نصف جسم پر تولیہ لپیٹے

اس حالت میں سامنے آتے ہیں کہ بدن بھیگا ہوا ہے اور کہیں کہیں صابن کے جھاگ بھی پھپھوندکی طرح بدن پر لگے ہوئے ہیں سُکڑی ہوئی کھال کی نیچے سے گوری اور اُوپر سے کالی انگلی نواسے کی طرف اُٹھا کر ڈانٹنے کے انداز میں مجھ سے فرما رہے ہیں: "ماشٹر سُن نئیں رئے چھورا کیا کے ریائے؟"

"پہاڑا یاد کر رہا ہے آٹھ کا!" میں سوالیہ نظروں سے اُنھیں دیکھ کر جواب دیتا ہوں۔

"کے کیا ریائے یہ بی سُن رے ہو؟" وہ پھر اُسی طنزیہ لہجے میں کہتے ہیں...

"سات اٹھے چھپّن کہہ رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟ کیا کہے اور؟ آپ بتلا دیجیے۔" میں غُصّے سے جواب دیتا ہُوں۔

"ٹھیک کے ریائے؟" وہ ہاتھ کے اشارے سے یقین حاصل کرنے کے انداز سے کہتے ہیں۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میں اسی لہجے میں جواب دیتا ہوں۔ وہ واپس دروازے کی طرف مُڑتے ہوئے فرماتے ہیں... "میں نے کیا کئیں گلت نئیں پڑ ریا ہو۔"

ایک اور منظر ذہن کے پردے پر نمایاں ہوتا ہے۔ میں ایک گیراج میں بیٹھا ہوں جس کا ایک دروازہ مکان کے کمرے میں کھُلتا ہے۔ اس دروازے کے سامنے ایک گوراچِٹّا منحنی سا بچہ بیٹھا ہے۔ یہ بچّہ اُن ہیڈ کلرک صاحب کا ہے جنھوں نے ایک اُستادِ مُحترم کی سفارش پر مجھے اپنے دفتر میں کلرک رکھوایا ہے پوری تنخواہ پر۔ جبکہ اس سے پہلے میں ورک چارج پر مزدوروں میں نام لِکھوا کر محکمۂ تعمیرات کے ایک دفتر میں تیس روپے ماہوار پہ کام کر تا رہا ہوں۔ اب تنخواہ چھیاسٹھ روپے ملے گی۔ کیا ہُوا اگر ایک گھنٹہ بچّے کو پڑھا دوں گا۔ ہیڈ کلرک صاحب کا احسان اُتر جائے گا۔ پھر... پھر شاید کچھ پیسے بھی دے دیں۔ وہ تو ہیڈ کلرک ہیں۔ ان کے پاس پیسوں کی کیا کمی ہے۔ پیسے نہ بھی دیں تو دفتر میں خیال تو رکھیں گے... کتنے مہربان ہیں! میں نے اُن کا کہنا بھی نہیں مانا تھا۔ اور چہرے پر نظر آنے والے روئیں کو نائی سے صاف کرائے بغیر ہی چلا گیا تھا۔ پھر بھی اُنھوں نے بڑے افسر سے کہہ کر نوکری دلوادی تھی۔ بغیر کوئی رشوت لیے... نہیں نہیں اگر وہ فیس دیں گے تو بھی نہیں لُوں گا... تنخواہ جو ملے گی پورے چھیاسٹھ روپے۔ اماں کیسی خوش ہوں گی! اندرونی دروازے سے ہیڈ کلرک صاحب کی مخصوص آواز اُبھر کر خیالات کا سلسلہ منقطع کر تی ہے... "بھانگ گیاں کیا وُوں ماسٹر؟"

بچّہ پہلے منہ اُٹھا کر میری طرف دیکھتا ہے پھر بائیں جانب مُڑ کر اپنے والد کی طرف دیکھتا ہے اور پھر شرمندگی سے سر جھکا کر انکار میں سر ہلا تا ہے۔ اندر سے آواز آتی ہے: "اچھّاں، اچھّاں تشریف رکھتے ہیں ایں ماسٹر صاحب؟ ایں مھبئیں سنوں، ماسٹر صاحب کیس لئیں جائیں بھینجو..." اور اُس روز چائے پیتے ہوئے پہلی بار "زہر کے گھونٹ پینا" کے معنی واضح ہوتے ہیں۔

ابنِ شہباز خان

کسی کام میں دل کیوں نہیں لگتا؟

(۱)

بالآخر مس نے جاوید سے پوچھ لیا کہ آج وہ ذہنی طور پر کلاس سے غیر حاضر کیوں ہے؟ سبق پڑھاتے ہوئے وہ مسلسل نوٹ کر رہی تھیں کہ جاوید یکایک خلا میں کسی نامعلوم شے کو گھورنے لگتا ہے اور ذہنی طور پر کلاس سے غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی تصدیق یوں ہو گئی کہ جب انھوں نے یکدم جاوید کو مخاطب کیا تو اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب مس نے دوبارہ اُس کا نام پکارا تو وہ ہڑبڑا سا گیا۔ اور خالی خالی نگاہوں سے مس کو دیکھنے لگا۔ جب مس نے پوچھا کہ بتائیے، میں کیا پڑھا رہی تھی؟ تو وہ نہ بتا سکا۔

(۲)

جھلاّ کر مہناز نے کشیدہ کاری کا فریم دُور پھینک دیا۔ وہ گزشتہ ایک گھنٹے سے کپڑے پر خوبصورت پھُول کاڑھنے کی کوشش کر رہی تھی، مگر پھُول کے بجائے کچھ اور ہی بن جاتا تھا۔ کتنی ہی بار تو سُوئی اُس کی اُنگلی میں چُبھ گئی تھی۔ اُس نے سوچا، چلو ہوم ورک کر لوں، مگر جب وہ کاپیاں کتابیں کھول کر بیٹھی تو اُس سے لکھا ہی نہ گیا۔ اُس نے پہلا جُملہ ہی اتنا بدخط لکھا کہ اسے دیکھ کر اُس کا دل مزید لکھنے سے اُچاٹ ہو گیا اور اُس نے کاپیاں کتابیں دوبارہ بستے میں رکھ دیں۔

فائل محمود صاحب کے سامنے دھری تھی، مگر اُسے کھول کر پڑھنے یا اس میں کچھ لکھنے کو اُن کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کتنی ہی دفعہ انھوں نے فائل اُٹھائی اور دوبارہ رکھ دی۔ کل جو ادھورا کام وہ چھوڑ گئے تھے، یہ سوچ کر کہ آج آکر اُسے مکمل کرلیں گے، وہ بھی بدستور ایسے ہی پڑا تھا۔ آفس کے ساتھیوں سے بھی آج وہ بہت کم بات کر رہے تھے، بلکہ اُن کا دل چاہ رہا تھا کہ آج آفس کے ساتھی اُن سے کوئی بات نہ کریں۔ گھر سے بیگم کا فون آیا تو اُن سے بھی ہوں ہاں کرتے رہے اور پھر انھیں ڈانٹ کر فون بند کر دیا۔

مندرجہ بالا تین واقعات پڑھ کر آپ کیا سمجھے؟... کچھ بھی نہیں۔ تو آیئے، ہم آپ کو ان کا پس منظر بتاتے ہیں۔

● جاوید کا کلاس میں ٹیسٹ ہُوا تھا، جس میں وہ فیل ہوگیا۔ اس واقعے کا اُس نے شدید اثر لیا۔ اگلے دن جب وہ اسکول آیا تو کلاس میں سارا وقت کل کی ناکامی اُس کے ذہن پر مسلّط رہی اور ٹیسٹ میں فیل ہونے کا خیال بار بار اُسے پریشان کرتا رہا۔ جس سے وہ ذہنی افسردگی اور پژمُردگی کا شکار ہوگیا۔

● مہناز نے اپنی امّی سے ضد کی کہ آج برتن وہ دھوئے گی۔ امّی مان گئیں اور مہناز بڑے شوق سے برتن دھونے بیٹھ گئی، مگر اُس سے چینی کی ایک پلیٹ ٹوٹ گئی، جس پر امّی نے اُسے سب کے سامنے ڈانٹا اور کڑی تنقید کی۔ مہناز نے اس بات کو بہت محسوس کیا کہ سب کے سامنے اُس کی بے عزّتی ہوئی اور امّی کی تنقید سے اُسے بار بار یہ خیال آتا رہا کہ وہ کوئی بھی کام صحیح طریقے سے کرنے کی اہل نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے افسردگی اور پژمُردگی کا شکار ہو کر وہ ہر کام میں غلطی کرنے لگی۔

● محمود صاحب اتفاق سے آفس بھی دیر سے آئے اور کام میں اُن سے کچھ غلطی بھی ہوگئی۔ جس پر باس نے اُن کو بُری طرح ڈانٹ دیا اور سخت سُست کہا۔ جس کے بعد محمود صاحب کو مسلسل یہ خیال ستا رہا کہ وہ ایک ناکام آدمی ہیں۔ آفس بھی وقت پر نہیں آتے اور کام بھی سلیقے سے نہیں کرتے اور اُن پر مایوسی طاری ہوتی گئی۔ انھیں بار بار اپنی غلطی کا احساس ہوتا رہا۔

جس کی وجہ سے وہ شدید ذہنی افسردگی اور پژمُردگی کا شکار ہو گئے اور اُن کا دل کام سے اُچاٹ ہو گیا۔

ذہنی افسردگی اور پژمُردگی کارکردگی پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ تو آپ نے دیکھ لیا۔ یہ ہے کیا چیز؟ اور ماہرین اس کے متعلق کیا کہتے ہیں؟ اب ہم اس کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ دُنیا بھر میں سائنسدان مختلف چیزوں پر تحقیق اور تجربات کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک انسانی جسم اور اس کی مختلف کیفیات بھی ہیں۔ اسی حوالے سے مغربی جرمنی کے شہر میونخ میں میکس پلانک کے ادارۂ نفسیات میں سائنس دانوں نے تحقیق کی کہ لوگوں کی کارکردگی میں کسی ظاہری خامی کے باوجود کیوں کمی آجاتی ہے؟ اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ذہنی افسردگی اور پژمُردگی کی وجہ سے انسانی کارکردگی اور بعض اوقات یادداشت بھی وقتی طور پر متاثر ہو جاتی ہے۔ افسردگی اور پژمُردگی کی دیگر وجوہ کے علاوہ ایک اہم سبب کسی کام یا منصوبے میں ناکامی بھی ہوتا ہے۔ میونخ کے اس ادارۂ نفسیات کے سربراہ پروفیسر جولیس کوہل کا کہنا ہے کہ متعلقہ شخص اپنی ناکامی کو بھلانے میں ناکام رہتا ہے۔ اسی لیے وہ کسی مقصد کے حصول یا اچھا کام کرنے کی خواہش کے باوجود اپنی کارکردگی کا صحیح جائزہ نہیں لے پاتا اور اپنا کام بے دِلی سے کرتا ہے، یا اس میں غلطی کر جاتا ہے۔

افسردگی اور پژمُردگی کے شکار لوگوں پر ایک تجربہ کیا گیا۔ انھیں ذہن نشیں کرنے کے لیے مختلف الفاظ کی فہرست دی گئی۔ انھیں اس کے دُہرانے میں خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کا ذہن گزشتہ ناکامی کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکا تھا۔ دراصل ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا یوں ہے کہ جب انھیں کوئی نیا کام سونپا جائے تو ان کے ذہن میں وقفے وقفے سے ایسے خیالات اور نظریات آتے رہتے ہیں، جو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے ہوں۔ یا جو بعض صورتوں میں قطعاً ناقابلِ عمل ہوں۔ اس کیفیت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ متعلقہ شخص اپنے نئے کام یا ذمّہ داری پر پوری توجّہ مرتکز نہیں کر پاتا اور اس کی کارکردگی متاثر ہو جاتی ہے۔

کیا اس کیفیت سے کبھی آپ کا سامنا ہوا ہے؟ یا ایسی صورتِ حال سے آپ دوچار ہوتے ہیں؟ اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو آپ کو ہمارا مشورہ ہے کہ ایسی صورت میں آپ اپنی غلطی یا ناکامی کو بھلانے کی کوشش کیجیے اور اپنی سابقہ کامیابیوں اور اچھی کارکردگی کو تصوّر میں لائیے۔ ساتھ ہی کسی کام میں بڑی شدّومد سے مصروف ہو جائیے، آپ ذہنی افسردگی اور پژمُردگی کے حملے سے محفوظ رہیں گے۔!

Goldfish
Deluxe Pencil

حقیر سی لکیر

حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی

گولڈ فِش ڈیلیکس پینسل

SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E. MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PHONE: 293451

جہاں چلے، رواں چلے

BOND

ہوائی جہاز

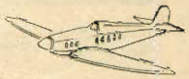

شبنم کارڈاری

بلندی پہ تیزی سے اڑتا ہوا　　وہ مانندِ شاہیں گزرتا ہوا
وہ دیکھو ہوائی جہاز آ گیا　　فضا میں یہ لوہے کا باز آ گیا

ذرا دیکھئے ہے یہ فولاد کا　　ہوا میں مگر ہے اڑا جا رہا
نہیں ہے نہیں ہے یہ جادو گری　　فقط یہ عقل کی ہے کاریگری

کرشمہ ہے دیکھو یہ ایجاد کا　　مکاں ایک اڑتا ہے فولاد کا
اڑے ساتھ لے کے یہ انسان کو　　مسافر کی چیزوں کو سامان کو

یہ چلتا نہیں سحر کے بول سے　　مشین اس کی چلتی ہے پٹرول سے
فضا گونج اٹھتی ہے آواز سے　　بڑا شور اٹھتا ہے پرواز سے

بجاتا ہوا ساز جاتا ہے جب　　مکانوں سے بچے نکلتے ہیں تب
نگاہوں سے ہوتا ہے اوجھل جبھی　　اسے دیکھتے ہیں وہاں تک سبھی

بنائی گئی ہے بڑی تیز شے　　سفر ہو ہزاروں کا گھنٹوں میں طے
بہت جلد جس کو پہنچنا ہے دور　　سفر اس میں اپنا کرے وہ ضرور

اسے پل کے پل میں یہ لیجائے گا　　تمہیں اپنی منزل پہ پہنچائے گا

اسے پہلے ایجاد جس نے کیا
اک احسان دنیا پہ اس نے کیا !!

بظاہر دونوں تصاویر ایک جیسی نظر آتی ہیں مگر مصوّر نے زیرِ نظر تصاویر میں جان بُوجھ کر کچھ غلطیاں کی ہیں ذرا انہیں تین منٹ میں تلاش کریں۔ اگر آپ نے مقررہ مدّت میں غلطیاں تلاش کرلیں تو یقیناً آپ ایک ذہین آدمی ہیں۔

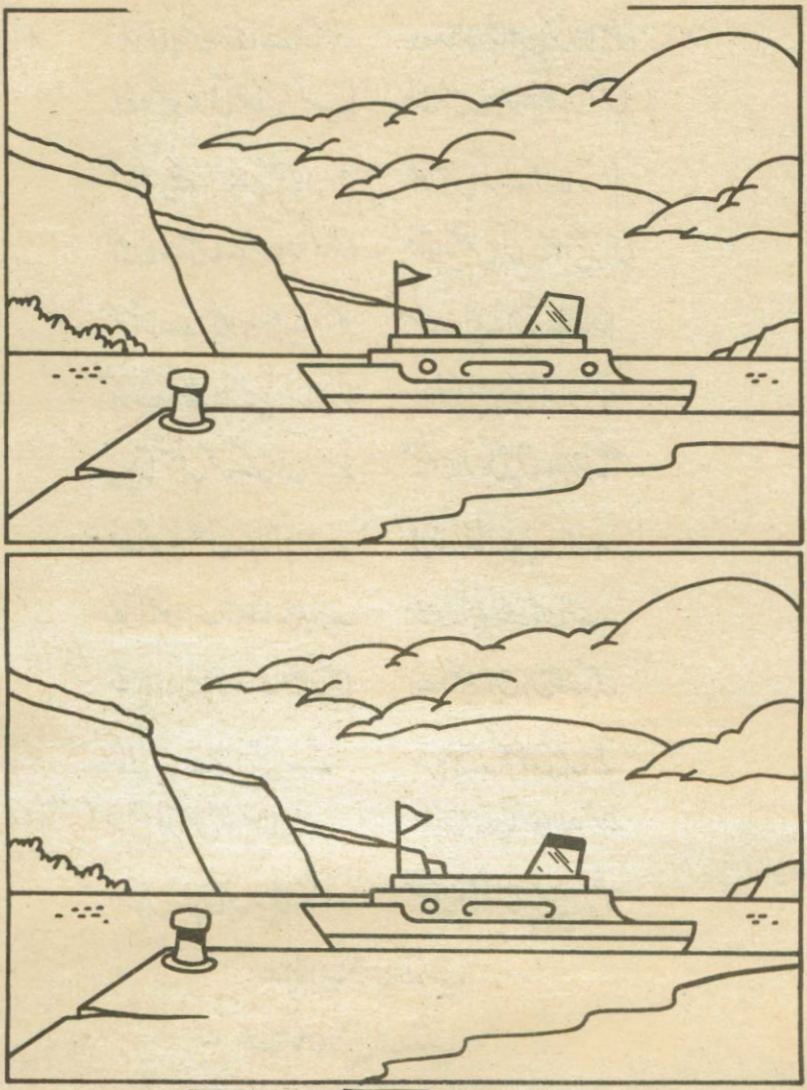

قسط نمبر ۷

ستیہ جیت رے
ترجمہ : آصف فرخی

تلاش

اُس کی آنکھ کُھلی تو اُس پر انکشاف ہُوا کہ اُسے کچھ یاد نہیں۔ وہ اُس وقت سڑک کے کنارے ایک جنگل میں پڑا تھا اور اُس کے سر پر چوٹ آئی تھی۔ وہ اُٹھا اور گھسٹتا ہوا آگے بڑھا تو اُسے ایک ٹوٹی پھوٹی گاڑی نظر آئی، جس کی اگلی اور عقبی سیٹ پر دو آدمی ساکت پڑے ہوئے تھے۔ وہاں سے وہ آگے چلا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اُسے کچھ یاد کیوں نہیں آ رہا ہے؟ راستے میں پیڑوں پر بنے ہوئے سیاہ اور سفید حلقوں کو سمجھنے کی کوشش سے اُس کا سر شدت سے درد کرنے لگا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ ہوش میں آنے پر اُس نے دیکھا کہ ایک آدمی اُسے دُودھ پیش کر رہا ہے۔ اُس آدمی نے اُس کا نام پوچھا تو وہ نہ بتا سکا۔ ایک اور آدمی کے مشورے پر اُسے پولیس اسٹیشن لے جایا جانے لگا۔ راستے بھر وہ لوگ اُس سے مختلف سوال کرتے رہے، مگر وہ ایک بات کا بھی جواب نہ دے سکا۔ وہ لوگ اُسے ایک ڈاکٹر کے پاس مرہم پٹّی کے لیے لے گئے، جہاں سے وہ غسل خانے کے راستے فرار ہوگیا۔ بھاگتے بھاگتے وہ ریل کی پٹڑی پر جا نکلا اور وہاں سے ایک اسٹیشن پہنچ گیا۔ ریل گاڑی آئی تو وہ اس میں سوار ہونے لگا۔ مگر بھیڑ ہونے کی وجہ سے سوار نہ ہو سکا اور ریل چل پڑی۔ وہ ریل کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا اور ایک کھلے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔ اُسی وقت اندر سے ایک بازو نکلا اور کسی نے اُسے اندر گھسیٹ لیا۔ اندر گھسیٹنے والے شخص نے بھی اس سے بہت سے سوال کیے، مگر وہ اسے بھی کچھ نہ بتا سکا۔ ہاں البتہ اس نے اپنا ایک فرضی نام ارمان احمد جمال بتایا۔ اس شخص کا نام ہارون الرشید تھا اور وہ ایک بازی گر تھا اور کرتب دکھاتا تھا۔ ہارون نے اُس سے کہا کہ وہ اُسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ دوسری طرف ملک کے مشہور وکیل احمد علی دانیال اپنے بیٹے ببلو کی گمشدگی کے سلسلے میں انسپکٹر سے بات کر رہے تھے۔ انسپکٹر نے بتایا

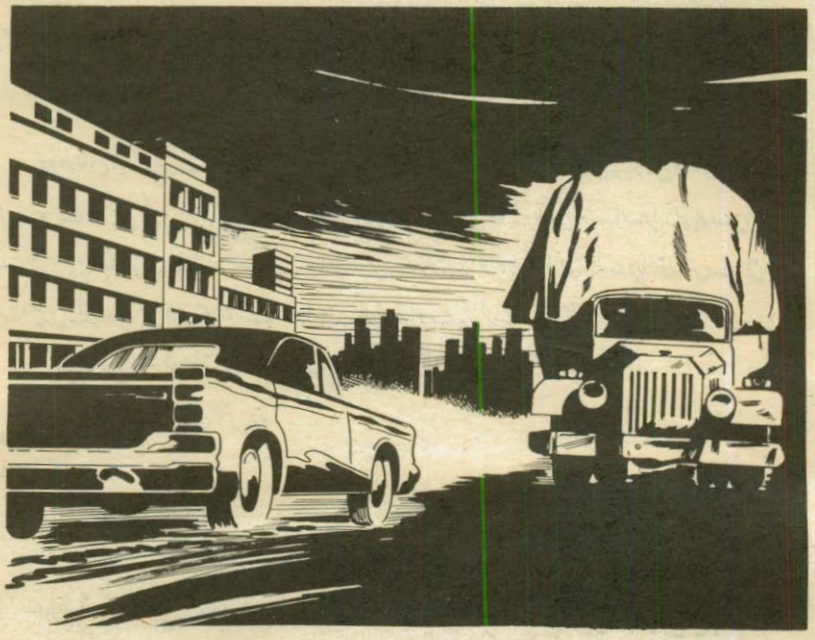

کچار آدمیوں نے ببلو کو اغوا کیا، راستے میں ان کی گاڑی کی ٹرک سے ٹکر ہوگئی۔ دو آدمی وہیں مر گئے اور دو آدمی سیمسن اور رگھوناتھ بھاگ گئے۔ ببلو گاڑی سے دُور جاگرا تھا۔ دانیال صاحب نے اس بات پر یقین نہیں کیا اور یہ کہہ کر انسپکٹر کے کمرے سے نکل آئے کہ اگر بدمعاشوں نے تاوان طلب کیا تو وہ رقم انھیں دے دیں گے۔ پھر پولیس مجرموں کو پکڑتی ہے یا نہیں، یہ اس کا اپنا مسئلہ ہے۔ وہاں سیمسن اور رگھوناتھ نے شمالی کلکتہ پہنچ کر حلیہ تبدیل کیا اور اُس بوڑھے نجومی کے پاس پہنچے، جس کے پاس وہ اغوا کی واردات کے متعلق زائچہ معلوم کرنے گئے تھے۔ انھوں نے اسے غلط پیش گوئی کرنے پر لتاڑا اور ڈرا دھمکا کر فیس میں دیے گئے دس روپوں کے بدلے اُس کی ساری جمع پونجی سمیٹ لے گئے۔ ادھر ہارون نے ارمان کو ابراہیم بابو کے ہوٹل میں ملازم رکھوا دیا۔ ارمان کچھ ہی دن میں اپنے کام میں مشاق ہوگیا۔ اب وہ تیزی سے گاہکوں کو چائے اور کھانا لا کر دیتا۔ وہ ابراہیم بابو کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اتوار کو اُس کی چھٹی ہوتی تھی۔ اس اتوار کو ہارون اُسے شہید مینار لے گیا، جہاں میلہ لگا تھا اور لوگ قسم قسم کے تماشے دکھا رہے تھے۔ ہارون نے بھی ایسے حیرت انگیز کرتب دکھائے کہ میلے کے سارے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس تماشے سے ہارون کو کافی آمدنی ہوئی۔ ارمان بدستور ابراہیم بابو کے پاس کام کرتا رہا۔ ایک دن ایک خوفناک شکل والا بدمعاش ایک معمولی شکل والے آدمی کے ساتھ ہوٹل میں آیا۔ اس نے ارمان سے اس کے متعلق کچھ سوالات کیے، جن کے ارمان نے اُلٹے سیدھے جواب دے کر جان چھڑائی۔ شام کے قریب ہارون اُسے اپنے ساتھ اپنا گھر دکھانے لے گیا۔ ارمان نے دیکھا کہ ہارون کا کمرہ بے شمار چیزوں سے سجا ہوا تھا۔ ہارون نے اُسے اپنی آپ بیتی سُنائی کہ وہ کس طرح بازی گر بنا؟ پھر اُس نے محلّے کے بچّوں کو ایک ساتھ پانچ گیندیں اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر تین چھُریاں اُچھالنے کا حیرت انگیز کرتب دکھایا۔ کرتب کے بعد ہارون نے ارمان کو بتایا کہ اُس نے دو مشکوک آدمیوں کو دیکھا ہے، جو اب بھی باہر گلی میں کھڑے ہیں۔ اُن کا حُلیہ سُن کر ارمان نے بتایا کہ وہ دونوں اُسے بھی چائے خانے میں ملے تھے۔ ہارون کا اندازہ تھا کہ وہ دونوں سیمسن اور رگھوناتھ ہیں جو گاڑی کے حادثے میں بچ گئے تھے۔ وہ ارمان کو پچھلے دروازے سے نکال لے گیا۔ وہاں احمد علی دانیال کے بنگلے میں اُن کے بیٹے ببلو کی گمشدگی کے سلسلے میں اجلاس ہو رہا تھا، جس میں انسپکٹر کے علاوہ اُن کے بیٹے بھی شریک تھے۔ انسپکٹر نے تجویز پیش کی کہ ببلو کی بازیابی کے لیے اخباروں میں اشتہار چھپا یا جائے، جس میں انعام کا بھی اعلان ہو۔ دانیال صاحب اس بات پر راضی ہوگئے۔ ہارون، ارمان کو ان دو بدمعاشوں سے بچا تو لے گیا تھا، مگر اُسے مسلسل یہ فکر لگی رہتی تھی کہ وہ ارمان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ ہارون نے اِس اتوار کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر کرتب دکھایا، مگر چونکہ اُس کا ذہن ارمان میں اُلجھا ہُوا تھا، اس لیے کرتب صحیح نہ ہوسکا اور لوگ ہنستے ہوئے چلے گئے۔ ارمان اور ہارون گھاس پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ ہارون نے وضاحت کی کہ ایسا کیوں ہُوا؟ اُس نے اپنا اندازہ بتایا کہ گاڑی کے حادثے کے بعد سیمسن اور رگھوناتھ جب ہوش میں آئے تو اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ارمان کو بھی مُردہ سمجھ کر چلے گئے، لیکن پھر ابراہیم بابو کے چائے خانے میں اُسے دیکھ کر اُنھیں گویا اپنا شکار پھر مل گیا۔ ابھی وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک آواز سُن کر چونک گئے۔ پلٹ کر دیکھا تو سیمسن اور رگھو کو کھڑے پایا۔ ہارون نے اپنے بازی گری کے تھیلے سے سیمسن پر وار کیا۔ اور وہ دونوں سرپٹ بھاگ نکلے۔ سیمسن اور رگھو بھی اُن کے پیچھے دوڑنے لگے۔ ہارون نے ایک ٹیکسی روکی اور وہ پھُرتی سے اس میں بیٹھ کر اُن دونوں سے دُور ہوتے چلے گئے۔ ارمان کے ذہن میں گاڑیوں کی روشنیاں گڈمڈ ہونے لگیں۔ یکایک اُس کے ذہن میں جھماکا سا ہُوا اور اُسے یاد آنے لگا کہ وہ کون ہے! اُس کا ماضی اس کی نظروں کے سامنے کسی فلم کی طرح چلنے لگا۔ اُس کی یادداشت واپس آچکی تھی!

اب آپ آگے پڑھیے!

وہ دونوں جیت پور کے ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے شوربا اور چپاتیاں کھا رہے تھے۔ ارمان کو معلوم تھا کہ اس سے پہلے وہ ایسی جگہ پر کبھی نہیں آیا تھا، اور ہارون نہ ہوتا تو اب بھی نہ آتا۔ ہارون کو اب ارمان کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ ارمان نے اُسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے سارے سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔ اس نے ان چار آدمیوں کے بارے میں بھی بتایا جو اُسے اسکول سے گھر آتے ہوئے پکڑ کر لے گئے تھے۔

"تم اپنے گھر کا راستہ بتا سکتے ہو؟" ہارون نے پوچھا۔ "وہ علاقہ میرا دیکھا ہوا نہیں ہے۔"

"بہت آرام سے۔" ارمان ہنس دیا۔

"ہوں۔"

ہارون تھوڑی دیر سوچتا رہا۔

"اب تو تمھیں گھر لے جانے کے لیے بہت دیر ہوگئی ہے۔" آخر وہ بول اُٹھا۔

"اور پھر تمہیں ذرا ٹھیک ٹھاک بھی تو کرنا ہوگا۔ تمھارے بال ذرا لمبے ہونے چاہئیں۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا ہے۔

کل صبح ایک صاف قمیص اور نیکر پہن لینا۔ میں سویرے آؤں گا۔ ابھی ابراہیم بھیاؔ کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ یہ میں بعد میں کرلوں گا۔"

ارمان کی سمجھ میں پوری طرح نہیں آیا۔ اُسے گھر تو جانا تھا۔ یہ تو واضح تھا۔ وہاں اُس کے ابّا تھے، اور دادی، اور ہری ناتھ، اس کا بوڑھا ملازم، جو اس کی دیکھ بھال کرتا تھا، اور اس کا ہر کام اس کے کہے بغیر کر دیتا تھا۔ اُس سے کبھی کبھی ارمان کو اُلجھن ہوتی تھی مگر ہری ناتھ بوڑھا تھا، اس لیے وہ اس سے کچھ نہ کہتا اور پھر اسکول تھا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر سکل صاحب، سعید چپراسی، مسٹر بخش جو کھیلوں کے نگراں تھے، اور اس کے ہم جماعت... اجلال عبید، کاشف علی۔ اُسے اسکول کی وہ پک نِک یاد آئی جس پر سب لوگ گئے تھے... اسٹیمر پر بیٹھ کر چاند پال گھاٹ اور بوٹینکل گارڈن سے دریا کی سیر۔

پھر اُسے ایک اور بات یاد آئی جو فوراً ہارون کو بتا دینی چاہیئے تھی۔

"ہمارے گھر میں نیچے کی طرف فالتو کمرہ ہے، ہارون بھیا، اُسے کوئی استعمال نہیں کرتا۔ ایک پُرانی الماری اور ٹوٹی ہوئی میز ہی بس اس میں پڑی ہوئی ہیں۔ انھیں وہاں سے نکال دیں گے اور آپ اس میں رہ سکتے ہیں۔"

ہارون نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر چپاتی کا نوالہ بنا کر منہ میں رکھتے ہوئے کہا "تمھارے ابا مجھے اس کمرے کو اُسی طرح سجانے دیں گے جیسے تم نے دیکھا تھا؟"

ارمان کو اپنے ابّا یاد آئے۔ اُسے یقین نہیں تھا کہ وہ ایسا کرنے دیں گے۔ مگر اُس نے کہا "کیوں نہیں؟ مجھے یقین ہے وہ کرنے دیں گے۔"

"بہت اچھا" ہارون نے کہا "پھر تمھارے ابا بھی فن کار ہوں گے۔ کیوں کہ صرف ایک فن کار ہی دوسرے فن کار کو سراہ سکتا ہے۔ خاص طور پر فن کار جب خلیفہ ہارون کا سا آدمی ہو۔"

ہر آدمی اخبار میں لکھی ہوئی ہر چیز نہیں پڑھتا۔ پچھلے صفحے کا وہ اشتہار بہت سے لوگوں کی نظر سے نہیں گزرا۔ کیوں کہ سنترا گاچی میں ریل کے ایک حادثے نے پہلے صفحے پر بہت جگہ لے رکھی تھی۔ جن لوگوں نے پڑھا بھی، وہ متفق تھے کہ اپنے بیٹے کی بازیابی کے لیے، بیرسٹر احمد علی دانیال نے جو انعام مقرر کیا ہے، وہ ان کے سماجی مرتبے کے شایانِ شان تھا۔ پانچ ہزار روپے کوئی مذاق نہیں۔

ابراہیم بابو نے وہ اشتہار نہیں دیکھا۔ ہارون اخبار کا باقاعدہ قاری نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی ناشتے کے وقت کبھی کبھار اس پر نظر ڈال لیا کرتا تھا۔ آج اس کا جی نہیں چاہا۔ وہ ساڑھے پانچ بجے اُٹھ گیا۔ جلدی جلدی چائے پی اور سات بجے تک ارمان کے پاس پہنچ گیا ارمان اُس لڑکے کا نام نہیں تھا، لیکن ہارون کے لیے ارمان، ارمان ہی تھا نادر نہیں، ببلو نہیں، سانیال بھی نہیں۔ ارمان احمد جمال اس لڑکے کا نام تھا۔

ابراہیم بابو نے پوچھا کہ وہ اُسے کہاں لیے جا رہا ہے ؟

"صاحب لوگوں کے محلے میں۔" ہارون نے جواب دیا۔" واپس آکر تمھیں سب بتاؤں گا۔"

ابراہیم بابو کو معلوم تھا کہ ہارون کبھی کبھار ایسی باتیں کرتا ہے، مگر وہ اُسے پسند کرتے تھے، کیوں کہ وہ بھلا آدمی تھا۔ انھیں ارمان کے جانے پر اعتراض نہیں تھا۔ انھوں نے کیستو کے بیٹے سوتو کو پکارا "وہاں کھڑے کھڑے جمائیاں مت لیے جاؤ۔ منہ ہاتھ دھو لو اور تیار ہو جاؤ۔ ابھی بہت کام پڑا ہے۔"

احمد علی دانیال اپنے کلرک بابو کی طرف مُڑے۔

"آج کل چھپائی اور کاغذ کا معیار افسوسناک ہے۔" انھوں نے کہا۔" بلو کی تصویر اچھی خاصی تھی اور دیکھو انھوں نے اس کا کیا حال بنایا ہے۔"

"یہ والا دیکھا ہے آپ نے ؟" بابو نے انگریزی کا ایک اخبار بڑھایا۔" یہ بالکل صاف ہے۔ بلو کو پہچانا جا سکتا ہے۔"

اخباروں کا ایک بے ترتیب ڈھیر دانیال صاحب کے سامنے پڑا تھا۔ بابو سے کہا گیا تھا کہ جلدی آئے اور راستے سے سارے اخبار خریدتا لائے۔ دانیال صاحب کا خیال تھا کہ جیسے ہی اشتہار چھپے گا، ہر ایرا غیرا نتھو خیرا کسی نہ کسی لڑکے کو پکڑ کر انعام کی رقم مانگنے آ جائے گا۔ ایسی صورتِ حال سے بچنے کے لیے انھوں نے اپنے کلرک بابو اور ماتحت وکیل سے کہا تھا کہ وہاں موجود رہیں، اور نعمان کی مدد کریں۔ وکیل ابھی آیا نہیں تھا اور نعمان جو رات دیر تک امتحان کی تیاری کرتا رہا تھا، ابھی اُٹھا نہیں تھا۔ وہ دوپہر کی ریل سے واپس کھڑگ پور جا رہا تھا۔

گھر کے سامنے ٹیکسی رُکنے کی آواز آئی تو دانیال صاحب نے کافی کی پیالی رکھ دی۔

"شروع ہو گیا سلسلہ" انھوں نے کہا۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ یہاں ابتدا ہی انجام ہے۔

"ابا۔"

بلو کی آواز !۔۔۔ ارے !

دانیال صاحب کی آنکھیں دروازے کے پردے کی طرف اُٹھ گئیں۔ بلو پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔

"کیا ہوا ؟ تم کہاں تھے ؟ کون لایا تمھیں ؟ تم نے اپنے بالوں کا کیا حشر بنا رکھا ہے۔؟"

ایک کے بعد ایک سوال۔ پھر دانیال صاحب نے اطمینان کا سانس لیا اور کُرسی پر آرام سے بیٹھ گئے۔ اب انھیں جوابوں کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کا بیٹا واپس آ گیا تھا۔ اہم بات تو یہی تھی۔

پھر ان کی نظر باہر برآمدے میں انتظار کرنے والے شخص پر پڑی۔

"اندر آ جائیے۔" انھوں نے کہا۔ یہ آدمی جو بھی تھا، اسے اندر بلانا پڑے گا۔ انعام کا مسئلہ بھی تو تھا۔" دربان سے کہہ دو

کہ اب کوئی اور آدمی لڑکا لے کر آئے تو اُسے اندر نہ آنے دینا۔" انھوں نے کلرک سے کہا۔" اس سے کہو کہ اعلان کر دے میرا بیٹا واپس آگیا ہے۔"

بابو پردے ہٹا کر کمرے کے باہر گیا۔ وہ آدمی دروازے میں کھڑا تھا۔ دانیال صاحب نے اس کی طرف دیکھا۔ کیا وہ شریف آدمی معلوم ہوتا تھا؟ دانیال صاحب نے فیصلہ کیا کہ نہیں۔ اس کی قمیض گھٹیا اور میلی تھی اس کی چپلیں گھسی ہوئی تھیں، اس کی سفید پتلون ملگجی تھی۔ اس کے بال؟ اس کی قلمیں؟ نہیں، اُنھیں قلموں پر اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ نعمان نے بھی قلمیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اور اس کے بال بھی کچھ اسی طرح کے تھے۔

"اندر آجاؤ۔"

ہارون دروازے سے اندر آگیا۔

"تمھارا نام کیا ہے؟"

"یہ ہارون ہیں، ابا۔ ہارون بھیا فن کار ہیں۔ بہت بڑے تماشا گر۔"

دانیال صاحب نے اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کی طرف برہمی سے دیکھا۔

"بس، بلو۔" ان کا انداز تحکمانہ تھا۔" اسے بات کرنے دو۔ تم اُوپر جاؤ اور دادی اماں کو بتا دو کہ تم واپس آگئے ہو۔ وہ بہت پریشان ہو رہی ہیں۔ نعمان بھی یہاں ہے۔ جا کر اُسے جگا دو۔"

لیکن بلو کو جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ بھلا ہارون بھیا کو وہاں کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ وہ فرماں برداری کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا لیکن برآمدے میں کھڑا رہا، اپنے ابا کی نظروں سے دُور، ایسی جگہ پر جہاں سے وہ ہارون کو دیکھ سکتا تھا۔

دانیال صاحب اس آدمی کی طرف مُڑے۔

"اچھا، اب پوری بات بتاؤ۔"

"یہ میرے ساتھ کھڑگ پور سے آیا۔ اس نے چلتی ہوئی ریل پر سوار ہونے کی کوشش کی۔ میں اسے کھینچ کر اندر لے آیا۔ یہ تب سے یہیں ہے۔"

"یہاں؟ کہاں؟"

"کلکتہ میں بینٹنک اسٹریٹ۔ ایک چائے خانے میں۔"

"چائے خانے میں!" دانیال صاحب کی آنکھیں لگتا تھا پھٹ پڑیں گی۔" وہ چائے خانے میں کیا کر رہا تھا؟"

"کام کر رہا تھا جناب۔"

"کام؟ کس طرح کا کام؟" دانیال صاحب کو اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

ہارون نے انھیں بتایا۔ دانیال صاحب کے سر پر اب بال نہیں رہے تھے۔ اگر ہوتے تو اس وقت وہ انھیں نوچ ڈالتے۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ چنگھاڑتے ہوئے، اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے "دنیا کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ تم نے میرے بیٹے کو مجبور کیا کہ چائے خانے میں کام کرے؟ تمھارے دماغ میں ذرا سی بھی سمجھ نہیں ہے؟ تم نے اسے دیکھ کر اندازہ نہیں لگا لیا تھا کہ یہ کسی اچھے خاندان کا ہے؟"

"لیکن یہ مجھے پسند تھا، ابا!" ببلو دوڑتا ہوا کمرے کے اندر آیا۔

"چپ رہو!" دانیال صاحب دہاڑے "میں نے تم سے نہیں کہا تھا اُوپر جانے کو؟"

ببلو دوبارہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ تو یہ تھا گھر، اتنے دن غائب رہنے کے بعد۔ بہت دن کے بعد! اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہوگا۔

ہارون وہاں خاموش کھڑا ہوا تھا۔ وہ جب بولا تو اُس کی آواز بہت پُرسکون تھی۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اگر مجھے معلوم ہوتا یہ کون ہے تو میں اسے اپنے پاس رکھتا؟ اسے تو کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ اس کا ذہن کورے کاغذ کی طرح تھا۔"

"اور یہ سب کچھ اسے یاد آ گیا۔ جوں ہی اخبار میں اشتہار چھپا۔ کیوں؟"

دانیال صاحب کے انداز سے ظاہر تھا کہ انھیں ہارون کی کسی بھی بات کا اعتبار نہ تھا۔ ہارون حیران تھا۔

"مجھے معلوم نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، جناب۔" اس نے کہا۔ "اس کی یادداشت کل رات واپس آ گئی ہے۔ بارش ہو رہی تھی، اس لیے میں اسے لے کر نہیں آیا۔ اب یہ آ گیا ہے تو میرا کام ختم ہو گیا ہے۔ ایک بات اور ہے۔۔۔ اس کے سر پر گومڑا پڑ گیا ہے۔ کبھی کبھی اس میں درد ہوتا ہے۔ میں نے یہ اس لیے بتا دیا کہ آپ شاید ڈاکٹر کو دکھانا چاہیں اور کچھ نہیں۔ خدا حافظ ارمان۔"

ہارون کمرے کے باہر چلا گیا۔ ببلو باہر برآمدے میں اس کا منتظر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھ پاتا کہ کیا ہوا ہے، اس کے ابّا نے پکارا۔

"ببلو، یہاں آؤ۔"

ببلو اندر آیا اور دانیال صاحب کی میز کے پاس آ کھڑا ہوا۔ انھوں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کہاں تکلیف ہوتی ہے؟"

ببلو نے انھیں دکھایا۔ گومڑا ابھی تک وہاں تھا۔ دانیال صاحب نے احتیاط کی کہ اُسے ہاتھ نہ لگائیں۔

"تمھیں بڑی مشکلات سے گزرنا پڑا، ہیں ناں ببلو؟"

ببلو نے سر ہلا دیا۔ یہ مشکلات تو نہیں تھیں۔

"اچھا اُوپر جاؤ، ہری ناظمہ سے کہو کہ تمھیں خوب گرم پانی سے نہلوا دے۔ آج تمھاری چھٹی ہے۔ ڈاکٹر صاحب آکر تمھیں دیکھیں گے اگر انھوں نے کہا کہ سب ٹھیک ہے تو تم کل سے اسکول جا سکتے ہو۔ آئندہ سے گاڑی تمھیں لینے کے لیے آیا کرے گی۔ اب جاؤ۔"

ببلو چلا گیا۔

دانیال صاحب نے اخباروں کا ڈھیر حقارت اور نفرت کے ساتھ ہاتھ مار کر گرا دیا۔

"چائے خانہ! اونہہ!" انھوں نے نفرت کے ساتھ دُہرایا "چائے خانہ! ذرا سوچو تو سہی!"

بابو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ یہ بات ایسی تھی کہ وہ اپنے مالک سے اس کا ذکر نہیں کر سکتا تھا۔ کیا دانیال صاحب کی یہ بات صحیح تھی کہ جو آدمی ان کے بیٹے کو گھر لے کر آیا اُسے انعام سے محروم کر دیں؟ صرف اس لیے کہ اس نے اخبار نہیں پڑھا تھا؟ اس کے خیال میں یہ بات صحیح نہیں تھی۔

کوئی گھنٹے بھر بعد پولیس انسپکٹر نے ٹیلی فون کیا۔

"اشتہار سے کوئی نتیجہ برآمد ہوا؟" انھوں نے پوچھا۔

دانیال صاحب کے جواب سے وہ صرف خوش ہی نہیں حیران بھی ہوئے۔

"بڑی عجیب بات ہے، جناب" انھوں نے کہا۔ "بعض دفعہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ راستے میں دیوار کھڑی ہے، اور پھر اچانک، جادو کی طرح، دروازے آپ ہی آپ کھلنے لگتے ہیں۔۔۔ آپ کا بچہ خیریت سے گھر آگیا اور ان دونوں بدمعاشوں کے ہتھکڑی لگ گئی۔"

"واقعی؟" دانیال صاحب نے تعجب سے پوچھا۔ "وہ کیسے پکڑے گئے؟"

"کسی آدمی نے ٹیلی فون کر کے ہمیں بتایا کہ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔ آدھ گھنٹے پہلے ہم نے انھیں ان کے بستر سے گھسیٹ لیا۔ وہ سو رہے تھے۔ پولیس اسٹیشن پر خوب جاگ گئے وہ اور اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔"

انسپکٹر صاحب سے بات کرنے کے تھوڑی ہی دیر بعد دانیال صاحب سارے قصّے کو بھول بھال گئے۔

عقیل عباس جعفری

اعداد کا ہماری زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ دُنیا کی اہم شخصیات ہوں یا بڑے بڑے واقعات، ان سب کا تعلق کسی نہ کسی طرح اعداد سے ضرور بنتا ہے۔ اعداد کے حوالے سے دُنیا بھر کی اہم معلومات پر مبنی یہ سلسلہ ہم ہر ماہ آپ کی دلچسپی اور معلومات میں اضافے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ (۱) کے عدد سے شروع ہونے والا سلسلہ دیکھیے کہاں تک جاتا ہے۔

(۱۷)

- ہندوستان پر خاندانِ مغلیہ کے سترہ بادشاہوں نے حکومت کی۔
- پانچوں فرض نمازوں میں رکعتوں کی کل تعداد سترہ ہے۔
- حنیف محمدؒ نے اپنا پہلا ٹیسٹ میچ ۱۷ سال ۳۰۰ دن میں اور گیری سوبرز نے اپنا پہلا ٹیسٹ ۱۷ سال ۲۴۵ دن کی عمر میں کھیلا تھا۔
- ملکہ الزبتھ دوم آئینی طور پر سترہ ملکوں کی حکمران ہیں۔
- دیوانِ غالب کی طویل ترین غزل سترہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس غزل کا مطلع ہے۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

- ۱۹۶۰ء میں برِاعظم افریقہ کی ۱۷ نوآبادیوں نے آزادی حاصل کی۔ اسی لیے ۱۹۶۰ء کو افریقہ میں آزادی کا سال کہا جاتا ہے۔
- اونٹ ۱۷ دن تک پانی پیئے بغیر زندہ رہ سکتا ہے۔
- مشتاق محمدؒ ٹیسٹ کرکٹ میں سینچری بنانے والے دُنیا کے سب سے کم عمر کھلاڑی ہیں۔ انھوں نے یہ اعزاز ۱۷

سال ۷۸ دن کی عمر میں حاصل کیا تھا۔

- چاند پر بھیجا جانے والا آخری انسان بردار خلائی جہاز اپالو ۱۷ تھا۔
- ۱۹۱۶ء میں چلی کے مقام باہیا فیلکس میں سال کے ۳۶۵ دنوں میں سے ۳۴۸ دن بارش ہوئی یعنی سال بھر میں صرف ۱۷ دن ایسے تھے جب وہاں بارش نہیں ہوئی۔

(۱۸)

- زمین سورج کے گرد ۱۸½ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے گردش کرتی ہے۔
- تاج محل کی تعمیر ۱۸ برس میں مکمل ہوئی تھی۔
- ماجد خان نے اپنا پہلا ٹیسٹ ۱۸ برس ۲۶ دن کی عمر میں اور عمران خان نے اپنا پہلا ٹیسٹ ۱۸ سال ۱۹۰ دن کی عمر میں کھیلا تھا۔
- پاکستان میں ۱۸ سال کا شخص شناختی کارڈ حاصل کر سکتا ہے۔
- گھوڑے میں پسلیوں کے ۱۸ جوڑے ہوتے ہیں۔
- برطانیہ میں ۱۸ برس کا شخص ووٹ دے سکتا ہے اور اپنی مرضی سے شادی کر سکتا ہے۔
- قائداعظمؒ سے شادی کے وقت رتن بائی کی عمر ۱۸ برس تھی۔
- ملکہ وکٹوریہ جب برطانیہ کی ملکہ بنیں تو ان کی عمر ۱۸ برس تھی۔
- فتح مکہ کے بعد حضور اکرمؐ نے مکہ مکرمہ میں ۱۸ دن قیام فرمایا تھا۔
- انسان کھائے پیئے بغیر زیادہ سے زیادہ ۱۸ دن تک زندہ رہ سکتا ہے۔

(۱۹)

- بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں حروف کی تعداد ۱۹ ہے۔
- دوزخ کے فرشتوں کی تعداد ۱۹ ہے۔
- ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کی تعمیر میں صرف ۱۹ ماہ صرف ہوئے تھے۔
- جاوید میاں داد ٹیسٹ کرکٹ میں ڈبل سنچری بنانے والے دنیا کے سب سے کم عمر کھلاڑی ہیں۔ انھوں نے یہ کارنامہ ۱۹ سال ۱۴۱ دن کی عمر میں انجام دیا تھا۔
- ۱۹۷۴ء میں منعقد ہونے والی دوسری اسلامی سربراہ کانفرنس میں سب سے بڑا وفد سعودی عرب کا تھا جو ۱۹

افراد پر مشتمل تھا۔

● امریکہ کے آئین میں ۱۹ ویں ترمیم ۲۶ راگست ۱۹۲۰ء کو کی گئی۔ اس ترمیم کی رُو سے خواتین کو بھی ووٹ ڈالنے کا حق مل گیا۔

● ۱۹۶۴ء کے ٹوکیو اولمپکس میں اولمپک مشعل ۱۹ سالہ یوشی نوری سکائی نے روشن کی تھی۔ وہ ۶ راگست ۱۹۴۵ء کو ہیروشیما میں ایٹم بم گرنے سے صرف ایک گھنٹے پہلے پیدا ہوا تھا۔

● ایک ٹیسٹ میچ میں ۱۹ وکٹیں لینے کا ریکارڈ جم لیکر کا ہے۔ جس نے یہ کارنامہ ۱۹۵۶ء میں آسٹریلیا کے خلاف انجام دیا تھا۔

● مشہور مستشرق گارساں دتاسی ہر سال پیرس میں بیٹھا بیٹھا برصغیر میں اردو ادب کی رفتار و ترقی کا جائزہ لیتا رہتا تھا اور سال کے آخر میں اپنی یونیورسٹی میں اس سال کی ترقی پر لیکچر دیتا۔ اس کے لیکچروں کی کُل تعداد ۱۹ رہے۔

● آغا خان میڈیکل یونیورسٹی، پاکستان کی انیسویں اور کراچی کی تیسری یونیورسٹی ہے۔

(۲۰)

● ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء کو حضور اکرم مکّہ سے قبا پہنچے تھے۔

● محمد بن قاسم نے راجہ داہر کو شکست دے کر سندھ فتح کیا تو اس دن عیسوی تاریخ ۲۰ جون ۷۱۲ء تھی۔

● ۱۹۵۶ء میں جم لیکر نے جس ٹیسٹ میچ میں ۱۹ وکٹیں لے کر عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اس میچ میں بیسویں وکٹ ٹونی لاک نے لی تھی۔

● ماہرین معاشیات کے مطابق ہر انسان کو اپنی آمدنی کا ۲۰ فیصد حصّہ پس انداز کرنا چاہیے۔

● ایڈورڈ گبن نے "سلطنت روما کا عروج و زوال" بیس سال کے عرصے میں مکمل کی تھی۔

● ۲۰ نومبر ــــ احمد ندیم قاسمی کا یوم پیدائش ہے اور فیض احمد فیض کا یوم وفات۔

● دنیا میں کھتے افراد کی تعداد ۲۰ کروڑ ہے۔

● ۲۰ ستمبر ۷۸۶ء عالم اسلام کی ایک یادگار تاریخ ہے۔ اس دن عبّاسی خلیفہ ہادی کا انتقال ہُوا، ہارون رشید تخت نشین ہوا اور مامون رشید پیدا ہوا۔

● شہزادہ چارلس سے شادی کے وقت لیڈی ڈیانا کی عمر صرف ۲۰ برس تھی۔

● پاکستان ٹیلیویژن نے اپنی رنگین نشریات کا آغاز ۲۰ دسمبر ۱۹۷۶ء کو کیا تھا۔

کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے

واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ

احمد کے حلوہ جات

ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے

MASS

حیرت کی بات

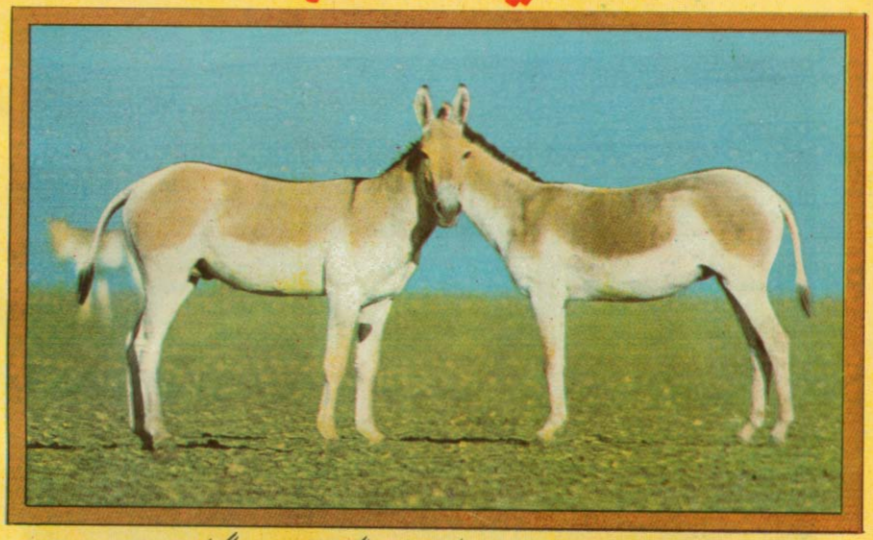

۱۔ آپ نے کبھی ایسا گدھا دیکھا! جس کی ۸ ٹانگیں دو دھڑ، مگر ایک ہی سر ہو۔

۲۔ جی نہیں! نہ یہ کپڑا ہے نہ کپڑا نما کوئی اور چیز بلکہ یہ تو آسمان سے گرنے والی برف کی تہہ ہے۔

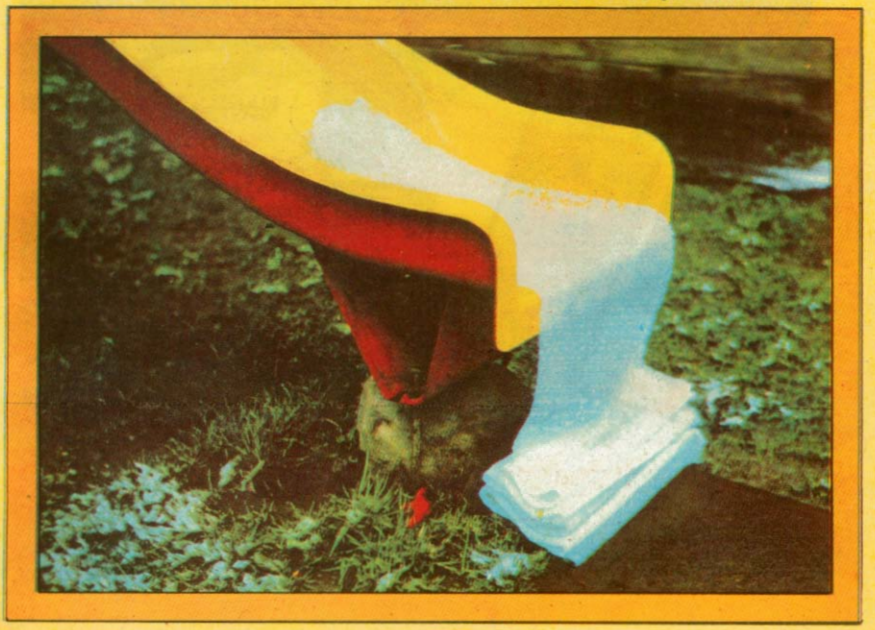

ننھے میاں کا چوزہ

صفیہ سلطانہ صدیقی

"چوزے لے لو۔ چوزے لے لو۔" باہر سے آواز آئی۔ تو ننھے میاں مچلنے لگے۔

"امی... امی! چوزے لوں گا۔ صرف دو۔ دلا دیں نا!" وہ مستقل عائشہ کے پیچھے پڑا رہا۔ "امی پھر وہ چلا جائے گا۔"

"نہیں بیٹے! ہمیں کوئی پالنا تھوڑا ہی آتے ہیں۔ مر جائیں گے، یا بلی کھا جائے گی انہیں۔ کیا فائدہ؟"

"نہیں نہیں، میں خیال رکھوں گا۔ روز کھانا کھلاؤں گا۔ اپنے بستر میں سلاؤں گا۔ آپ مجھے لے دیں۔"

"اچھا بابا! کتنے کا ہے۔؟" ننھے میاں خوشی سے بے قابو ہو کر گلی کی طرف دوڑے۔

"چوزے والے۔ چوزے والے"....

"ہاں بھئی، بولو۔؟ کتنے لینے ہیں۔؟"

"امی پوچھ رہی ہیں کتنے کا ہے"؟

" ایک پانچ روپے کا ہے " ننھے میاں واپس پلٹے۔

" امی بس دس روپے دے دیں۔ ایک چوزہ پانچ روپے کا ہے میں پیلا اور لال والا لوں گا۔ وہ دونوں تو اتنے پیارے ہیں.... اتنے پیارے ہیں... کہ بس کیا بتاؤں۔ " ننھے میاں خیال ہی خیال میں لال اور پیلے چوزے کو پیار کرنے لگے۔

" پانچ کا ایک! توبہ ہے ہر چیز مہنگی ہوئی جا رہی ہے۔ ننھے، تم بہت ضدی ہوتے جا رہے ہو۔ بس ایک چیز کے ہی پیچھے پڑ جاتے ہو۔ "

" امی۔ اب دے بھی دیں۔ یہ رکھے ہیں مشین کی دراز میں دو پانچ کے نوٹ "۔

" جی نہیں! ابھی آٹا منگوانا ہے، نمک بھی ختم ہو گیا ہے۔ بس یہی ہیں۔ ایسا کرو، پھر لے لینا۔ وہ دوبارہ آئے گا "

" نہیں امی " ننھے میاں نے رونا شروع کر دیا۔

" اچھا اچھا، لو ایک لے آؤ "۔ ننھے میاں نے غنیمت جانا۔ اداس ہو کر پانچ کا نوٹ چوزے والے کی طرف بڑھا دیا۔

" کونسا لو گے ؟ "

" کونسا لوں " ؟ ننھے میاں مسلسل لال اور پیلے چوزے کو تک رہے تھے " کیا تم دونوں ہی پانچ روپے میں نہیں دے سکتے ؟ "

" ہا ہا ہا! " چوزے والے نے قہقہہ لگایا۔

" اچھا یہ لال والا دے دو "۔ ننھے نے شرمندہ ہو کر جلدی سے کہا۔ اور پھر خوشی خوشی لال چوزہ لے کر گھر آ گئے۔

" امی! دیکھیں تو کتنا پیارا ہے۔ ابھی میں اس کا بستر لاتا ہوں۔ " عائشہ سلائی میں مصروف تھی ایک نظر دیکھ کر دوبارہ کام میں لگ گئی۔ اور ننھے میاں اپنے چوزے کا بستر ڈھونڈنے میں مصروف ہو گئے۔ ننھی کے گدے میں سے جو تھوڑی سی روئی جھانکتی ہوئی نظر آئی تو ننھے میاں نے خوش ہو کر اسے گھسیٹ لیا۔ اور اندر ہاتھ ڈال کر تھوڑی سی مزید نکال لی۔ پھر ننھی کی چھوٹی سی پھٹی پرانی چادر میں اس روئی کو لپیٹ کر چوزے کا بستر تیار کر لیا اور اپنے چوزے کو وہیں ننھی کے پاس لٹا کر باورچی خانے میں اس کے کھانے کا انتظام کرنے چلے گئے۔ کچھ دیر گزری تھی کہ ننھی نے چیخ چیخ کر اپنے جاگنے کا اعلان کر دیا۔

عائشہ سلائی چھوڑ کر ننھی کو اٹھانے آگئی۔

اتنی دیر میں ننھے میاں کمرے میں داخل ہوئے۔ اور کہنے لگے "امی جی چوزے کو ننھی کے دودھ میں تھوڑا سا آٹا ملا کر کھلا دیتا ہوں۔ ننھے میاں دودھ ایک کپ میں بھر کر اس میں آٹا ملا کے لئی سی بنا لائے۔

"ہائے ننھے ..... ! تمہارا کیا حشر کروں۔ ؟ اب ننھی کو کیا دو گے۔ ؟ پانچ روپے ویسے ہی خرچ کر دیئے اب ننھی کا دودھ آئے گا یا تمہارے کھانے کو آٹا۔ !!!" عائشہ نے غصے سے کہا۔ اس کی نظر ننھی کے گدے پر پڑی تو ایک طرف سے بہت سی روئی غائب دیکھی۔ پتہ چلا کہ چوزے کا زخم بستر بن چکی ہے۔ پھر تو عائشہ غصے سے لال پیلی ہوگئی۔

"ننھے! تمہیں شرم نہیں آتی۔ بہن کا بستر خراب کر دیا۔ !! ابھی تمہارے چوزے کو اٹھا کر گلی میں پھینکتی ہوں۔ بہن کی چیزیں خراب کرتے ہو۔ ؟ اور یہ ننھی کی دوہر بھی گندی کروا دی!۔" وہ ننھے کو برا بھلا کہتی رہی اور ننھے میاں ایک کونے میں سہمے کھڑے رہے۔ بالآخر عائشہ کو خود ہی احساس ہو گیا کہ اسے اتنا برا بھلا نہیں کہنا چاہیئے تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ آخر میں نے اس کو فوراً ہی کیوں نہیں سی لیا تھا جو ننھے نے اس میں سے روئی نکالی۔ اگر میں اس کے مسائل میں دلچسپی لے لیتی تو دودھ بھی ضائع ہونے سے بچ جاتا! وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگی۔ مگر کام بھی تو کتنے ہوتے تھے۔ عائشہ سارے گھر کا کام کر کے سلائی لے بیٹھتی تھی۔ شوہر کی مختصر آمدنی میں گزارہ ممکن نہ تھا۔ وہ سلائی کر کے بمشکل خرچ پورا کرتی ان تمام حالات کے باوجود بھی وہ اپنا ذہن متوازن رکھتی اور برے حالات اور غربت کا غصہ کبھی بچوں پر نہ اتارتی۔ یہی وجہ تھی کہ ننھے میاں کو اس مختصر سے مکان میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ ہوتی اور پڑوس کے دوستوں کی پٹائی لگتی تو وہ حیران ہوتا کہ ان کی امی کیسے بچوں کی پٹائی لگا لیتی ہیں ؟

بقرعید قریب تھی اور سلائیاں بہت باقی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح بقرعید پر ننھے کا نیا کرتا پاجامہ ضرور بنا لے۔ ننھے میاں ڈانٹ کھا کھا کر سو چکے تھے۔ عائشہ نے اٹھ کر چوزے کو کھانا کھلایا اور پھر دوبارہ کپڑے سینے جا بیٹھی۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ننھے کی آنکھ کھلی۔ کھیلنے کا وقت نکل چکا تھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ پڑھنے کا وقت تھا۔ ننھے کو سخت بوریت ہوئی کہ اب پڑھنا پڑے گا۔ عائشہ ننھے کی شکل دیکھتے ہی بھانپ گئی۔.....

"ننھے! ادھر آیئے۔" نرم لہجہ سن کر ننھے کی جان میں جان آئی۔ "جی امی"! وہ امی کے پاس آکر بولے۔

"ہم سوچ رہے ہیں کہ آج آپ کو بہت ڈانٹ دیا ہمیں افسوس ہو رہا ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ آپ

کا عید کا سوٹ خریدنے بازار چلتے ہیں۔"

"سچ مچ امی"!! ننھے میاں کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ جیسے کبھی افسردہ ہی نہ ہوا ہو۔

"مگر ایک بات ماننا ہوگی۔"؟

"کونسی"؟ ننھے نے بدستور دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یہ کہ ہر چیز پوچھ کریں گے۔ آپ تو کام کرتے ہیں، مگر وہ بگڑ جاتا ہے۔ اور پھر ڈانٹ کھانا پڑتی ہے۔"

"ٹھیک ہے امی اب چلیں۔"

"ہاں ذرا نماز پڑھ لوں۔ جب تک غفورن خالہ اپنے کپڑے بھی لینے آجائیں گی، پھر چلیں گے۔"

اسے پیسوں کا انتظار تھا۔

ننھے میاں بڑے خوش تھے۔ امی سے کہنے لگے۔ "امی! آپ میرے اور ننھی کے کپڑے بناتی ہیں۔ میرے چوزے کے بھی تو بنائیں۔! اچھا چھوٹی سی فراک بنادیں۔ اسے سردی لگتی ہوگی!"

"نہیں بیٹے! چوزے کو اللہ میاں نے قدرتی کپڑے پہنائے ہوئے ہیں، اسے کیا ضرورت ہے فراک کی۔"؟ عائشہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ننھے کی مزیدار باتیں اکثر اس کی بہت سی پریشانیوں کو دور کردیتی تھیں۔

ننھے میاں کا چوزہ اب کچھ بڑا ہوگیا تھا۔ وہ سب سے اچھی خوراک اپنے چوزے کو کھلاتے۔ وہ بھی سارے گھر میں گھومتا پھرتا تھا۔ عائشہ حیران تھی کہ وہ اب تک بیمار بھی نہیں ہوا تھا۔! اصل میں ننھے میاں اس پر اتنی توجہ دیتے تھے کہ ان کا باہر نکلنا بھی کم ہوگیا تھا۔ عائشہ خوش تھی کہ چلو، ننھے کو ایک مشغلہ ہاتھ لگ گیا ہے۔

عید میں دو دن رہ گئے تھے، ہر طرف چہل پہل تھی۔ بکرے، دُنبے گائے جگہ جگہ بندھے دیکھ کر ننھے نے امی سے کہا... "امی ہمارا بکرا کب آئے گا۔؟" عائشہ... اس سوال پر چونک گئی... مگر خاموش رہی۔...

"امی!" ننھے نے پھر مخاطب کیا۔ "امی سارا سال گوشت منگا منگا کر کھاتے ہیں۔ بقر عید میں گھر میں کیوں کاٹتے ہیں۔ بازار سے لاکر کیوں نہیں کھاتے؟" عائشہ کو ہنسی آگئی۔

"بتائیں نا امی!!" ننھے نے اپنے مخصوص انداز میں اصرار کیا۔

"بیٹا اللہ تعالیٰ انسان سے کہتا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں قربانی دو۔ اس لئے سب قربانی کرتے ہیں۔

اور اللہ چاہتا ہے کہ ہم اس کے لئے اپنی عزیز ترین چیز۔ اپنا مال و دولت اور جو بھی قربان کر سکتے ہوں کریں۔" اس نے ننھے کو آسان اور مختصر انداز میں قربانی کا مقصد سمجھا دیا۔

"تو امی! ہم اللہ کی راہ میں بکرا قربان نہیں کر سکتے"؟

"نہیں بیٹا! یہ تو ان پر فرض ہے، جو بکرا خرید سکتے ہیں۔" مختصر سا جواب دے کر وہ دوبارہ سلائی میں مصروف ہو گئی، جو ہر حال میں کل تک اسے مکمل کرنا تھی۔

چھ سالہ ننھے میاں بڑے فلسفیانہ انداز میں کچھ غور و فکر کرنے لگے۔

"کیا سوچنے لگے ننھے۔!!" امی نے مسکرا کر پوچھا۔

"اچھا امی! اگر ہم بکرا نہیں خرید سکتے تو عزیز چیز قربان کر سکتے ہیں؟" ننھے میاں اب تک وہیں الجھے ہوئے تھے۔

"ہاں بیٹا۔!!" عائشہ نے جواب دیا۔

"اچھا تو امی پھر ہم اپنے منّے سے پیارے سے چوزے کی قربانی کر لیتے ہیں آپ میرا چوزہ کاٹ لیجئے!" نہایت معصومیت سے ننھے نے کو اپنی گود سے اتار کر امی کی طرف بڑھا دیا.... عائشہ حیران رہ گئی۔ اس نے بے اختیار ننھے کو گود میں اٹھا لیا۔ وہ سوچنے لگی کہ ننھے جیسا قربانی کا جذبہ تو شاید مجھ میں بھی نہیں ہے۔!!

میں نے پہلے ہی کہا تھا گینڈے کو فوٹو گرافی کا کوئی شوق نہیں

عالیہ ممتاز

ثانی میاں نے کہانی لکھی

ثانی میاں ہمارے قریب سے ہوا کے جھونکے کی مانند گزر گئے۔ وہ بھی بغیر کوئی فرمائش کئے تو ہمیں تو حیران ہونا ہی تھا اس شرافت کا سبب بھی جلد ہی معلوم ہوگیا۔ ثانی میاں کے ہاتھ میں کہانیوں کی ایک کتاب نظر آرہی تھی۔ جو ہم نے پچھلے ہی ہفتے ان کے بے حد اصرار پر لاکر دی تھی۔

جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ثانی صاحب کے ایک ہاتھ میں کاپی پینسل ہے دوسرے میں وہی کہانیوں کی کتاب ہے۔ ہم نے پوچھا۔ ثانی کیا کر رہے ہو؟

"کہانی لکھ رہا ہوں!" جواب ملا۔

"کیوں"؟ ——— "آنکھ مچولی میں بھیجوں گا۔

نقل کر کے؟ ——— "کیا کریں سارے بچے ہی نقل کرتے ہیں"۔

ثانی نے بڑے ہی اطمینان سے ایک لمحے میں سب کو بدنام کر کے رکھ دیا۔

"بلیک لسٹ میں نام آجائے گا" ہم نے ڈرانا مناسب سمجھا۔

ثانی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے۔ لیکن کسی کو کیا پتہ کہ میں نے نقل کر کے بھیجی ہے "

واہ کیوں نہیں پتہ چلے گا۔ بالکل پتہ چل جائے گا۔ اور ویسے بھی نقل تو بے ایمانی ہے۔"

"کسی کو پتہ نہ چلے غلط حرکت تو ہے اور ویسے بھی اللہ میاں تو دیکھ رہے ہیں "

ثانی میاں سوچ میں پڑ گئے۔ وہ سب کچھ کر سکتے تھے نقل اِن سے نہیں ہو سکتی۔ تھوڑی دیر بعد بولے۔

" پھر میں کیا کروں میرا اتنا دل چاہ رہا ہے کوئی کہانی بھیجنے کا۔"

بھئی خود کوشش کرو۔ انشاء اللہ کوئی کہانی ضرور لکھ لو گے۔ ثانی میاں نیم راضی دکھائی دے رہے تھے۔

" ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں" کہانیوں کی کتاب انہوں نے دوبارہ الماری میں رکھ دی۔ اپنے بستر پر اَوندھے لیٹ کر انہوں نے کہانی لکھنی شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ اپنی پیٹھ بھی کھجا تے جا رہے تھے۔ وہ اسی طرح سوچتے تھے، جب زیادہ سوچتے تو کمر پیٹھ کھُجا تے۔ انہیں مُراقبے میں گئے دو گھنٹے گزر گئے۔ دو گھنٹے بعد وہ جھنجھلائے ہوئے کمرے سے برآمد ہوئے۔ پھر فرمایا دیکھئے میں نے ابھی تک صرف اتنی سی کہانی لکھی ہے" انہوں نے کاپی ہمارے سامنے رکھ دی۔ اس پر لکھا تھا

ایک بادشاہ تھا۔ وہ بہت امیر تھا" انہوں نے کچھ کچھ دادطلب نظروں سے ہمیں دیکھا۔ ہم اِن کی نظروں کا مفہوم سمجھ گئے۔ ہم نے مسکرا کر کہا۔"بھئی سارے ہی بادشاہ بہت امیر ہوتے ہیں سوائے چند ایک کے۔ جن کے دل میں خوفِ خدا ہوتا ہے۔"

" پھر میں کیا کروں مجھ سے نہیں لکھی جاتی کہانی۔" ثانی صاحب بالکل مایوس ہو گئے

ہم نے انہیں غور سے دیکھا۔ ہم سمجھ چکے تھے کہ اس مرحلے پر اگر ہم نے ان کی ہمّت توڑ دی تو یہ تمام عمر کوئی کہانی نہیں لکھ سکیں گے۔ ہم سوچ چکے تھے کہ اس نازک مرحلے پر ان کی مدد کرنا ضروری ہے۔ ہم نے کہا۔!

" دیکھو بھئی یہ بادشاہوں کے قصّے پرانے ہو گئے۔ یہ سائنس کا دَور ہے۔ خود تمہارے پاس بادشاہوں کی کہانیوں کی بجائے سائنسی کہانیوں کی کتابیں ہیں۔ جب تم یہ کہانیاں سننا اور پڑھنا پسند نہیں کرتے تو تم خود سوچو کہ دوسرے لوگ کیوں پسند کریں گے۔ اور کہانی کے لئے ضروری تھوڑی ہے کہ اس میں کوئی عجیب سا واقعہ ہو۔ کوئی مشکل سی بات ہو۔ بس کوئی چھوٹی سی بات لکھ دو۔ کوئی چھوٹا سا واقعہ۔ کسی صحابیؓ کا کوئی اچھا سا قصہ۔ انبیاءؑ میں سے کسی کی کوئی بات یا واقعہ۔ ضروری تو نہیں کہ پہلی مرتبہ ہی میں کوئی مشکل اور طویل کہانی لکھ لی جائے۔ بس کوشش کرو۔ اگر تم نے ابھی سے کہانی نقل کرنے کی کوشش کی تو یقین کرو اللہ میاں تم سے ناراض ہو جائیں گے۔ کیونکہ اللہ میاں کو بے ایمانی پسند نہیں ہے۔ وہ تم سے لکھنے کی صلاحیت چھین لیں گے۔ اس لئے کہ نقل کرنے کا مطلب یہ ہے

کہ تم نے صلاحیت کا غلط استعمال کیا۔ کسی چیز کا کسی نعمت کا یا کسی صلاحیت کا غلط استعمال ناشکرا پن ہوتا ہے۔ جو صرف کم ظرف لوگ کرتے ہیں۔"

ہم ـــ دیکھ رہے تھے کہ ثانی میاں پر ان تمام باتوں کا بڑا اثر ہو رہا ہے۔ وہ ہماری گفتگو بڑے غور سے سُن رہے تھے۔ ثانی میاں نے خاموشی سے ہمارے ہاتھ سے کاپی لے لی۔ ان کے چہرے پر عزم دکھائی دے رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوگئی تھی۔ دوبارہ اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم نے ان کے کمرے میں جھانکا تو وہ اپنے بستر پر آوندھے منہ پڑے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھا تو مسکرا کر کہنے لگے کہ "پلیز! ایک کپ چائے ملے گی۔" انہوں نے سُن رکھا تھا کہ اکثر ادیب لکھتے وقت چائے ضرور پیتے ہیں۔ خود ہمیں پڑھتے ہوئے کئی مرتبہ وہ چائے پیتا دیکھ چکے تھے۔

ہم نے کہا "ثانی میاں! چائے کوئی بہت اچھی چیز نہیں ہے۔ ہم نے چائے کی برائیوں پر ایک لیکچر دے مارا۔ اور ہمارا لیکچر ثانی میاں کی سمجھ میں آ ہی گیا۔ ہم اپنے کاموں میں مصروف ہو چکے تھے۔ کافی عرصے سے ہم نے لائبریری کا رُخ نہیں کیا تھا۔ آج ذرا فرصت ملی تو ہم وہیں چلے آئے۔ ابھی ہمیں تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ وہ ہمیں آوازیں دیتے ہوئے چلے آئے۔ وہ اندر آئے تو ہم نے دیکھا کہ ان کا چہرہ خوشی سے دمک رہا ہے وہ بڑے ہی مطمئن دکھائی دیتے تھے انہوں نے بڑے فخر سے کاپی ہمارے سامنے رکھ دی۔ ہم نے ایک نظر انہیں ایک نظر کاپی کو دیکھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے ہماری طرف دیکھا اور کہا "یہ کہانی میری ہے۔ پوری کی پوری میری اپنی، میں نے خود لکھی ہے۔ کہیں سے نقل نہیں کی ہے۔ آپ دیکھئے تو سہی۔" ثانی میاں نے تمام ممکنہ الزامات کی قبل از وقت تردید کر دی۔ ہم نے کاپی اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ کہانی پڑھتے ہوئے ہمیں حیران کن خوشی ہو رہی تھی۔ کہانی ایک عام سے واقعے پر مشتمل تھی اور بمشکل کاپی کے دو صفحات پر مشتمل تھی۔ "یقیناً یہ ایک قابلِ قدر کوشش تھی۔" ہم نے ثانی کی حوصلہ افزائی کے طور سے کہا۔ وہ مسکرا کر بولے "آپ ٹھیک کہتے تھے۔ محنت سے اللہ میاں خوش ہوتا ہے اور محنت سے کامیابی بھی ہوتی ہے۔" شاباش ثانی میاں! محنت انسان کی صلاحیت بڑھاتی ہے۔ بے ایمانی آدمی کی صلاحیت ختم کر دیتی ہے وہ نکما اور ناکارہ ہو جاتا ہے اور کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔" ہم نے خوش ہو کر کہا۔ ثانی میاں نے کچھ دیر بعد پوچھا "کیا اب میں بڑی کہانیاں بھی لکھ سکتا ہوں؟" کیوں نہیں، سوچنے کی، پڑھنے کی اور محنت کرنے کی عادت ڈالو۔ اللہ میاں سے کامیابی کی دُعا کرو۔ اللہ کسی کی ذرا سی محنت کو بھی رائیگاں نہیں کرتا۔ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے" ہم نے جواب دیا۔

"انشاء اللہ میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔" ثانی میاں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"انشاء اللہ" ہم نے پورے یقین سے جواب دیا۔

● ●

ماہانہ مقابلۂ معلومات

ابواُسامہ

سوال در سوال

آنکھ مچولی کی دوسری سالگرہ کے موقعہ پر ہم آپ کے لیے ماہانہ مقابلۂ معلوماتِ عامّہ کا ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ گزشتہ اور گزشتہ سے پیوستہ دائرۂ معلومات کی طرح یہ سلسلہ بھی آپ کو پسند آئے گا۔ آپ کی شرکت یقیناً اسے مزید خوبصورت بنا دے گی۔ آپ کی سہولت کے لیے ہم آپ کو اس دلچسپ مقابلے میں شرکت کا طریقہ بتا رہے ہیں۔

- بظاہر یہ عام سے سوال ہیں جن کے جوابات آپ کو کوپن میں دیے گئے چھوٹے خانوں میں لکھنا ہیں۔
- جب آپ تمام جوابات لکھ چکیں تو پھر یہ جائزہ لیں کہ پہلے سوال کے جواب کا دوسرے سوال کے جواب سے کیا تعلق ہے؟ مثلاً پہلے سوال کا جواب ہے "قائدِاعظم" اور دوسرے سوال کا جواب "کراچی" ہے تو آپ کو بتانا یہ ہے کہ "قائدِاعظم" کا "کراچی" سے کیا تعلق ہے؟ آپ کے نزدیک قائدِاعظم کا کراچی سے جو بھی مضبوط ترین تعلق ہو آپ اسے مستطیل نما لمبے خانے میں لکھ دیجیے۔ یہ تعلق جو بھی ہو ہم اُسے درست تسلیم کریں گے۔ مثلاً قائدِاعظم کراچی میں پیدا ہوئے یا قائدِاعظم کراچی میں دفن ہیں یا قائدِاعظم نے ابتدائی تعلیم کراچی میں حاصل کی۔
- بالکل اسی طرح دوسرے جواب کا تیسرے جواب سے کیا تعلق ہے اور تیسرے جواب کا چوتھے جواب سے کیا تعلق ہے۔ تمام جوابات اور ان کے باہمی تعلق آپ ہمیں اس ماہ کی ۲۵ تاریخ تک بھجوا دیں۔
- تمام جوابات اور تعلق درست ہونے کی صورت میں ہم آپ کے نام اور تصاویر ایک شمارے کے فرق کے ساتھ شائع کر دیں گے۔

• قرعہ اندازی کے ذریعہ تین انعامات بھی دیے جائیں گے۔ پہلا انعام ۱۰۰ روپے کے پرائز بانڈ یا پوسٹل آرڈر کی شکل میں ہوگا... جب کہ بقیہ دو انعام آنکھ مچولی کا تازہ شمارہ یا دیگر خوبصورت کتب ہوں گی۔

• کوپن کے بغیر اس مقابلے میں شرکت ممکن نہیں۔ کوپن کی فوٹو اسٹیٹ یا کاغذ پر علیحدہ سے بنایا ہوا کوپن قابلِ قبول نہ ہوگا۔

• براہِ کرم اپنے جوابات اور نام پتہ صاف اور خوشخط تحریر فرمائیں۔

(ادارہ)

سوالات

① "کام کام اور کام آپ یقیناً کامیاب ہو جائیں گے"۔ یہ قول کس عظیم شخصیت کا ہے ؟

② پاکستان کا پہلا دارالخلافہ ——— تھا۔

③ تحریکِ خلافت کے روحِ رواں، بلند پایہ خطیب، ادیب، شاعر اور صحافی ؟

④ خانہ کعبہ سے قبل مسلمان کس طرف رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے ؟

⑤ وہ عرب مُلک جسے انبیاءؑ کی سرزمین کہا جاتا ہے ؟

⑥ سیّد قطب شہید اور حسن البنا شہید کا تعلق افریقی ملک ——— سے تھا۔

⑦ وکٹوریہ جھیل سے نکلنے والا طویل دریا ———

⑧ وہ جلیلۃ القدر پیغمبر جو آگ کی تلاش میں نکلے اور پیغمبری کے منصب پر فائز ہوئے ؟

⑨ ایک قوم جس پر من و سلویٰ اُتارے گئے ؟

⑩ فلسطین کی ایک مشہور وادی جو کئی بار میدانِ کارزار بنی ؟

●●●●●●

باہانہ مقابلۂ معلوماتِ عامّہ ماہ جولائی ۱۹۸۸ء

(۲)	(۱)	جواب نمبر ۱ اور ۲ کا تعلق
(۳)		جواب نمبر ۲ اور ۳ کا تعلق
(۴)		جواب نمبر ۳ اور ۴ کا تعلق
(۵)		جواب نمبر ۴ اور ۵ کا تعلق
(۶)		جواب نمبر ۵ اور ۶ کا تعلق
(۷)		جواب نمبر ۶ اور ۷ کا تعلق
(۸)		جواب نمبر ۷ اور ۸ کا تعلق
(۹)		جواب نمبر ۸ اور ۹ کا تعلق
(۱۰)		جواب نمبر ۹ اور ۱۰ کا تعلق

مقابلے میں شرکت کے لیے کوپن کا آنا ضروری ہے۔

حاصل کردہ نمبر

نام _____ مکمّل پتہ _____

ہر شعبے میں آپکی ضروریات کو پورا کرنا ہمارا شعار ہے

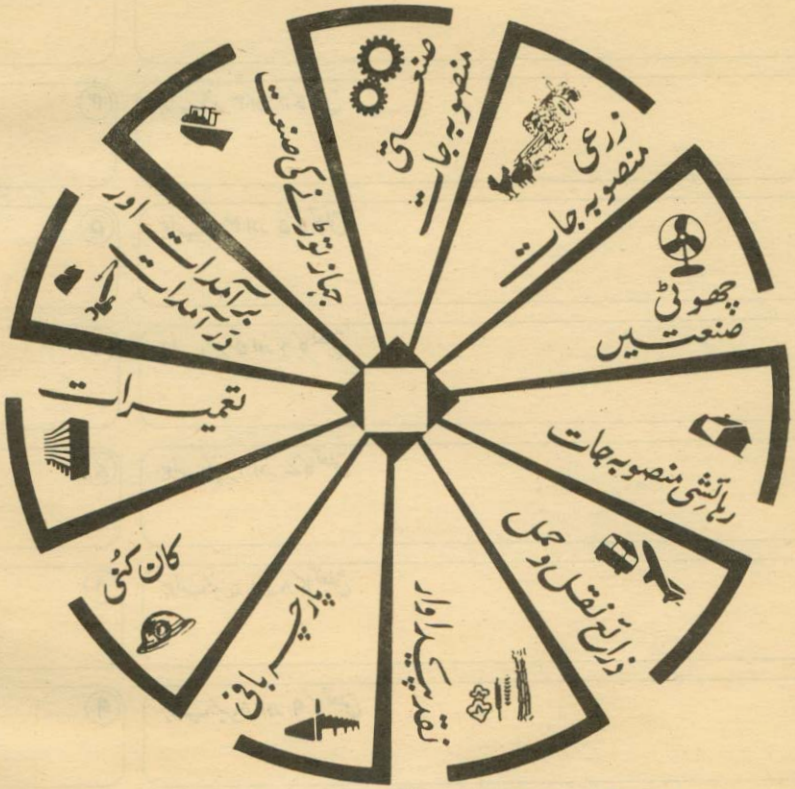

ایم سی بی تشریف لائیے اور ہماری منفرد خدمات سے استفادہ کیجئے۔

مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ

NAB-87 PID (I)

MCB-5

دائرۂ معلومات

مئی ۱۹۸۸ء کا درست حل

(۱) حضرت آدمؑ (۲) حضرت زید بن حارثہؓ (۳) امام ابوحنیفہؒ (۴) داتا گنج بخشؒ (۵) علامہ شبیر احمد عثمانی (۶) حسین شہید سہروردی (۷) فیصل آباد (۸) حافظ الاسد (۹) لیبیا (۱۰) استنبول (۱۱) فرینکلن ڈیلانو روزویلٹ (۱۲) واسکوڈی گاما (۱۳) قلوپطرہ (۱۴) فارابی (۱۵) جوزف پریسٹلے (۱۶) گیری سوبرز (۱۷) گوئٹے (۱۸) سعادت حسن منٹو (۱۹) بابا بُلھے شاہ (۲۰) مائیکل اینجلو

۳ خوش نصیب ساتھی جو بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے

● تجمل الیاس ــ سمن آباد، لاہور ● غلام مرتضےٰ ــ گاڑی کھاتہ، حیدر آباد ● جاوید احمد ــ کراچی

درست جوابات ارسال کرنے والے ذہین ساتھیوں کے نام

● اقبال احمد خان ۔ ملیر، کراچی ● ایم رفیق زاہد ۔ شاہی بازار ۔ گوادر ● ذوالفقار علی ۔ سمن آباد لاہور ● زاہد محمود ۔ لیاقت آباد ۔ کراچی ● آصف کریم ۔ سائٹ پاڑہ، حیدر آباد ● محمد سعد فیصل رحیم یار خان ● مرزا توصیف بیگ ۔ حیدر آباد ● محمد امین سیف الملوک ۔ سانگھڑ ● سید جاوید حیدر شاہ ۔ راولپنڈی ۔ ● سید محمد علی رضوی ۔ لطیف آباد ● جاوید اقبال ناز ۔ فیصل آباد ● حسن مہدی خراسانی ۔ کراچی ● سحر ناز ۔ چوہنگ ۔ لاہور

ایک غلطی کرنے والے ساتھیوں کے نام

● یاسر سعادت ۔ حیدر آباد ● خرم عبدالحمید بٹ ۔ کراچی ● عاصم عبدالحمید بٹ ۔ کراچی ● آصف حشمت ۔ ڈاکخانہ پسنی گمبٹ ● محمد شاہد رسول ۔ حیدر آباد ● نوید علی ہاشمی ۔ ڈاکخانہ سنجھورو ● شعیب احمد ۔ جیسپور پلازہ، کراچی ۔ ● غلام حسین میمن، حیدر آباد ● تصویر زہرہ لیاقت روڈ، راولپنڈی ۔ ● دل اسلم ۔ مسلم باغ، بنوں ● مقصود احمد صدیقی، کراچی ● حامد علی شاہد لاوہ، چکوال ● سنیل گل ۔ برنس روڈ، کراچی ● ثناء اللہ، ہنگورو ڈ، کوہاٹ ● زین العابدین عارف ۔ پشاور۔

مجھے ابّو سے شکایت ہے

میرے ابّو!

مجھے ابّو سے یہ شکایت ہے کہ وہ پہلے مجھے مارتے تھے اب مجھے نہیں مارتے اس لئے کہ میرے ابّو کا انتقال ہو گیا ہے۔

(محمد عمران، نشتر روڈ۔ کراچی)

پیارے عمران اور باقر! موت ایک تلخ حقیقت ہے۔ ہم سب کو ایک دن مرجانا ہے۔ دنیا میں ہمیں جتنے دن کی زندگی ملی ہے۔ وہ عرصۂ امتحان ہے۔ اگر ہم اپنے نیک عمل سے اس امتحان میں کامیاب ہوئے تو دوسری زندگی میں خدا اس کے صلے میں ہمیں ان بزرگوں سے ضرور ملائے گا جو اس دنیا میں ہم سے بچھڑ چکے ہیں۔ (آنکھ مچولی)

جیب خرچ نہیں بڑھاتے

مجھے اپنے ابّو سے صرف یہ شکایت ہے کہ وہ میرا جیب خرچ نہیں بڑھاتے۔

(محمد اصغر ساجد بلوچ۔ جیوانی۔ بکران)

کھیل اور کام

ابّو مجھے ہاکی کھیلنے نہیں دیتے اور ہر وقت کام کراتے رہتے ہیں۔

(امین مغل۔ کندھ کوٹ)

ابّو مجھے کرکٹ کھیلنے نہیں دیتے۔

(آفتاب ملک۔ کندھ کوٹ)

وعدہ پورا نہیں کرتے

میرے ابّو وعدہ کرتے ہیں مگر اُسے پورا نہیں کرتے پہلے بھی ابّو نے ہمیں کراچی لے جانے کا وعدہ کیا تھا مگر پورا نہیں کیا۔ آپ اُن سے کہیں کہ جب وعدہ کریں تو اسے پورا بھی کیا کریں۔

(پشیم راجا پرویز خان۔ جام شورو)

سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟

مجھے ابّو سے صرف اتنی شکایت ہے کہ وہ سگریٹ پیتے ہیں حالانکہ سگریٹ صحت کے لئے بہت خطرناک ہے۔

(منیر احمد فاضل۔ برڈوڈ روڈ۔ لاہور)

گھنٹی زور سے بجاتے ہیں

جب رات کو کام سے فارغ ہو کر ابّو گھر آتے ہیں تو بیل اس قدر زور سے بجاتے ہیں کہ گھر والوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ (سلیم اختر جاوید امتیاز گڑھی۔ بخاری والا۔ مظفر گڑھ)

سلیم! آپ کے ابّو رات گئے تھکے ہارے آتے ہوں گے۔ گھر والوں کو جگانے کے لئے انہیں مجبوراً بیل زور سے بجانا پڑتا ہوگا۔ ایسی شکایت کرنے کے بجائے ابّو کی مجبوری کو سمجھنا چاہیئے۔ (آنکھ مچولی)

ابّو! مجھے کیوں چھوڑ گئے؟

مجھے اپنے ابّو سے شکایت ہے کہ وہ مجھے بہت چھوٹی عمر میں چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور مرتے دم میری صورت بھی نہ دیکھی کیونکہ وہ بیماری کی وجہ سے نابینا بھی ہو گئے تھے۔ مگر آپ میرے ابّو کی مغفرت کے لئے دعا کیجئے گا۔ وہ بہت اچھے بھی تھے۔ انکل میری شکایت ضرور شائع کریں ورنہ میں آپ سے عمر بھر کے لئے ناراض ہو جاؤں گا۔ (سید باقر ندر نقوی۔ ملیر، کراچی)

اسکاؤٹنگ کا شوق

مجھے ابّو سے یہ شکایت ہے کہ وہ مجھے اسکول کی اسکاؤٹنگ میں حصّہ نہیں لینے دیتے!

(احسن فیروز۔ لاہور)

رسالہ کیوں نہ پڑھوں؟

مجھے ابّو سے شکایت ہے کہ وہ مجھے رسالے پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔۔۔۔۔ جب مجھے رسالہ پڑھتے دیکھ لیتے ہیں تو لے کر چھپا دیتے ہیں۔ (محمد شریف سلیمی۔ جہلم)

ایک بے جا شکایت!

مجھے اپنے ابّو سے شکایت ہے کہ وہ مجھے صبح جلدی اُٹھا دیتے ہیں اور چھٹی والے دن بھی دیر تک نہیں سونے دیتے۔ دوسری شکایت یہ ہے کہ وہ مجھے جیب خرچ دیر سے دیتے ہیں جس کی وجہ سے میں "آنکھ مچولی" دیر سے خرید پاتا ہوں۔ (پرنس مبشر علی زیدی۔ انچولی، کراچی)

بھئی مبشر! صبح سویرے اُٹھنا اچھی بات ہے۔ طبّی نقطۂ نظر سے یہ صحت کے لئے مفید ہے دن چڑھے تک سونے سے آدمی سُست اور کاہل ہو جاتا ہے اور پھر آپ نے نہیں سنا کہ "جو سویا وہ کھویا"۔ اُمید ہے، اب آپ خود سویرے اُٹھ جایا کریں گے ابّو کے کہے بغیر۔ (آنکھ مچولی)

انکل! میں اپنا نام شائع کرانے کے لئے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے ابّو سے شکایت یہ ہے کہ وہ مجھے کھیلنے تو دیتے ہیں مگر پیسے کبھی دیتے ہیں کبھی نہیں۔ اور وہ مجھے آنکھ مچولی بھی پڑھنے تو دیتے ہیں مگر کبھی کبھی۔

(مظہر لطیف بٹ۔ لالہ موسیٰ)

مظہر میاں! صرف نام شائع کرانے کے لئے اپنے ابّو کی شکایت کرنا نہایت بُری بات ہے اور آپ کی شکایتیں بھی درست نہیں ہیں۔ بچّوں کو ہر وقت پیسے دیتے رہنا بھی مناسب نہیں ہے اور امتحان کے دنوں میں رسالہ پڑھنے کے بجائے کورس کی کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ اُمید ہے آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ (آنکھ مچولی)

سائیکل اور جیب خرچ کا مسئلہ

مجھے اپنے بابا جان سے دو شکایتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مجھے سائیکل نہیں لے کر دیتے اور دوسری یہ کہ وہ مجھے جیب خرچ نہیں دیتے۔ ویسے مجھے بابا جان بڑے اچھے لگتے ہیں۔

(ناصر نیاز۔ اسلام آباد)

اژدھا

زرافہ

بانسری بجانے کا ایک انداز

آکٹوپس

انگلی یا قلم؟

زیبرا

ورجینیا کے ایک بچے ٹرینٹ کولی کو "چڑیا گھر" دیکھنے کا بہت شوق تھا لیکن اُس کے ڈیڈی اپنے کاروبار میں بہت مصروف رہتے تھے۔ ایک دن ٹرینٹ کے ذہن میں ایک عجیب و غریب خیال پیدا ہوا چنانچہ اُس نے رنگوں کی مدد سے اپنے ہاتھوں اور پیروں پر مختلف نقش و نگار بنائے۔ جس نے بھی دیکھا وہ لطف اندوز ہوا۔ ٹرینٹ کی تنہائی اب دُور ہو گئی ہے اور اب اسے "چڑیا گھر" جانے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ اب وہ خود "چلتا پھرتا چڑیا گھر" ہے۔

لطف - لذّت - ذائقہ
® ہوئیسٹ
ڈراپس
گلے کی خراش میں
بیحد مفید
گلے میں خراش۔ہوئیسٹ کی تلاش
اورسب ٹھنڈا ٹھنڈا
450 GRAMS
HOEST DROPS ®
delicious
cool
refreshing
TIPOO ENTERPRISES FAISALABAD
MASS

ہمشکل

فاطمہ صبا قمر الدین

"تم لوگ بالکل نکمے اور کام چور ہو، ایک دم سُست اور کاہل۔ شوبی کتنا اچھا بچّہ ہے۔ رات کو بھی پڑھتا ہے اور دن میں بھی زیادہ تر وقت پڑھتا نظر آتا ہے۔ اور ایک تم لوگ ہو ہر وقت تفریح کی اجازت طلب کر رہے ہوتے ہو۔ اور پڑھنا لکھنا سب دکھاوا ہے اور تمھاری والدہ نے بتایا ہے کہ کل تم لوگ پوچھے بغیر کامیڈی شو دیکھنے تھیٹر چلے گئے تھے۔"

ابّا جان، ایاز، عبّاس اور رزّاق تینوں کو جھاڑ پلا رہے تھے۔ اور خاصے برہم تھے۔ اور وہ تینوں مجرموں کی طرح سَر جھکائے کھڑے تھے۔ وہ اپنی کل والی حرکت پہ شرمندہ بھی تھے۔ مگر دِل ہی دِل میں اپنے کزن شعیب کو بھی کوس رہے تھے۔ جو اپنے قصبے سے یہاں پڑھنے آگیا تھا۔ شعیب کی ذہانت کا طعنہ اُنھیں وقتاً فوقتاً ملتا رہتا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ شوبی سے بہت نالاں تھے۔ ابھی تینوں بھائی یہی بات سوچ رہے تھے کہ ابّا جان کی دھاڑ سُنائی دی "جاؤ دفع ہو جاؤ نکمّو۔"

گویا دربارِ شاہی سے اُنھیں بہت بے عزّت طریقے سے بری کر دیا گیا تھا۔ تینوں منہ بسورتے ہوئے ایاز کے کمرے کی طرف چل دیے، جو بھائیوں میں سب سے بڑا۔۔۔۔ اور خاصے ٹھنڈے مزاج کا مالک تھا۔ عبّاس جو ایاز سے چھوٹا تھا، غصّے میں ایک دم پاگل ہو جانے والی شخصیت تھا۔ جبکہ رزّاق سب سے چھوٹا ہونے کی بنا پر اِدھر اُدھر کی خبریں اُن دونوں کو سُنایا کرتا تھا۔ تینوں کو جب بھی ڈانٹ پڑتی، وہ ایک ساتھ دِل کی بھڑاس نکالنے اور منصوبہ بنانے کے لیے وہیں براجمان ہو جاتے۔ اس وقت بھی "مُلّا جی کی دوڑ مسجد تک" کے مصداق سب کی دوڑ ایاز کے کمرے کی جانب تھی۔ کمرے میں پہنچتے ہی حفاظتی اقدامات سخت کر دیے گئے۔ یعنی دروازہ بولٹ کر کے پردے گرا دیے گئے اور تینوں اپنے حواس درست کرنے لگے۔ ایاز نے میزبانی کے

فرائض انجام دیتے ہوئے پانی کا ٹھنڈا گلاس ان دونوں کو بھی پلایا اور خود بھی پیا۔ تاکہ دلوں میں لگی آگ کچھ ٹھنڈی ہو سکے۔

رزّاق نے گلاس خالی کر کے میز پر براجمان ہوتے ہوئے کہا" ایاز بھائی! شوبی بھائی کے نمبر بہت بڑھتے جا رہے ہیں۔"

"ہوں" ایاز نے لمبا سا ہنکارہ بھرا اور دانشورانہ انداز میں صوفے پر دراز ہو گیا۔

عبّاس تو آج کی ڈانٹ سے کچھ زیادہ ہی جلا بُھنا بیٹھا تھا اسی لیے وہ ذرا آڑھے ترچھے انداز میں قالین پر لیٹا ہُوا تھا۔ اُس کے لیٹنے کے انداز سے یوں لگتا تھا، جیسے وہ بریک ڈانس کر رہا ہو۔ کافی دیر بعد انگلش میوزک کے شوقین عبّاس کی آواز انگلش گانوں کے سے انداز میں نکلی" اب تو کچھ سوچنا پڑے گا"

"اور عبّاس بھائی! اب تو تفریح بھی بند۔ ابّا جان نے جیب خرچ بھی بند کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔" رزّاق نے خبرنامے والے انداز میں کہا۔

"کیا"؟ عبّاس اور ایاز کی آوازیں بیک وقت آئیں۔

"جی ہاں" رزّاق نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا" کل دوپہر کے وقت ڈائننگ ٹیبل پر یہ خبر نشر ہوئی اور بہ نفس نفیس ابّاجان نے سُنائی تھی۔"

"چلو بھئی۔ ویسے یہ ڈائننگ اسٹوڈیو ہی منحوس ہے۔ یہاں جب بھی خبریں ہوتی ہیں، بُری ہی نشر ہوتی ہیں۔" عبّاس نے جلے بُھنے انداز میں کہا۔

"مگر یہ رزّاق بھی تو چلتا پھرتا بی بی سی ہے اِدھر اُدھر کی جاسوسی کرنا اور پھر مرچ مصالحہ لگا کر سُنانا۔"

"کیا، کیا۔۔۔ میں مرچ مصالحہ لگاتا ہوں" رزّاق نے چہرے پر پارہ بجاتے ہوئے کہا۔

"اچھا، اچھا اب زیادہ منہ نہ پھلاؤ۔ ورنہ میں خوفزدہ ہو کر بھاگ جاؤں گا۔" ایاز کے اس جُملے نے خاطر خواہ اثر کیا اور عبّاس اور رزّاق کا موڈ صحیح ہو گیا۔ رزّاق واپس میز سنبھال کر بیٹھ گیا۔

"ارے بھئی وہ کل والا واقعہ یاد ہے"؟ عبّاس کو اچانک یاد آیا تو وہ اُچھل کر بیٹھ گیا۔

"کونسا واقعہ"؟ رزّاق نے فوراً پوچھا۔

"ارے بھئی وہ شوبی کا ہمشکل۔۔۔"

"اچھا اچھا" رزّاق اور ایاز نے بات کاٹتے ہوئے بیک وقت کہا۔

"مگر بعد میں ثابت بھی تو ہو گیا تھا کہ شوبی تو گھر پر اسٹڈی کر رہا تھا اور وہ پڑھتا بھی تو ذرا آواز سے ہے اس لیے پتا چل جاتا ہے۔ امّی کہہ رہی تھیں کہ کل رات شوبی پڑھ رہا تھا اُس کے کمرے سے

آواز بھی آرہی تھی" ایاز نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ جواب میں رزاق اور عباس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"چلو چھوڑو" ایاز نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

"ہم لوگ بھی تو اسٹڈی کرتے ہیں مگر ابا جان کو نظر نہیں آتا" عباس نے جل بھن کر کہا۔

"ارے بھئی گھر کی مرغی دال برابر" رزاق نے بڑی مسکینی سے محاورہ دہرایا۔

"ویسے وہ ہم سے زیادہ ذہین تو نہیں" ایاز نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"آج سے ہم بھی دن کے بجائے رات میں پڑھا کریں گے تاکہ ابا جان دیکھ کر خوش ہوں" عباس ہاتھ اٹھا کر فیصلہ کن انداز میں بولا "بالکل ٹھیک" دونوں نے تائید کی اور گویا میٹنگ برخاست ہوگئی۔

رزاق اور عباس اپنے اپنے کمروں کی طرف چل دیے۔ دوسرے روز سے اُن سب نے بھی رات میں پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر ابا جان نے بھی اپنا غصہ فریزر میں رکھ دیا لیکن وہ تینوں اب بھی کڑھتے رہتے تھے کیونکہ شوبی کی تعریف اب بھی زیادہ ہوتی تھی کیونکہ وہ دن میں بھی پڑھتا تھا۔

رزاق اور عباس اپنے اپنے کمروں میں پڑھنے میں مصروف تھے اور شوبی کے کمرے سے بھی آواز آرہی تھی، لیکن آج ان تینوں کا پڑھنے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ آج قریبی ہوٹل میں ایک مزاحیہ فنکار کا شو تھا۔ اور وہ تینوں اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے یہ سوچ کر افسردہ ہو رہے تھے کہ اتنا اچھا شو ہاتھ سے نکل جائے گا۔

"آج تو ابا جان سے اجازت لے ہی لینی چاہیئے" ایاز نے سوچا اور رزاق اور عباس کو بھی ساتھ لے کر امی کی سفارش حاصل کرنے چل دیا۔

"آداب امی جان" تینوں نے مسکین صورت بناتے ہوئے بڑے سریلے انداز میں کہا۔ عباس نے ایاز کو ٹہوکا دیا۔

"امی... وہ ہوٹل پلازہ میں ایک کامیڈی شو ہے۔ امی ہم جانا چاہتے ہیں۔ آپ ابو سے سفارش کر دیں" ایاز نے اٹکتے ہوئے بڑی لجاجت سے اپنا مدعا بیان کیا۔

"اچھا ٹھیک ہے، چلو میرے ساتھ" کچھ دیر سوچنے کے بعد امی نے آمادگی ظاہر کر دی۔ تینوں ان کے پیچھے بھیگی بلیاں بنے ہوئے ابا جان کے کمرے کی طرف چل دیے۔ شوبی اپنے کمرے کے باہر کھڑا انھیں جاتا دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ تینوں کا خون کھول اُٹھا مگر مصلحتاً ضبط کر گئے۔ ابا جان

کی خدمت میں اُن کی پیشی ہوئی اِمی تے زبردست طریقے سے اُن کی سفارش کی، اس لیے دربارِ شاہی میں اسے شرفِ قبولیت بھی حاصل ہو گیا۔ وہ خوشی سے سینہ پُھلاتے ہوئے اپنے اپنے کمروں کی طرف چل دیے۔ جلدی جلدی تیار ہو کر وہ ہوٹل پہنچے۔ ابھی وہ اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہی تھے کہ اگلی قطار میں اُنھیں وہی لڑکا بیٹھا نظر آیا۔ ہُو بہُو شوبی کا ہمشکل۔ تینوں غور سے اُسے دیکھنے لگے۔ اتنے میں شو شروع ہو گیا۔ اور تمام لوگ شو دیکھنے میں محو ہو گئے۔ شو ختم ہونے کے بعد تینوں بھائی اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے گھر کی جانب چل پڑے۔ وہ لڑکا بھی اُن کے جاتے ہی اُٹھا اور تیزی سے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

تینوں بھائی گھر پہنچ کر کپڑے تبدیل کرنے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں گُھس گئے۔ آتے وقت انھوں نے دیکھا کہ شوبی کا کمرہ معمول کی طرح بند تھا۔ باہر "ڈونٹ ڈسٹرب" کا بورڈ لگا ہُوا تھا اور اندر سے شوبی کے پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ کمرے کی لائٹ بھی آن تھی۔ ابھی وہ کپڑے تبدیل کر کے بیٹھے ہی تھے کہ باہر گیٹ پر کوئی چیز دھم سے گری اور چیخ سُنائی دی سب گیٹ کی جانب دوڑ پڑے۔ وہاں تو عجیب ہی نظارہ تھا۔ شوبی صاحب گیٹ کے اندر گھاس پر پڑے، ٹانگ پکڑے ہائے وائے کرنے میں مصروف تھے۔ پینٹ کا پائنچہ آدھے سے زیادہ پھٹ چکا تھا۔ وہ اسی رنگ کے لباس میں ملبوس تھا، جس میں وہ شو والا لڑکا۔

ابا جان اُس کی تکلیف کا خیال کیے بغیر گرجے "کہاں سے آ رہے تھے تم اس وقت؟" لیکن شوبی کے حلق سے چیخوں اور مسلسل کراہوں کے سوا کچھ نہیں نکل رہا تھا۔ ایاز نے ابا جان کی توجہ شوبی کے کمرے کی طرف دلائی جہاں اندر سے شوبی کے پڑھنے کی آواز مُسلسل آ رہی تھی پھر تو گویا سب کی سمجھ میں سارا معاملہ آ گیا لیکن اس وقت اُسے فوری طبّی امداد کی ضرورت تھی۔ اس لیے اُسے فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ شوبی کی ٹانگ میں فریکچر ہو گیا تھا۔

بعد میں یہ راز کُھلا کہ شوبی صاحب دن میں اپنا کام ختم کر کے اکثر رات کو تفریح کرنے پچھلی کھڑکی سے باہر نکل جاتے تھے۔ اور مُحترم شوبی اتنے عرصے اپنے نمبر بڑھانے کے بہانے ٹیپ میں دن میں یاد کیا جانے والا سبق ریکارڈ کر لیا کرتے تھے اور جاتے وقت طویل دورانیے والا کیسٹ لگا کر وہاں سے رفو چکر ہو جایا کرتے تھے، لیکن آج جب وہ شو دیکھ کر آئے اور گیٹ پھلانگنے کی کوشش کی تو اُن کی پتلون کا پائنچہ گیٹ کے قریب لگی کیل میں پھنس گیا، جس کی وجہ سے وہ اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھے۔ ایاز، عباس اور رزاق کو اس حادثے کا افسوس تو تھا، لیکن وہ مطمئن بھی تھے۔

کارٹون اسٹوری مکمل کیجئے

نوید ظفر کیانی

نمک پارے

کل رات میں نے دیکھا تھا کیسا سُہانا خواب
ہو جائے یوں تو جانیے سب بیکلی گئی
جس وقت میں نے ابّو جی کو دی رپورٹ بُک
اُس وقت اتّفاق سے بجلی چلی گئی

پھول کھلتے ہیں صبا کی نرم تھپکی سے ظفر
فائدہ دِکھتا نہیں آندھی چلانے سے مجھے
پوچھتا تھا ایک بچّہ کل سزا پا کر کہ سر!!
کیا سبق آ جائے گا یوں بید کھانے سے مجھے

طیّبہ تسنیم

روشنی کی کِرن

ملک روم میں ایک نابینا لڑکا لُوقا رہتا تھا۔ جس کا اس بھری دنیا میں سوائے ایک وفادار ساتھی کتّے فان کے اور کوئی نہ تھا۔ لُوقا بھیک مانگ کر اپنی زندگی گزار رہا تھا وہ صبح سے شام تک سفید چھڑی کے سہارے شہر، گاؤں کی خاک چھانتا اور بھیک مانگتا اور مانگے ہوئے پیسوں سے اپنی اور فان کے پیٹ کی آگ بُجھاتا۔ رات گزارنے کے لیے کسی فٹ پاتھ یا پیڑ کے نیچے لیٹ رہتا۔ جب لُوقا گہری نیند سو رہا ہوتا تو اُس کا ساتھی فان اس کی حفاظت کیا کرتا۔

وہ رات بڑی سرد تھی۔ لوقا کے پاس سردی سے بچنے کے لیے کوئی گرم کپڑا نہ تھا۔ وہ ایک پیڑ کے نیچے سُکڑا ہُوا بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کاش اس کی آنکھوں میں روشنی ہوتی تو وہ کوئی ایسا کام کرتا جس سے پیسے کمائے جا سکتے۔

اور اچھی زندگی گزاری جاسکتی۔ فان لوقا کے جسم سے لپٹا ہوا اونگھ رہا تھا۔ فان کو بھی اس رات بے انتہا سردی لگ رہی تھی۔ دونوں اس طرح ملے ہوئے بیٹھے تھے، جیسے ایک دوسرے کو سردی سے بچانا چاہتے ہوں۔ سوچتے سوچتے لوقا کی آنکھ لگ گئی اور وہ سخت تھکن کے باعث بیٹھے بیٹھے سمٹ کر سو گیا۔ اچانک اس کے کانوں میں جیسے ایک آواز گونجی: "لوقا پیارے! کیا تم مجھے دیکھ سکتے ہو؟"

"افسوس!" لوقا بڑے دردناک لہجے میں بولا: "میں اندھا ہوں۔ کچھ نہیں دیکھ سکتا۔"

"پیارے دوست! یہ بڑی افسوسناک بات ہے۔ میں شاید تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔" آواز پھر گونجی۔

"کیا آپ میری آنکھوں کی روشنی مجھے واپس دلا سکتے ہیں؟" لوقا نے پوچھا۔

"نہیں میرے دوست! میں ایسا نہیں کر سکتی۔ البتہ میں تمہیں ایک ایسا طریقہ بتا سکتی ہوں، جس کے ذریعے تم اپنی آنکھوں کی روشنی حاصل کر سکتے ہو۔ میں جو باتیں تمہیں بتا رہی ہوں، انہیں غور سے سنو۔ میری باتوں پر پوری طرح عمل کرنے سے تمہیں تمہاری آنکھوں کی روشنی واپس مل جائے گی۔" آواز تیز تر ہوتی چلی گئی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں آپ کی تمام باتیں غور سے سنوں گا اور آپ کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا تاکہ میں اپنی آنکھوں کی روشنی واپس حاصل کر سکوں اور اچھی طرح زندگی گزار سکوں۔"

لوقا نے جواب دیا۔ تو سنو۔۔۔!" لوقا کو محسوس ہوا، جیسے کوئی اس کے بالکل قریب آکر اس سے کہہ رہا ہو۔

"آج سے جب کبھی تم کوئی نیک کام کرو گے، خواہ وہ کام کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو تو تمہاری آنکھوں کی تاریکی میں روشنی کی ایک کرن پیدا ہو جائے گی۔ اور جیسے جیسے تمہاری نیکیاں بڑھتی جائیں گی، ویسے ہی تم ہر چیز کو صاف طرح سے دیکھ سکو گے لیکن یاد رکھو! اگر تم نے رحم دلی اور نیک نیتی کے بجائے بُرے کام انجام دیے تو تمہیں حاصل شدہ روشنی ضائع ہو جائے گی۔"

اچانک لوقا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے کتے فان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کچھ سوچتے سوچتے دوبارہ سو گیا۔ حسبِ معمول وہ صبح سویرے اٹھا اور فان کے ساتھ شہر کی جانب چل پڑا اچانک فٹ پاتھ پر لیٹے ہوئے بھکاری سے لوقا کو ٹھوکر لگ گئی۔ "خدا کے واسطے، غریب بابا کو ایک پیسہ دیتے جاؤ!" بھکاری نے درد بھری آواز میں التجا کی۔

"مجھ پر رحم کھاؤ بابا! خدا کے واسطے اندھے پر رحم کھاؤ۔ ہم دونوں ایک ہی جیسے ہیں! میں بھی آپ کی طرح بھکاری ہوں اور اندھا بھی۔" لوقا نے جواب دیا۔

"افسوس! میں تم سے کہیں زیادہ بدقسمت ہوں۔ میرے دونوں پیر اور بازو کٹے ہوئے ہیں۔" بھکاری نے لوقا سے کہا۔ لوقا نے ترس کھاتے ہوئے ایک پیسہ اپاہج بھکاری کو دے دیا اور کہا: "لو بابا! بس میرے پاس

تو یہی ہے" بھکاری پیسے لے کر دُعائیں دینے لگا اور لوقا کو اچانک یوں محسوس ہُوا جیسے اس کی آنکھوں کا گھپ اندھیرا کچھ کم ہو گیا ہو۔

"اوہ میرے خُدا! میرا خواب کتنا سچا نکلا" لوقا خوشی اور حیرت سے چیخ پڑا۔ تمام دن لوقا سارے شہر میں خوشی خوشی پھرتا رہا۔ جس نے بھی رحم کھا کر جو کچھ اُسے دے دیا، اس نے لے لیا اُس نے اپنے اور فان کے لیے روٹی خریدی اور دونوں پیڑ کے نیچے بیٹھ کر روٹی کھانے لگے اسی وقت لوقا کو ایک آواز سُنائی دی "بھُوکی بڑھیا پر رحم کھاؤ، بیٹا! میں نے کل سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے" لوقا نے اپنے حصّے کی روٹی اس کمزور بڑھیا کی طرف بڑھا دی۔

"لومائی! تم بھی کچھ روٹی کھا لو" بڑھیا نے روٹی لی اور اُسے دُعائیں دینے لگی۔ لوقا کو محسوس ہوا جیسے اُس کی آنکھوں میں روشنی کی ایک کرن اور پیدا ہو گئی ہو۔ لوقا زمین پر لیٹ کر سو رہا جب اس کی آنکھ کھُلی تو اُسے شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے پاس اب ایک پھُوٹی کوڑی بھی نہ تھی، جس سے وہ اپنے کھانے کے لیے کچھ خرید سکتا۔ فان نے اس کی یہ مشکل حل کر دی۔ وہ تیزی سے سڑک کے اُس پار گیا اور ایک آوارہ گھُومتی ہوئی مُرغی کو اپنے منہ میں دبا کر لوقا کے پاس لے آیا۔ لوقا نے سوچا "چلو، اس مُرغی کو بازار میں فروخت کر کے کچھ کھانا خرید لوں" لوقا نے کتّے کے منہ سے مُرغی نکالی اور بازار کی طرف چل دیا مگر ابھی وہ صرف چند قدم ہی چلا تھا کہ اُسے محسوس ہوا جیسے اُس نے اپنی دونیکیوں سے جو روشنی حاصل کی تھی، وہ یکایک غائب ہو گئی ہے۔ لوقا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر حالت میں مُرغی کے اصل مالک کو تلاش کر کے مُرغی اُس کے حوالے کرے گا، چاہے وہ خود بھُوک سے مَر ہی کیوں نہ جائے۔ کئی گھنٹے کی بھاگ دوڑ کے بعد آخر وہ مُرغی کے مالک کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ جب وہ مُرغی لوٹا رہا تھا تو اُس نے پھر محسوس کیا کہ اُس کی کھوئی ہوئی روشنی جیسے واپس چلی آئی ہو۔ کئی ہفتوں کی مسلسل کوشش کے بعد چھوٹے چھوٹے نیک کام کرنے کی وجہ سے اُس کی آنکھوں میں اتنی روشنی پیدا ہو چکی تھی کہ سڑک پر چلتے پھرتے آدمی اس کو سایوں کی طرح نظر آنے لگے۔ اب اُس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ ایک ایک پیسہ جمع کر کے ایک ایسا چشمہ ضرور خریدے گا جس کے متعلق اُس نے سُنا تھا کہ کمزور آنکھیں رکھنے والے لوگ اس کی مدد سے ہر چیز اچھی طرح دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

ایک دن اُس کا سامنا اُس اندھے اپاہج سے ہو گیا، جس کو اُس نے پہلے پہل ایک پیسہ دیا تھا۔

"افسوس! میرے پاس کچھ بھی نہیں" اُس نے درد بھرے لہجے میں بھکاری سے کہا۔ حالانکہ اس کے پاس اِس وقت چند سکّے موجود تھے۔ اچانک اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور پھر گہری تاریکی چھا گئی۔ لوقا کا دِل ڈوب گیا۔ اُس نے دِل میں پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ جھُوٹ اور بُری باتوں سے پرہیز کرے گا، مگر چشمہ

خریدنے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ چشمہ لینے کی خاطر ذرا سے جھوٹ نے اُس سے روشنی چھین لی وہ اُداس ہو کر دریا کے کنارے بیٹھ گیا فان بھی سر جھکائے اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اچانک کسی بچّے کے رونے کی آواز آئی، جیسے کوئی بچّہ دریا میں ڈوب رہا ہو۔

"بچاؤ۔ بچاؤ" بچّہ اپنی مدد کے لیے رو رو کر پکار رہا تھا۔ لوقا نے گھبرا کر سوچا "مجھے کیا کرنا چاہیئے؟" وہ کنارے کی طرف بڑھا۔ آواز اور تیز ہوگئی "بچاؤ۔ بچاؤ۔ خُدا کے لیے مجھے بچاؤ۔ میری مدد کرو۔ میں ڈوب رہا ہوں"۔

لوقا نے سوچا "مجھے ہر حالت میں ڈوبتے ہوئے بچّے کو بچانا ہے" وہ تیز تا تیز تر آواز کے قریب پہنچ گیا اس کے ساتھ ساتھ فان نے بھی بے چین ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دی وفادار فان ڈوبتے ہوئے بچّے کے کپڑے کو منہ میں پکڑ کر لوقا کے قریب لے آیا لوقا نے بچّے کو مضبوطی سے پکڑ لیا فان ان دونوں کو گھسیٹتے گھسیٹتے کنارے کی طرف لے آیا۔ لوقا اس بچّے کو پکڑے ہوئے فان کی رہبری میں کنارے تک پہنچا۔ اچانک اُسے زبردست ٹھوکر لگی۔ بچّہ تو اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر ساحل پر گر گیا، لیکن لوقا خود کو نہ سنبھال سکا اس کا سَر ایک نوک دار پتھر سے جا ٹکرایا، بڑی مُشکل سے فان، لوقا کو اُوپر کنارے تک لایا اور زور زور سے بھونکنے لگا۔ لوگ شور سُن کر جمع ہوگئے بچّے کو مرتے مرتے بچا لیا گیا اور لوقا کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ چوٹ لگنے سے لوقا کے سر سے کافی خون بہہ گیا تھا اور کمزوری کی وجہ سے وہ بے ہوش پڑا تھا۔ اس کا وفادار ساتھی فان بے چینی سے اسپتال میں اِدھر اُدھر بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ چند گھنٹوں کے بعد لوقا کو ہوش آیا اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اُس کے چاروں طرف اُجالا ہی اجالا پھیلا ہُوا تھا اور اُسے ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی کیوں کہ اس کی آنکھوں کی روشنی ایک بڑا نیک کام کرنے کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے واپس آچکی تھی۔

پھولوں کا استعمال

دنیا میں ہر قسم کے پھول پیدا ہوتے ہیں اور ہر جگہ پھول دینے کا الگ رواج ہے، یہ محبت، خوشی اور خیرسگالی کی علامت سمجھے جاتے ہیں لیکن بعض ملکوں میں پھولوں کے کچھ اور معنی اور تصوّر بھی وابستہ ہیں۔ برازیل میں نارنجی رنگ کے پھول کو تالاب یا قبر پر رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ میکسیکو میں پیلے پھول ماتمی تقریبات کے لئے مخصوص ہوتے ہیں جبکہ فرانس میں انہیں محبوبہ سے شکایت کے اظہار کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ اور روس میں، اگر کسی خاتون کو پیلے پھول کا تحفہ پیش کیا جائے تو وہ بُرا مان جاتی ہے۔

مرسلہ: ایم اکرم سیال نوکی ——— وکیل والا تحصیل ننکانہ صاحب

جوجو
سب سے اچھی چیونگ گم جوجو کی یہ ببل گم
کھیل کا کھیل
لذّت کی لذّت
Bubble Gum
گلف فوڈ انڈسٹریز گوجرانوالہ (پاکستان)

کہیں وہ آپ ہی تو نہیں!

- جو اپنے گھر، خاندان اور محلّے میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہوں۔
- جن کی ذہانت کے چرچے عام ہوں۔
- جنھوں نے اپنی قابلیت اور کامیابیوں کی دُھوم مچا رکھی ہو۔
- جنھوں نے کوئی اہم چیز ایجاد یا دریافت کی ہو۔
- جن کی ذہانت پر دوسرے رشک کرتے ہوں اور اُن جیسا بننے کی خواہش رکھتے ہوں۔
- جو مستقبل میں ستاروں پر کمند ڈالنے کا عزم رکھتے ہوں۔

کہیں وہ آپ ہی تو نہیں!

اگر وہ آپ ہی ہیں یا آپ کی نظر میں آپ کا کوئی دوست ان خوبیوں کا مالک ہے تو آج ہی اپنا یا اپنے دوست کا مکمّل تعارف بمعہ تصاویر ارسال کر دیں۔ اگر آپ ہمارے معیار پر پُورے اُترے تو آپ کا انٹرویو "آنکھ مچولی" کی زینت بن سکتا ہے

تعارف میں نام، کلاس، تاریخِ پیدائش، مشاغل اور انعامات کی تفصیل، اب تک کون سے اہم کام کیے ہیں، مستقبل کے عزائم۔ کیا بننا چاہتے ہیں؟ یہ سب تفصیلات ضرور لکھیے۔

ماہنامہ "آنکھ مچولی"
ڈی، ۱۱۲، نورس روڈ، سائٹ، کراچی

نئی تحریریں

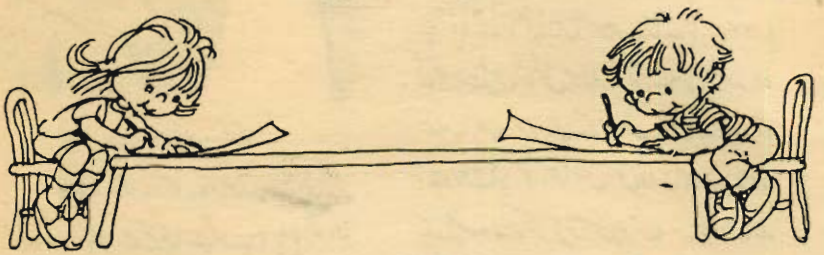

نعتِ رسولؐ

مرسلہ: ملک منیر احمد ہارون آباد

بہاریں ہنسیں اور گل مسکرائے
محمدؐ جہاں میں ہیں تشریف لائے

ہوا ہے جہاں میں ظہورِ محمدؐ
زمانے میں چمکا ہے نورِ محمدؐ
مٹے روئے ہستی سے ظلمت کے سائے
محمدؐ جہاں میں ہیں تشریف لائے

فلک نے ستاروں کے موتی بکھیرے
ہوئے دور دنیا سے سارے اندھیرے
ملائک نے نغمے مسرت کے گائے
محمدؐ جہاں میں ہیں تشریف لائے

"تتلی"

سیّد جاوید حیدر شاہ

اُڑتی اُڑتی آئی تتلی
سب کے دل کو بھائی تتلی
پھولوں کی شہزادی ہے یہ
خوشیوں کی آبادی ہے یہ
اس کی صورت بھولی بھالی
اس کی رنگت پیاری پیاری
قوس و قزح کا جیسے ٹکڑا
شمس و قمر کا جیسے مکھڑا
جیدی جہاں میں اس کی شہرت
میرے مولا کی ہے قدرت

چشمِ تصوّر

شہباز شمشاد ، کراچی

بلیٹ اٹھائے ہوئے ارمغان نے ابّو کے کمرے کے سامنے سے تیزی سے گزر جانا چاہا، مگر ابّو کی تیز آواز نے اُسے رُکنے پر مجبور کر دیا "میاں صاحبزادے کمرے میں تشریف لے آیئے"۔ ارمغان ڈرتے ڈرتے قدم اٹھاتا ہوا ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"کیا وقت ہو رہا ہے؟ کچھ خبر ہے۔؟" ابّو نے ناک پر عینک جماتے ہوئے کہا۔

"جی ساڑھے سات بج رہے ہیں"۔ ارمغان نے مری مری سی آواز میں جواب دیا۔

"اور آپ کو کب تک گھر پہنچ جانا چاہیئے تھا؟"

"چھ بجے تک"۔ ارمغان کی دھیمی سی آواز نکلی۔

"کتنی دیر مزید باہر رہے؟" اگلا سوال کیا گیا۔

"ڈیڑھ گھنٹہ!"

"ڈیڑھ گھنٹے میں کتنے منٹ ہوتے ہیں؟"

"نوّے منٹ!" اس نے بمشکل آواز نکالی اور بدستور سر جھکائے اپنی سزا کا انتظار کرنے لگا جو گھر سے زیادہ دیر باہر رہنے پر اسے اکثر دی جاتی تھی۔ مگر آج اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ نوّے منٹ تک مرغا بننے کا تصوّر ہی ہولناک تھا۔ ارمغان کو رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ گراؤنڈ سے واپسی پر خواہ مخواہ ہی وہ اس خوبصورت تتلی کے پیچھے چل پڑا تھا اور پھر اس نے دیکھا کہ ایک تتلی ایک پری بن گئی ہے اور کہہ رہی ہے۔ "آؤ ننھے ساتھی میں تمہیں دنیا کے نامور لوگوں کی فہرست میں شامل ہونے کا گُر بتاؤں"۔ اور وہ اندھا دھند اس پری کے تعاقب میں دوڑنے لگا۔

اُسے وقت گزر کا احساس اس وقت ہوا جب وہ ایک پتھر سے ٹکرا کر زمین پر آ رہا۔ اور اس نے فوراً گھر کی جانب دوڑ لگا دی۔ مگر دیر تو بہر حال ہو ہی چکی تھی اور اس وقت وہ ابّو کے سامنے کھڑا سزا کا منتظر تھا۔

کافی دیر ہو گئی ابّو کی آواز سنائی نہ دی تو ارمغان نے سر اٹھا کر دیکھا مگر ابّو کمرے میں موجود نہ تھے۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا تو دیکھا کہ ابّو اور رضوان انکل باتیں کرتے ہوئے کمرے کی طرف آ رہے تھے۔

ابّو نے آتے ہی حکم دیا "مرغا بن جاؤ"۔ مگر اس کے مرغا بننے سے پیشتر ہی رضوان انکل گویا ہوئے۔ "بھئی ارمغان تو بے حد مؤدب بچّہ ہے تم اس کو خواہ مخواہ سزا دے رہے ہو"۔

رضوان انکل کی بات سن کر وہ پوری طرح خوش بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ابّو کی سخت آواز اسے حقیقت کی دنیا میں لے آئی۔ "جاؤ جا کر پڑھو۔ اور آئندہ دیر کی تو تمہاری خیر نہیں"۔ اس نے سر ہلایا اور جانے کے لئے مڑا۔

"جعفر! تمہارا یہ بیٹا نہ جانے کس پر گیا ہے"۔
رضوان انکل کی آواز آئی۔ وہ غصے میں کھول کر رہ گیا۔
اور کچھ عرصے بعد وہ باکسنگ کا لباس پہنے رنگ میں
کھڑا تھا اور اپنے مخالف کو تابڑ توڑ حملوں سے زخمی کر رہا
تھا۔ ارمغان نے غور سے دیکھا تو اس کے مخالف رضوان
انکل تھے۔ اس سے قبل کہ وہ رضوان انکل کو
مزید زخمی کرتا، ارسلان نے اس کو جھنجھوڑ ڈالا۔ "بھائی
جان! آپ کو پتہ ہے، کل فیصل بھیا آ رہے ہیں"۔
"کیا ... سچ"! وہ خوشی سے بولا۔
"جی ہاں بالکل سچ"۔ ارسلان نے جواب دیا۔
اور ارمغان خوشی سے اچھلنا کودنا اپنے کمرے
میں چلا گیا۔ اسے یاد آیا کہ پچھلے سال جب فیصل بھیا
آئے تھے تو کتنا مزا آیا تھا۔ فیصل بھیا نے اسے ڈھیر ساری
کہانیاں سنائی تھیں اور تفریحی مقامات پر لے گئے
تھے۔ اور حساب کے تمام مشکل سوالات کس قدر آسانی
سے سمجھا دیتے تھے۔
"اُف کتنا مزا آئے گا"۔ ارمغان نے خوشی سے
مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔
صبح وہ اسکول جانے کے لئے خوشگوار موڈ میں
تیار ہو رہا تھا۔ فیصل بھیا آج آ رہے تھے۔ بستہ گلے
میں ڈال کر ارمغان نے اسکول کی طرف قدم بڑھا دیئے۔
آج اس کا ٹیسٹ تھا۔ ٹیسٹ بہت اچھا ہوا کلاس میں
سب سے زیادہ نمبر ارمغان ہی نے لئے تھے۔ کلاس ٹیچرز
اس کی تعریف کر رہی تھیں۔ ارمغان کس قدر اچھا لڑکا ہے۔
"میرا خیال ہے کہ ٹریفک کم ہو۔ تو ہمت کر کے اب
سڑک پار کر ہی لینا"۔
اچانک یہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس
نے چونک کر دیکھا تو اس کی کلاس کا ایک ساتھی کھڑا
ہوا مسکرا رہا ہے۔ ارمغان نے جھینپ کر جلدی سے
سڑک پار کی اور اسکول میں داخل ہو گیا۔ وہ اسکول
سے واپس آیا تو فیصل بھیا اور ارسلان اس کے منتظر
تھے تینوں کرکٹ کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔
اسٹیڈیم تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔
تماشائی اس کی شاندار بیٹنگ پر اسے داد دے رہے
تھے۔ اور ارمغان ہاتھ ہلا کر ان کی داد و تحسین کا جواب
دے رہا تھا۔ ..
"اُفوہ بھائی جان اس قدر آسان کیچ چھوڑ دیا"
ارسلان کی جھنجھلائی ہوئی آواز سن کر وہ چونک گیا۔
"بھئی ارمغان تم کس دنیا میں کھوئے ہوئے رہتے
ہو"؟ فیصل بھیا نے سوال کیا۔
"میں بتاؤں؟ بھائی جان خیالی دنیا میں رہتے
ہیں"..... ارسلان نے ارمغان کے جواب دینے سے
پہلے چلا کر کہا۔
"فیصل بھیا! میں سوچتا ہوں، جو کرنا چاہتا ہوں
وہ کر لیتا ہوں۔ اس لئے یہ دنیا مجھے اچھی لگتی ہے۔ میں
آسانی سے نامور شخصیت، ذہین لڑکا بہترین پیراک
اور نہ جانے کیا کیا بن جاتا ہوں"۔ ارمغان خوابیدہ
لہجے میں بولا۔
"مگر حقیقت میں نہیں صرف تصورات میں"!
فیصل نے اسے ٹوکا۔ "ارمغان تم جو کچھ سوچتے اور دیکھتے

ہو. اگر حقیقت میں تم ویسے ہی بن جاؤ تو کیسا رہے گا؟"
فیصل بھیّا نے سوال کیا۔
"بہت اچھا.... مگر فیصل بھیّا کیا ایسا ممکن ہے؟"
ارمغان نے سوچتے ہوئے کہا۔
"کیوں نہیں ایسا ہو سکتا ہے؟" فیصل بھیّا نے ٹھوس لہجے میں کہا۔
"سچ! ... مگر کیسے؟" ارمغان کی آنکھیں مسرت سے جگمگا اٹھیں۔
"اس کے لئے تم محنت کرو، ارمغان! اور جو کچھ تم سوچتے ہو، اس پر عمل کرو اور خیالی دنیا میں رہنا چھوڑ دو، پھر تمہاری ہر جائز خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ بس اس کے لئے مسلسل محنت اور لگن کی ضرورت ہوگی" فیصل بھیّا دیر تک ارمغان کو سمجھاتے رہے۔
اور کچھ عرصے بعد ارمغان اپنے اسکول کی پرنسپل سے انعام وصول کر رہا تھا۔ کیونکہ اس نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی تھی۔ یہ محض اس کا خیال نہ تھا بلکہ حقیقت تھی کیونکہ اس نے سوچنے کے ساتھ ساتھ عمل کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔

بوتل کا فوّارہ

محمد ارشد الٰہی عادل، — قصبہ کالونی، کراچی

سامان:

بوتل، ایک ایسا کارک جس میں سوراخ کیا ہوا ہو ایک کھوکھلا تنکا (وہ سٹرا ہو جس سے سوڈے کی بوتل پی (

ایک بڑے مُنہ والی بوتل لے کر اس کا تین چوتھائی حصّہ پانی سے بھر لیں پھر ایک کارک لے کر اس میں سوراخ کرلیں اور اس میں کھوکھلا تنکا (نلکی) لگا دیں یہ خیال رہے کہ کارک میں سوراخ اتنا ہی ہونا چاہیئے کہ کھوکھلا تنکا اس میں فٹ آجائے اب تنکا لگا ہوا یہ کارک بوتل کے مُنہ پر لگا دیں۔
اس کے بعد تنکے پر منہ رکھکر پوری قوّت سے بوتل کے اندر پھونکیں اور پھر جلدی سے منہ ہٹالیں۔ تنکے میں سے پانی فوّارے کی مانند نکلے گا۔ یہ فوارہ اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک تنکے کا آخری سرا پانی میں ڈوبا رہے۔ تنکے کے بجائے اگر شیشے کی نلی استعمال کی جائے تو تجربہ زیادہ کامیاب رہے گا۔
اس کی وجہ یہ ہے کہ بوتل کے خالی حصہ میں پہلے ہی ہوا ہوتی ہے۔ جب تک آپ تنکے یا ٹیوب کے ذریعے اپنے مُنہ سے اور ہوا اس میں داخل کرتے ہیں تو بوتل کے خالی حصّہ میں ہوا کا دباؤ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اور بوتل سے باہر ہوا کا دباؤ بہت کم ہوتا ہے۔

دو مصیبتیں

فرخ مُبین —
شادمان ٹاؤن، کراچی

جب فہیم صاحب کے یہاں گاڑی اور ٹیلی فون آئے تو وہ لوگ بہت خوش ہوئے، مگر

کچھ ہی دیر بعد اُن کی یہ خوشی ایسے غائب ہو گئی جیسے ٹائر سے ہَوا اُنھوں نے سامنے سے آتی ہوئی خالہ اظہری کو دیکھ لیا تھا۔ وہ محلّے، بلکہ پورے علاقے کی واحد لڑاکا خاتون تھیں، جہاں کہیں بھی کوئی جھگڑا ہو جاتا، یہ پہنچ جاتیں۔ لڑنے والا تو بے چارہ خالہ اظہری کو دیکھتے ہی بھاگ جاتا اور لوگ جو تماشا دیکھ رہے ہوتے تھے چُپکے سے کھسک لیتے تھے۔ اگر کوئی دلیر کھڑا رہ جاتا تو سارا الزام اسی کے سر منڈھ دیتیں۔

خالہ اظہری نے آتے ہی کہا: "اے بھیا مجھ کو ذرا جمعہ بازار تک تو چھوڑ آؤ۔" فہیم صاحب نے اُن کو اپنی بیگم کے حوالے کیا اور خود کھسک گئے۔ ان کی بیگم بے چاری اُنھیں جمعہ بازار تک چھوڑ کر آئیں۔

فہیم صاحب گوشت والے کی دُکان پر پہنچے اور قصائی سے کہا: "ڈیڑھ کلو قیمہ دینا۔" کلّو قصائی نے کہا: "ہاں بابو، اس بچے کے بعد تمھارا ہی قیمہ بناؤں گا۔"

فہیم صاحب نے غصّے سے اس کو گھورا۔ اور بولے: "میرا قیمہ بناؤ گے؟" کلّو قصائی گھبرا کر بولا: "اچھا، اچھا، بابو صاحب آپ ہیں۔ بابو جی! میرا ایک کام کر دیں گے، میرا ایک خالہ زاد بھائی مسقط میں ہے، اس کو فون کر دیجیے گا۔" یہ کہہ کر اُس نے لال قمیص سے، جس کا اصل رنگ تو ہرا تھا کارڈ نکال کر دیا۔ فہیم صاحب بُرے بُرے منہ بناتے ہوئے قیمے کا لفافہ اُٹھا کر چل دیے۔

پھر تو روزانہ کا یہی معمول بن گیا۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی منہ اُٹھائے چلا آتا۔ کوئی کہتا: "میری گاڑی پنکچر ہو گئی ہے آپ میرے ساتھ میرے دفتر تک چلیے۔ میں اُتر جاؤں گا۔ آپ واپس آجایئے گا۔" کبھی کوئی کہتا: "فہیم صاحب! ذرا یہ فون تو ملا دیجیے۔" میاں چنّوں: "فہیم صاحب اور اُن کے اہلِ خانہ پریشان ہو چکے تھے۔

ایک دن تو حد ہو گئی۔ فہیم صاحب کی گاڑی باہر گیٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اگنیشن میں چابی لٹک رہی تھی جو فہیم صاحب بوکھلاہٹ میں بھول گئے تھے۔ وہاب صاحب آئے۔ سامنے ان کی دیوار پر یہ لکھا: "میں ذرا مہمانوں کے لیے سامان لینے جا رہا ہوں، ابھی آجاتا ہوں" اور گاڑی لے کر چلتے بنے۔ یہ دیکھ کر فہیم صاحب بہت سٹپٹائے اور بڑبڑانے لگے: "تو نوبت یہاں تک آپہنچی ہے۔" پھر اچانک اُن کے منہ سے ایک قہقہہ نکلا۔ وہ بہت خوش تھے اُن کے ذہن میں ان مسائل کا ایک اچھا حل آیا تھا۔

اگلے دن اخبار میں عوامی اشتہارات کے کالم میں ایک چھوٹا سا اشتہار شائع ہُوا تھا۔ ایک عدد ٹیلی فون منتقل کروانا ہے اور ایک کرولا ماڈل ۸۷ فروخت کرنی ہے۔ معرفت فہیم صاحب۔

مشہور کردار اور خالق

مرسلہ: عبدالرشید تبسم، حاصل پور

کردار ---------- خالق

حاتم طائی ---------- حیدر علی آتش

رستم و سہراب ------- فردوسی طوسی
امراؤ جان ادا ------- مرزا ہادی رسوا
نصوح ------- ڈپٹی نذیر احمد
حکیم بڈھن ------- بہزاد لکھنوی
ٹارزن ------- ایڈگر رائس بروس
شرلاک ہومز ------- آرتھر کانن ڈائل
جیمز بانڈ ------- آئن فلیمنگ
قاضی جی ------- شوکت تھانوی
چچا چھکن ------- امتیاز علی تاج
خوجی ------- پنڈت رتن ناتھ سرشار
عمران ------- ابنِ صفی
ڈریکولا ------- بریم اسٹوکر
تلقین شاہ ------- اشفاق احمد
ہمزاد ------- پطرس بخاری

فرض

تجمل الیاس ——— سمن آباد، لاہور

گرمیوں کے دن تھے اور آج بلا کی گرمی پڑ رہی تھی۔ دھوپ کی حدت سے ٹریفک پولیس نواز کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا، مگر اس کے باوجود وہ بڑی ایمانداری سے اپنا فرض انجام دے رہا تھا۔ فرض کے معاملے میں وہ بڑا بااصول تھا اور کوئی رعایت نہیں برتتا تھا۔ شدید سردی ہو یا گرمی، برسات ہو یا خزاں، وہ اپنے فرض سے کبھی غافل نہیں ہوا تھا۔

لیکن یہ کیا...؟ ایک موٹر سائیکل والا ٹریفک کے اصول پر عمل نہ کرتے ہوئے نکل گیا اور نواز کی سیٹی بھی اُسے نہ روک سکی لیکن نواز بھی پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہ تھا اس نے فوراً ہی اُسے جا لیا۔

وہ آدمی غصّے میں بھنّایا ہوا تھا۔ بہترین لباس میں ملبوس اس شخص کا چہرہ مارے غصّے کے بگڑ گیا تھا۔ اس نے نواز کو اپنا کارڈ دکھایا جس کی رُو سے وہ کمشنر صاحب کا بیٹا تھا، لیکن نواز نے اُسے سلوٹ کرنے کے بجائے اس کا چالان کر دیا۔ کمشنر کا لڑکا جاتے جاتے کہہ گیا کہ کل تمہیں نوکری سے معطل کر دیا جائے گا۔

اگلے روز اُسے کمشنر صاحب نے بلوایا۔ نواز کو اپنا انجام صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تصوّر میں بیوی، بچوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو وہ کانپ اُٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے ان خیالات کو ذہن سے جھٹک کر مضبوط قدموں سے دفتر میں داخل

ہو گیا۔ اُس کا ضمیر مطمئن تھا کہ اُس نے اپنے فرض سے کوتاہی نہیں برتی۔

کمشنر صاحب نے اُسے دیکھا اور بیٹھنے کے لیے کہا اور سونے پر سہاگہ یہ کہ اردلی سے چائے کا کہلوایا۔ نواز کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہے لیکن اُس کا یہ وہم اس وقت دُور ہو گیا، جب کمشنر صاحب نے اُسے زور سے پکارا وہ یکدم ہڑبڑا سا گیا۔

کمشنر صاحب نے اُس سے تمام واقعے کی تفصیل مانگی۔ جس پر اُس نے بالکل درُست واقعہ بیان کر دیا۔ کمشنر صاحب بڑے غور سے اُس کا بیان سُنتے رہے۔ پھر کچھ دیر تک سوچنے کے بعد بولے "بے شک تم نے درُست کام کیا ہے لیکن تمھیں معلوم تھا کہ وہ میرا بیٹا ہے"

"جناب! آپ بے شک مجھے نوکری سے نکال دیں لیکن میں نے فرض سے کوتاہی نہیں کی۔ قانون کا احترام ہر چھوٹے بڑے پر فرض ہے، اور جو اس کی خلاف ورزی کرے گا، چاہے وہ کمشنر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، میں اُس کا چالان کروں گا۔ کیونکہ میرا فرض مجھے یہی سکھاتا ہے!" نواز نے دل کڑا کر کے کہہ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اُس کے ساتھ کیا ہو گا، لیکن کمشنر صاحب نے یہ کہہ کر اسے ششدر کر دیا کہ تمھاری جرأت اور فرض شناسی کی وجہ سے تمھیں ترقی دی جاتی ہے۔

نواز نے بے اختیار اللہ کا شکر ادا کیا۔ اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے مارے آنسو آ گئے۔

چچا

سعدیہ ضیاء

واقف ان سے بچہ بچہ
یہیں محلے بھر کے چچا
ہر گھر میں ہے ان کا جانا
کام ان کا جھگڑے نپٹانا

جس گھر میں ہو جائے کھٹ پٹ
چچا اس گھر جائیں جھٹ پٹ
یہ سب کے جانے پہچانے
کہنا ان کا ہر اک مانے

بچوں کو بھی ان سے محبت
بوڑھوں کو بھی ان سے عقیدت
کھانے کی نہیں ان کو پروا
چچا ہیں بس چائے کے رسیا

ایک پیالی چائے پلا دو
جو ہو گھر کا کام بتا دو
ایسے جیسے ریل کا انجن
دوڑ پڑیں گے چچا فوراً

اپنی جان پہ ہر غم لیں گے
کام کو نمٹا کر دم لیں گے
آج ہیں اپنے چچا جیسے
لوگ کہاں اس دور میں ایسے

بیوی کی عقلمندی

مینا سلطانہ ——— کراچی

ایک شہر میں دو دوست رہتے تھے ایک کا نام مخلص اور دوسرے کا نام مفلس تھا۔ مفلس تو مفلس ہی تھے اور مخلص واقعی مخلص تھے ایک دن مخلص نے اپنے دوست مفلس سے کہا "تم بہت خاموش رہتے ہو آخر کیا بات ہے؟"

مفلس نے کہا۔ "میری ایک خواہش ہے، لیکن غربت کی وجہ سے اسے پورا نہیں کر سکتا میں ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس کا نام نازنین ہے۔"

مخلص دوست نے کہا "پیسہ جتنا چاہیئے مجھ سے لے لو لیکن کچھ وقت لگے گا کیونکہ میرے جہاز تجارت کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے ہیں اور اگر ابھی پیسے کی ضرورت ہے تو چلو کسی مہاجن کے پاس چلتے ہیں اور اس سے قرض لے لیتے ہیں۔ جہاز آئے پر مہاجن کا قرضہ ادا کر دیں گے۔" دونوں دوست مہاجن کے پاس گئے اور اس سے قرض مانگا۔

مہاجن نے کہا "روپیہ جتنا درکار ہے لے لو۔ مگر میری ایک شرط ہے۔ اگر روپیہ وقت پر ادا نہ ہو سکا تو میں تمہارے جسم سے آدھا سیر گوشت کاٹ لوں گا۔" مہاجن کی یہ بات سن کر پہلے تو مخلص بہت گھبرایا پھر اس نے سوچا کہ میں معیاد پوری ہونے سے پہلے ہی قرض لوا کر دوں گا اور مہاجن کی شرط منظور کر لی مخلص نے مہاجن سے روپیہ لے کر مفلس کو دے دیا۔

مفلس نازنین سے شادی کر کے خوشی خوشی رہنے لگا۔ قرض کی ادائگی کا وقت قریب آتا گیا اور مخلص کے جہازوں کی کچھ خبر نہ آئی ایک دن مخلص کو خبر ملی کہ اس کے سارے جہاز سمندر میں ڈوب گئے۔ یہ سنتے ہی مخلص کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی اسے اپنے نقصان کا اتنا غم نہیں تھا، جتنا اپنی جان کا۔ مہاجن کی دی ہوئی معیاد ختم ہونے والی تھی آخر معیاد ختم ہو گئی اور مہاجن نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا اب تو مخلص بہت گھبرایا اور اپنے دوست مفلس کو اطلاع دی کہ مہاجن نے دعویٰ دائر کر دیا ہے۔

مفلس یہ خبر سن کر بہت فکر مند ہوا۔ مفلس کی بیوی نے پوچھا "آخر کیا بات ہے؟" نازنین نے خط لے کر خود پڑھا اور مفلس سے کہا "گھبرانے کی کیا بات ہے پیسہ جتنا چاہیئے مجھ سے لے لو اور اپنے دوست کی جان بچاؤ۔" مفلس پیسے لے کر فوراً اپنے دوست مخلص کے پاس آیا۔ دونوں مہاجن کے پاس گئے مفلس نے اس سے کہا "مجھ سے پیسے لے لو اور میرے دوست مخلص کی جان چھوڑ دو۔"

مہاجن نے کہا "مجھ کو پیسہ نہیں چاہیئے، میں تو اپنی شرط ہی پوری کروں گا۔" آخری تاریخ آ گئی اور سب عدالت میں حاضر ہوئے، وکیل نے مہاجن کو سمجھایا کہ "تم دوگنا پیسہ لے لو اور مخلص کی جان نہ لو۔" لیکن مہاجن نے عدالت کے سامنے پیسہ لینے سے انکار کر دیا اور کہا "میں تو اپنی شرط ہی پوری کروں گا یعنی مخلص کے جسم سے آدھا کلو گوشت تراشوں گا۔ مجھے ایک کوڑی بھی نہیں چاہیئے۔" عدالت بھی پریشان تھی کہ کیا کیا جائے اتنے

میں ایک خوبصورت نوجوان وکیل حاضر ہوا اور اس نے اپنے وکالت کے کاغذات پیش کرتے ہوئے بولنے کی اجازت چاہی۔ اجازت ملتے ہی وکیل نے کیس کا مطالعہ کیا اور مہاجن سے کہا "واقعی تمہارے کاغذات میں لکھا ہے کہ اگر روپیہ معیاد پر ادا نہ ہو سکا تو تمہیں مخلص کے جسم سے آدھا کلو گوشت تراشنے کا حق ہے... لہٰذا اب تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم مخلص کے جسم سے آدھا کلو گوشت تراش لو۔" مہاجن یہ سنتے ہی چھری نکال کر مخلص کی طرف لپکا نوجوان وکیل نے مہاجن سے کہا "ذرا ٹھہرو۔ یہ خیال رہے کہ مخلص کے جسم سے آدھا کلو سے ایک رتّی بھی کم یا زیادہ گوشت نہ تراشا جائے اور خون کا کوئی قطرہ زمین پر نہ گرنے پائے۔ کیونکہ تمہاری شرط میں صرف آدھا کلو گوشت تراشنا لکھا ہے۔"

مہاجن یہ بات سُن کر گھبرایا اور بولا "مجھے میرا پیسہ دے دو۔ میں گوشت نہیں کاٹتا۔" وکیل نے کہا "تم پیسہ لینے سے انکار کر چکے ہو لہٰذا اپنی شرط پوری کرو۔" مہاجن یہ سُن کر وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مفلس نے وکیل کا شکریہ ادا کیا اور روپے دینا چاہے، وکیل نے کہا "مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔" جب اُس نے اصرار کیا تو وکیل نے مفلس سے کہا "اگر میں کچھ لوں گا تو آپ کے ہاتھ میں جو انگوٹھی ہے، وہ لوں گا۔"

مفلس نے وکیل سے کہا "یہ تو میری بیوی کی نشانی ہے اور میں نے وعدہ کیا ہے کہ میں انگوٹھی کو اپنے سے کبھی علیحدہ نہیں کروں گا۔" وکیل نے پھر کہا "اگر میں کچھ لوں گا تو یہ انگوٹھی ہی لوں گا۔" تو مخلص نے اپنے دوست مفلس سے کہا "اپنی بیوی کو میری طرف سے کہنا کہ میرے دوست مخلص نے وکیل صاحب کی نذر کر دی۔"

مفلس نے انگوٹھی وکیل صاحب کو دے دی۔ اور ساتھ ہی وکیل کو اپنے گھر چلنے کی دعوت بھی دی وکیل نے گھر پہنچ کر کہا کہ میں وکالت کی پوشاک بدل لوں اور الگ کمرے میں چلے گئے۔ جب پوشاک بدل کر باہر آئے تو انہیں دیکھ کر دونوں دوست حیران ہو کر بولے "... نازنین... ! یہ تم تھیں!" وہ وکیل مفلس کی عقلمند بیوی نازنین تھی۔

چاند

شفقت علی شفقت ____ گوجرانوالہ

انسان نے جب سے اِس زمین کو آباد کیا ہے، تب سے ہی اس نے اپنے ماحول کو سمجھنا شروع کر دیا تھا... انسان نے شروع ہی سے کائنات کو تسخیر کرنے کے لیے نت نئی کوششیں کیں۔ اُس نے ایک طرف تو زمین کی تہہ میں چھپے ہوئے خزانوں کو کھنگالنا شروع کیا تو دوسری طرف آسمان کی وسعتوں کو کھوجنا شروع کر دیا۔ آسمان، سائنسدانوں کی توجہ کا ہمیشہ سے مرکز رہا ہے۔ اب اُس نے چاند کو فتح کرنے کے بعد مریخ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ آسمان کے سورج کے بعد سب سے قابلِ ذکر چیز چاند ہے۔ جو نہایت پُرکشش ہے۔ اس کی روشنی آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔ اور شاعروں کو نت نئے خیال دیتی ہے۔ آپ نے بچپن میں وہ گیت تو سُنا ہوگا "چندا ماموں دُور کے" جو آپ کی امی جان آپ کو سلانے کے لیے گاتی تھیں۔ لیکن ہم یہاں بات سائنس کے حوالے سے کریں گے۔

چاند بہت سالوں تک سائنسدانوں کے لیے معمّہ بنا

رہا لیکن آخر انھوں نے اس پر فتح حاصل کر لی۔ چاند' زمین کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ چاند پہلے زمین ہی کا حصّہ تھا لیکن بعد میں یہ زمین سے علیحدہ ہو گیا اور زمین کے گرد گردش کرنے لگا۔ چاند ایک خود روشن جسم نہیں بلکہ یہ روشنی سورج سے حاصل کرتا ہے۔ چاند اپنی گردش ہی کی وجہ سے ہر رات کو مختلف جگہ اور مختلف انداز سے ہمیں نظر آتا ہے۔ زمین کے گرد چاند کی گردش ½۲۹ دن میں پوری ہوتی ہے۔ چاند' زمین سے ۳۸۲۱۶۹ کلومیٹر دُور ہے۔ اگر چاند کی سطح کو بغور دیکھا جائے تو اس کی سطح پر کچھ دھبّے دکھائی دیں گے۔ جو کہ چاند کی سطح پر پڑے ہوئے گڑھے ہیں۔ جن کو کریٹر CRATER کہتے ہیں۔ یہ گڑھے بہت بڑے ہیں۔ دوربین کی ایجاد سے پہلے لوگ ان گڑھوں کو "چاند کے سمندر" سمجھتے تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ چاند پر سمندر تو کیا پانی کی ایک بوند بھی نہیں ہے اور نہ ہی وہاں ہوا ہے۔ اس لیے وہاں کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ ہر جاندار کو زندہ رہنے کے لیے آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو وہ ہَوا سے حاصل کرتا ہے۔ اِس لیے چاند پر کوئی بھی جائے تو اُسے اپنے ساتھ آکسیجن کے سلنڈر بھی لے جانے پڑتے ہیں۔ چاند کا قُطر صرف ۱۲۷۴ کلومیٹر ہے۔ اس کے باوجود یہ ہمیں بڑا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں زیادہ دُور کی چیزیں بڑی دکھائی دیتی ہیں۔ وزن کے لحاظ سے بھی چاند زمین کے مقابلے میں بہت کم ہے یعنی ایک زمین کے مقابلے میں ۸۱ چاند ہوں تب ایک زمین کا وزن بنتا ہے۔

جس طرح سورج گرہن ہوتا ہے اسی طرح چاند گرہن بھی ہوتا ہے۔ اسے عام طور پر بُرا شگون سمجھا جاتا ہے۔ چاند گرہن تب ہوتا ہے جب زمین گردش کرتی ہوئی سورج اور چاند کے درمیان آجاتی ہے۔ چاند کو سورج کی روشنی میسّر نہیں آتی اور زمین کا سایہ سورج پر پڑنے لگتا ہے اس وقت چاند کا رنگ تانبے کی طرح ہوتا ہے۔

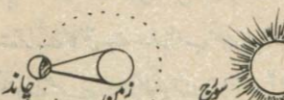

چاند گرہن کی اصل وجہ زمین اور چاند کی گردش ہے۔

چاند کی گردش کے دوران ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اگر ہم اُس وقت چاند پر کھڑے ہوں اور زمین کو دیکھنا چاہیں تو ہمیں اپنا چہرہ اوپر کی طرف کرنا ہوگا۔ چاند گردش کے دوران مختلف اشکال بدلتا ہے۔ جب پہلی رات کا چاند نکلتا ہے۔ تو وہ بہت باریک ہوتا ہے اور اُسے "ہلال" کہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ چاند کا روشن حصّہ بڑھنے لگتا ہے۔ حتّٰی کہ چودھویں کی رات کو یہ پورا روشن دکھائی دیتا ہے۔ اس پورے چاند کو "بدر" کہتے ہیں۔ اس کے بعد چاند کا روشن حصّہ پھر کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اکیسویں رات کو یہ پھر نصف ہو جاتا ہے اِس رات کو اماوس کی رات کہتے ہیں

پہلے پہل چاند پر پہنچنا بہت دشوار سمجھا جاتا تھا حتّٰی کہ اسے ناممکن فعل قرار دے دیا گیا، لیکن اس کے باوجود سائنسدانوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ چنانچہ روس نے سب سے پہلے اپنا آدمی خلا میں بھیجا جس کا نام تھا "یوری گاگرین" لیکن وہ چاند تک نہ پہنچ سکا۔ اس کے بعد امریکہ نے اس شعبے میں طبع آزمائی کی اور ۱۹۶۹ء میں امریکہ کے ایک خلاباز "نیل آرمسٹرانگ نے اپنے ایک ساتھی

کے ساتھ چاند کی سطح پر قدم رکھا۔ اس طرح انسان نے اپنی عقل اور محنت سے ایک بار پھر فتح حاصل کرلی اور ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ اس کے ساتھ ساتھ سائنسدانوں کے لیے تحقیق کے نئے دروازے کھل گئے۔

جب چراغوں میں روشنی نہ رہی

جمیل احمد خان ——— ملیر۔ کراچی

اُن کے جاتے ہی کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت نہ دَر کی صورت

جونہی بجلی گئی محلے میں ایک طوفان مچ گیا۔ پڑوسیوں کے ننھے منّے مستقبل کے معماروں نے چیخ چیخ کر سارا محلہ سر پر اُٹھا لیا۔ اور ہم جو اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے "ٹارزن اور خونی بلائیں" کا مطالعہ کر رہے تھے، بجلی غائب ہو جانے پر محکمۂ بجلی کی شان میں گستاخیاں فرمانے لگے، اب ہم اکیلے کمرے میں بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے، کیونکہ ٹارزن کی خونی بلائیں ہماری آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھیں۔ چنانچہ ہم باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھے، مگر یہ کیا؟ دروازہ تو بند ہو چکا تھا۔ ارے! یہ تو بالکل ٹھوس ہو رہا ہے،

ہم نے دروازے کو ٹٹولا تو ہماری کھوپڑی میں یہ بات آئی کہ ہم جسے دروازہ سمجھ رہے تھے، وہ تو دیوار تھی، اور ظالم سماج کی طرح ہماری راہ میں حائل ہو گئی تھی، ہم دیوار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دروازے کی تلاش میں آگے بڑھے۔

"اُف ف ف، ہائے ئے" یہ الفاظ ہمارے ہی مُنھ سے اس وقت نشر ہوئے جب آگے بڑھتے ہوئے کُرسی صاحبہ درمیان میں آگئیں، اندھیرے میں ہمیں نظر نہ آسکیں اب ہم سجدے میں گرے کُرسی کی شان میں ایسے ایسے قصیدے پڑھ رہے تھے کہ اگر کُرسی کی خاطر لڑنے مرنے والوں کو ہماری قصیدہ خوانی کا علم ہو جائے تو وہ دیوار سے سر پھوڑ لیں۔ (اپنا نہیں، ہمارا) خیر صاحب جیسے تیسے ہم دوسرے کمرے میں پہنچ گئے۔ مگر ہم ابھی دوسرے کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ مُنھ کے بل لیٹ گئے کیونکہ پنکھے کا تار وہاں موجود تھا جس نے ہمارے پیر میں پھنس کر یہ شرارت کی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم پنکھے کے تار کو انتہائی ناکارہ شے گردانتے، کسی نامعلوم مقام سے امّی کی آواز سُنائی دی۔

"ایک جگہ بیٹھ جاؤ ورنہ توڑ پھوڑ کرتے رہو گے، ابھی میں موم بتی جلا کر لا رہی ہوں" ابھی ہم کُرسی پر بیٹھنے کے لیے آگے بڑھے ہی تھے کہ کسی نے ہماری قمیض کا دامن پکڑ لیا، ہم نے ڈانٹا "کون گستاخ ہے، جو ہمارا دامن پکڑے بیٹھا ہے، اے نامعلوم شخص! اگر تو فریادی ہے تو صبح ہمارے حضور اپنی عرض پیش کرنا، ابھی بجلی غائب ہے۔" مگر ہوا یہ تھا کہ میز میں ہماری قمیض کا دامن اٹک گیا تھا۔

امّی باورچی خانے سے موم بتی جلا کر لے آئیں تو کمرے میں موجود لوگوں کے دُھندلے دُھندلے نقوش نظر آنے لگے۔

بڑی باجی اور چھوٹی باجی ساتھ ساتھ بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ جبکہ بلو صوفے پر سو رہا تھا۔ دوستو! بجلی غائب ہو اور ہم شرارت نہ کریں یہ تو ایسا ہی ہے جیسے گوالا پانی میں دودھ نہ ملائے۔ ہم آگے بڑھے اور بڑی اور چھوٹی باجیوں کی چٹیا آپس میں باندھ دیں۔ یہ کارنامہ سرانجام دینے کے بعد آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم الماری تک گئے۔ کاجل کی ڈبیا اٹھائی اور... تھوڑی سی دیر میں بلو ایک ڈراؤنی بلا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اب ہمیں بھی نیند کی آہٹ محسوس ہوئی تو ہم بھی صوفے پر ہی دراز ہو گئے، بجلی تو غائب تھی مگر کھڑکی کے ذریعے کمرے میں آنے والی ہوا نے ہمیں تھپک تھپک کر سلا دیا۔ خواب میں ہم نے دیکھا کہ ہم اُستاد بن گئے ہیں اور اپنی کلاس میں بارُعب انداز میں بیٹھے ہوئے رسالہ پڑھ رہے ہیں اور ہماری جماعت مچھلی بازار کا منظر پیش کر رہی ہے۔ جب جماعت کا شور ہمارے مطالعے میں خلل ڈالنے لگا تو ہم نے رسالہ رکھ دیا۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے استاد ماسٹر چراغ دین جنہیں ہم پیار سے چچا لالٹین کہتے ہیں، ہمارے شاگرد بنے ہوئے ہیں۔ ہم بہت خوش ہوئے "لو بھئی اب بدلا لینے کا سنہری موقع حاصل ہو گیا۔

"یہاں آؤ چراغ دین!" ہم نے گرجدار آواز میں چچا لالٹین کو بلایا، چچا لالٹین سہمے سہمے ہمارے سامنے آکر کھڑے ہو گئے، "ہم نے پوچھا" چراغ دین! کل جو ہم نے ہوم ورک دیا تھا وہ کر لیا؟"

چراغ دین ڈرتے ڈرتے بولے "سردہ کل ہمارے ابّو دی سی آر پر فلم دیکھ رہے تھے اس لیے ہوم ورک نہیں ہو سکا۔"

"تو امّی سے کروا لیا ہوتا" ہم نے ڈانٹا۔

"سردہ! امّی کا خالہ پڑوسن سے جھگڑا ہو گیا تھا" چچا لالٹین منمنائے۔

"نالائق! کوئی بڑے بھائی بہن نہیں ہیں" ہم گرجے

"جی سردہ! بڑا کوئی نہیں سب مجھ سے چھوٹے ہیں"

"ابّا دی سی آر دیکھ رہے تھے، امّی جھگڑا کر رہی تھیں، بڑے بھائی بہن کوئی نہیں ہیں تو، تُو کہیں خرچ ہو گیا تھا کیا؟" ہم ماسٹر چراغ دین کے انداز میں چلّائے۔

"جی! میں جی! وہ جی!"

"یہ کیا جی جی لگا رکھی ہے" ہم چیخے۔

"سردہ میں... میں پتنگ لوٹ رہا تھا" چچا لالٹین بولے۔

"کتنی لوٹیں پھر" ہم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"جی وہ! تیس" چچا بولے۔

"جھوٹ بولتا ہے کم بخت" ہم دہاڑتے ہوئے بولے اور مولا بخش ہاتھ میں سنبھال لیا "بے اُلو! ہم ایک ہفتے میں تیس نہیں لوٹ سکے تو نے ایک دن میں کیسے لوٹ لیں! سچ سچ بتا!" ہم ڈنڈا پکڑ کر کھڑے ہی ہوئے تھے کہ ہمارا سر چھت سے زور سے ٹکرا گیا... اور پھر سارا منظر ہی غائب ہو گیا، یعنی ہماری آنکھ کھل گئی... اور... سہانا خواب ٹوٹ گیا...

اُف ہم تو صوفے پر سو رہے تھے... ہم صوفے کے نیچے کیسے پہنچ گئے؟ ہم نے لیٹے لیٹے اپنے سر پہ ہاتھ پھیرا، وہاں اُلوؤں کی کاشت ہو رہی تھی۔ صوفے سے باہر جھانکا۔

"اچھا تو بجلی آگئی" ہماری آنکھیں چندھیانے لگیں۔ سب لوگ بیٹھے ہوئے ڈرامہ ۱۹۸۸ء بھگت رہے تھے۔

ہم جس صوفے کے نیچے مقیم تھے اس پر شہلا آنٹی بیٹھی تھیں ہم نے اب صوفے کے نیچے سے نکلنے میں عافیت سمجھی تاکہ صوفے کے نیچے پہنچ جانے کا عُقدہ کُھل سکے۔ ہم جیسے ہی برآمد ہوئے۔ شہلا آنٹی کی نظر ہم پر پڑی تو چیختی ہوئی ایک طرف دوڑیں۔

"یہ کیا حرکت ہے! ہم لوگ سمجھ رہے تھے کہ تم سو گئے ہوگے مگر تم شہلا کو ڈرانے کے لیے۔۔۔یہاں چُھپ گئے تھے۔ شہلا ڈرو نہیں یہ ٹمّی ہے، ٹمّی جاؤ منھ صاف کرو" ابّو نے ڈانٹ پلائی۔ ہمیں اور تو سب کچھ سمجھ میں آگیا مگر منھ دھونے والی بات کچھ پلے نہ پڑی، چھوٹی باجی، بڑی باجی اور ببلو کی طرف دیکھا اُن کی آنکھوں میں مُسکراہٹ تھی، ہم احمقوں کی طرح سر مٹکا رہے تھے کہ ابّو نے ہمیں کان سے پکڑ کر آئینے کے سامنے کردیا، اب ہم سب کچھ سمجھ گئے۔ ہماری شکل واقعی کسی چڑیل کے برادرِ عزیز کا نقشہ پیش کررہی تھی۔ ہونٹوں پہ کاجل لگا تھا۔ آنکھوں کے گرد لپ اسٹک لگی تھی۔ بالوں میں ربربین لگا تھا۔ اور وہ مینارِ پاکستان کی طرح کھڑے ہوئے، یقیناً ہم کسی خطرناک سازش کا شکار ہوگئے تھے۔ ہم نے ببلو کو ڈراؤنی بلا میں تبدیل کیا تھا اور بڑی باجی، چھوٹی باجی کو چٹیا باندھ کر آپس میں باہم ایک کردیا تھا، مگر ببلو شہزادہ جانِ عالم کی طرح اکڑ کر بیٹھا تھا، دونوں باجیاں بھی الگ الگ دُور بیٹھی تھیں ہم سمجھ گئے اِن لوگوں نے ہماری ترکیب ہم پر ہی آزمائی تھی، جب ہم چچا لالٹین سے پُرسش کر رہے تھے تب یہ کارنامہ انجام دے کر ہمیں صوفے کے نیچے پہنچا دیا گیا تھا، اس سے پہلے کہ ہم یہ کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کو ابّو کے سامنے پیش کرتے کہ شہلا آنٹی نے ابّو سے ہماری شکایت لگائی اور ہمارے ڈھول کا پول کھول دیا۔ "بھائی جان جب میں اِسٹڈی کرتی ہوں تو یہ مجھے آکر ڈراتا رہتا ہے۔"

لیجیے صاحب! کہاں ہم چچا لالٹین کو سزا دینے چلے تھے کہاں ہم خود۔۔۔! مگر خواب تو خواب ہی ہوتا ہے۔۔۔۔

نیا عزم

محمد تنویر شعیب ——— کراچی

عمران اور جلال سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے تیزی سے باغ میں داخل ہوئے اور سیدھے امرود کے پیڑ کے پاس پہنچ گئے۔ سردی کافی بڑھ گئی تھی۔ شاید اسی لیے اس قصبے کے واحد باغ کا مالی خیرالدین باغ کے وسط میں تعمیر شدہ چھوٹے سے مکان کے اندر تھا۔ عمران اور جلال کا ہاتھ امرود کی اس شاخ تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ جس پر امرود زیادہ لگے ہوئے تھے۔ اس امرود کے پیڑ کے نیچے چھوٹے چھوٹے پودے تھے۔ جو عمران اور جلال کے پیروں تلے آکر کُچلے جا رہے تھے۔ دونوں بوڑھے مالی خیرالدین کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔ عمران، جلال کی پیٹھ پر چڑھ گیا اور ہاتھ بڑھا کر امرود کھینچ لیے

ساتھ ہی پیڑ کی نازک شاخ کو بھی پھینچ لیا۔ شاخ ٹوٹ گئی امرود نیچے بکھر گئے۔ دونوں نے جلدی سے امرود سمیٹے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔

خیرالدین بابا اپنے گھر کی کھڑکی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ اچھی طرح کمبل لپیٹ کر باہر نکلا اور امرود کے پیڑ کے نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے تمام کچلے ہوئے پودوں کو سمیٹا اور تھوڑی دیر وہیں بیٹھے رہنے کے بعد اُٹھ کھڑا ہوا۔ چھوٹے چھوٹے مرجھائے ہوئے پودے اس کے ہاتھ میں تھے۔ وہ اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔

اس قصبے کا نام نور پور تھا۔ اس چھوٹے سے قصبے میں صرف ایک ہی باغ تھا، جو بہت خوبصورت تھا۔ اس باغ میں بے شمار قسم کے درخت تھے۔ جب صبح ہی صبح ننھی ننھی معصوم سی چڑیاں اس باغ سے نکل کر پورے قصبے میں صبح ہونے کا پیغام سناتیں تو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا اس باغ کا مالک خیرالدین تھا۔ قصبے کے تمام بچے اس کے سامنے بڑے ہوئے تھے اب تو وہ بہت بوڑھا اور ناتواں ہو چکا تھا۔ خیرالدین کے دادا نے اس باغ کو آباد کیا تھا۔ اور خیرالدین بچپن سے اس باغ میں کام کرتا آ رہا تھا اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے وہ اپنی ساری توجہ باغ کی دیکھ بھال میں لگاتا تھا۔ قصبے میں ایک خوبصورت ندی بھی تھی جو سال بھر پانی سے بھری رہتی تھی۔

عمران اور جلال اسی قصبے میں رہتے تھے۔ شرارتیں کرنا تو جیسے ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ وہ دونوں خیرالدین بابا سے بچ کر باغ میں پہنچ جاتے اور پودوں کو توڑنے اور پھل وغیرہ کھانے کے بعد وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے اور خیرالدین بابا بیچارہ ناتوانی کے باعث وہیں کھڑا چیختا رہ جاتا۔ ایک روز خیرالدین بابا نے عمران اور جلال کی شکایت ان کے والدین سے کر دی جس پر ان کو ڈنڈے کے ساتھ مار بھی پڑی۔ انھوں نے فیصلہ کیا وہ خیرالدین بابا کے باغ کے تمام چھوٹے چھوٹے پودوں کو توڑ ڈالیں گے۔ اور آج اس خیال کو انھوں نے عملی جامہ پہنا دیا تھا۔ خیرالدین بابا خاموش رہ گئے۔ اس لیے کہ اگر شکایت کی تو ان لوگوں کو پھر مار پڑے گی اور وہ ڈھیٹ ہو جائیں گے۔ اور باغ کے مزید پودے ٹوٹ جائیں گے۔

برسات کے دنوں میں قصبے کی ندی میں پانی چڑھ گیا۔ جس نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔ لوگ بدحواسی میں بھاگ رہے تھے۔ آخر سب خیرالدین بابا کے باغ میں پہنچ گئے اور بڑے بڑے تناور اور مردِ بحران بن کر کھڑے ہوئے درختوں پر چڑھنے لگے۔ پورا قصبہ خیرالدین بابا کے باغ میں جمع ہو گیا۔ ان ہی لوگوں میں سہمے سہمے عمران اور جلال بھی شامل تھے۔ خیرالدین بابا بھی تمام لوگوں کے درختوں پر چڑھ جانے کے بعد خود بھی چڑھ گئے۔ حالانکہ وہ بہت بوڑھے اور ناتواں تھے، لیکن چونکہ انھوں نے یہ کام بچپن سے کیا تھا اس لیے انھیں درخت پر چڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

پوری رات لوگوں نے خوف میں درختوں پر ہی گزاری۔ آخر صبح صبح ہوتے ندی کا پانی تھم گیا۔ تمام لوگ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے نیچے اُترے۔ خیرالدین بابا کی نظر عمران اور جلال پر پڑی تو وہ ان دونوں کو روک کر سب کے سامنے سمجھاتے ہوئے بڑی محبت سے کہنے لگے "بیٹا اب

تم نے دیکھ لیا کہ درختوں کی کتنی اہمیت ہے اگر آج یہ نہ ہوتے تو ہمیں کہاں پناہ ملتی۔ یہ درخت تو ہمارے محسن ہیں تم لوگوں نے جوان چھوٹے چھوٹے پودوں کو توڑ ڈالا ہے، یہ بھی کل ہمارے کام آتے۔ میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میرا کیا ہے میں مرجاؤں گا تو یہ تمام باغ آخر تمہارے ہی تو ہوں گے۔ میں تم لوگوں کو ایک نصیحت کروں گا تمھیں ہی نہیں بلکہ قصبے کے ہر اس شخص کو جو، یہ کام کرنے کی استطاعت رکھتا ہے کہ بجائے ان درختوں کو توڑنے اور ختم کرنے کے، ان میں اضافہ کرو تاکہ یہ قصبہ خوبصورت معلوم ہو اور مضبوط بھی ہو۔" خیرالدین بابا تھوڑی دیر کے لیے رُکے اور پھر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "یہ ہمارے محسن درخت ہوا کے زور کو کم کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے آندھی اور طوفان کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ کام انفرادی نہیں، بلکہ اجتماعی ہے۔ اس لیے میں اس چھوٹے سے قصبے کے تمام لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اس قصبے کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے کوشاں رہیں اور اس باغ کے علاوہ اس جیسے کئی اور باغ اس قصبے میں قائم کریں۔ اب آپ آج ہی کے واقعے سے دیکھ لیں کہ ان درختوں کی اہمیت کتنی ہے۔ اگر آج یہ نہ ہوتے تو نجانے ہم کہاں ہوتے؟"

عمران اور جلال کے سر ندامت سے جھک گئے۔ انھوں نے خیرالدین بابا سے معافی مانگی۔ عمران نے کہا۔ "آپ ... آپ بہت اچھے ہیں خیر و بابا! واقعی ہم غلطی پہ تھے۔ آج کے بعد باغ کی دیکھ بھال میں ہم بھی آپ کا ہاتھ بٹایا کریں گے۔"

"ارے! صرف تم دونوں ہی کیوں؟ بلکہ ہم سب خیرالدین بابا کے باغ کے مالی ہیں۔" ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔ "اب خیرالدین بابا صرف آرام کریں گے۔ آج سے ہم اس باغ کے رکھوالے ہیں۔ واقعی ہم غلطی پہ تھے۔ ہماری توجہ اس طرف گئی ہی نہیں تھی۔ اس باغ کے علاوہ اب یہاں اس جیسے کئی اور باغ ہوں گے انشاءاللہ!"

سائنسی ایجادات رحمت یا زحمت

شائستہ معین صدیقی کراچی

قدرت کی لاتعداد بنائی ہوئی چیزوں کا کھوجی انسان روز بروز ترقی کی راہوں میں گامزن ہے آج بموں اور میزائلوں کی کثرت ہے۔ جہاں انسان نے کائنات کی وسعتوں کو کھنگالا وہاں چھوٹے چھوٹے نہ تقسیم ہونیوالے ذرّوں کی نشاندہی بھی کی۔ آج انسان چاند پر پہنچ گیا ہے جہاں صدیوں پہلے پہنچنا صرف خیالی تصور تھا۔ اور آج جہاں پہنچنا خیالی تصور ہے کل انسان وہاں بھی پہنچ جائے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کی روزانہ کی ایجادات اور ترقیاں کہاں تک بنی نوع انسان کی فلاح کا سبب بنتی ہیں۔

جہاں حضرتِ انسان نے ایٹم دریافت کیا اس سے تابکار طاقت ور اور قابلِ استعمال شعاعیں دریافت کیں وہاں اس ایٹم سے ایٹم بم بھی ایجاد کر ڈالا۔ جو بیک وقت لاکھوں انسانوں کی تباہی کا باعث بنتا ہے ہمارے سامنے اس کی دردناک مثال ہیروشیما اور ناگاساکی ہیں۔

چند سال پیشتر یہ شور تھا کہ زمین کی طرف (کوئی سائنسی بلا) اسکائی لیب گر رہا ہے اور وہ کسی بھی وقت اور کسی علاقے میں گر سکتا ہے۔ سب لوگ اس سائنسی

ایجاد سے بہت خوفزدہ تھے ۔ جیسے تیسے کر کے یہ خلائی تجربہ گاہ بغیر کسی جانی نقصان کے زمین بوس ہو گئی ۔ سوچئے ۔ اس وقت نہ جانے کتنے مصنوعی سیارے خلا میں کارفرما ہیں لیکن انسان کی بھیجی ہوئی یہی چیزیں ہماری ہی طرف پلٹ پڑیں ۔ تو ہمارے خوف کا کیا عالم ہو گا ۔ پہلے تو صرف ایک سائنسی بلا تھی جس نے ہماری آدھی جان نکال لی تھی ۔ جب اتنی ساری بلائیں بیک وقت ہمارے اوپر آنا شروع کر دیں تو اس خبر کو سنتے ہی شاید ہم اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں ۔

آپ نے بہت سے نئے بموں کے نام سُنے ہوں گے مثلاً ہائیڈروجن بم فاسفورس بم اور ٹائم بم وغیرہ یہ سب تو ہمیں سراسر زحمت ہی معلوم ہوتے ہیں ۔ ٹی وی ایک اچھی ایجاد ہے ۔ جہاں ٹیلی ویژن سے ہمیں اچھے اچھے پروگرام دیکھنے کو ملتے ہیں ۔ بچوں کی ذہنی نشوونما ہوتی ہے ۔ گھر بیٹھے معلومات حاصل ہوتی ہیں ۔ وہاں ٹیلی ویژن اسکرین سے نکلنے والی شعاعیں نگاہ کی کمزوری کا باعث بنتی ہیں اور اب تو جہاز بھی اتنے خطرناک اور جدت کے ساتھ بن رہے ہیں کہ اگر فضا سے گزر جائیں تو چھوٹے بچے رونے اور کلینڈر پھڑ پھڑانے لگتے ہیں ۔ اور اگر بحری جہاز کو دیکھیں تو شہزادہ اینڈریو کے جہاز کا حشر یاد آجاتا ہے ۔ کہ کہیں کوئی شریر سا میزائل آکر بحری جہاز کی شکل تبدیل دے ۔ ہوائی جہاز انسان کے لئے ایک طرح سے رحمت ہے ۔ وہ اس طرح کہ جہاز چند گھنٹوں میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا دیتا ہے ۔ یعنی اس صورت میں انسان کا فائدہ ہے ۔ باعث زحمت اس طرح کہ اگر یہی جہاز بمبار جہاز بن جائے تو یہی رحمت زحمت بن جاتی ہے ۔ اور یوں انسان تباہی اور بربادی سے ہمکنار ہو جاتا ہے ۔ سائنسی ایجادات نے اپنی افادیت کا لوہا منوا لیا ہے ۔ لیکن سائنسی ایجادات کے نقصانات بھی بہت ہیں ۔ پہلے زمانے میں اتنی خطرناک بیماریاں نہیں ہوتی تھیں جو کہ جدید ترقی کے بعد آئیں جہاں تابکار اشیاء سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے ۔ وہاں ان سے خارج ہونے والے ذرات اور شعاعیں انسان کے لئے مہلک بھی ثابت ہو رہی ہیں اور نئی نئی بیماریوں کا موجب بن رہی ہیں ۔

بعض ایجادات بنی نوع انسان کے لیے رحمت ثابت ہوتی ہیں ۔ ایڈورڈ جینر کا دریافت کیا ہوا چیچک کا ٹیکہ بنی نوع انسان پر احسان ہے ۔ اسی طرح ہم جو صنعتی کام مہینوں میں کرتے تھے ۔ اب وہ دنوں میں ہو جاتے ہیں ۔ انسان میلوں دور عزیزوں ، دوستوں اور رشتہ داروں سے ٹیلیفون پر بات کر سکتے ہیں ۔ ہم دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہونے والے میچ اور واقعات کو سیٹلائیٹس کے ذریعے براہِ راست دیکھ سکتے ہیں ۔ سائنسی ایجادات نے وقت اور فاصلے کو گھٹا دیا ہے جہاں ان سائنسی ایجادات سے بے مثال فائدے ہیں ۔ وہاں ان نت نئی ایجادات کے نقصانات بھی بہت ہیں ۔ لہٰذا ان تمام دلائل کے تحت نکلنے والے نتیجے میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ "سائنسی ایجادات رحمت بھی ہیں اور باعث زحمت بھی ۔"

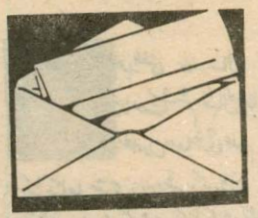

آؤ ملائیں ہاتھ

منصور احمد ۔ ۱۲ سال
جماعت ہفتم۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون حساب۔ ائیر فورس پائلٹ
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ قوم کی خدمت۔ ۱۰-R بلاک کے
ایف بی ایریا۔ گلبرگ۔ کراچی ۳۸

محمد عامر ۱۳ سال
جماعت ہفتم، باغبانی
مضمون حساب، ڈاکٹر
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ، انسانیت کی خدمت
مکان نمبر کے ایم سی ۲۲۵۔ محمود آباد نمبر ۳۔ نزد یوبی ایل۔ کراچی

مقصود احمد ۱۶ سال
جماعت نہم۔ لطیفے بنانا
کرکٹ کھیلنا۔ حساب سائنس
انجینئر بننا چاہتے ہیں، وجہ، وطن کی خدمت
مکان نمبر ع ۱۳۱ ۸۳۱ محلہ III-A ۔ سی بلاک گلی نمبر ۳ شیر شاہ کالونی کراچی

ارشد علی ۔ ۱۴ سال
جماعت نہم۔ خدمتِ خلق
مضمون۔ بائیالوجی۔ ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ جذبۂ خدمتِ خلق۔ ولد علی شیر۔
ڈاک خانہ نور شاہ۔ تحصیل و ضلع ساہیوال۔

فیض الحق شیخ ۱۳ سال
جماعت ہفتم، بزنس کرنا
مضمون، سندھی، بزنس مین
بننا چاہتے ہیں، وجہ، خاندانی پیشہ ہے۔
۱/۸ ڈی۔ بلاک ۸۔ نظام اپارٹمنٹس۔ گلشن اقبال کراچی

محمد علی ۱۴ سال
جماعت ہشتم، کہانیاں لکھنا
مضمون اردو، انجینئر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ، شوق ہے۔ معرفت
سراج الدین مغل مکان نمبر ۱۸۱/۱۵۸ مسلم محلہ۔ بلدیہ ٹاؤن کراچی

محمد نعیم شیخ ۔ ۱۵ سال
جماعت نہم، قلمی دوستی
مضمون اردو۔ فوجی افسر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ وطن کی خدمت۔
آصف منزل۔ روشن والس روڈ۔ رامسوامی۔ کراچی

محمد علی ۱۳ سال
جماعت ہشتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون اسلامیات، وی آئی
پی بننا چاہتے ہیں، وجہ، خواہش ہے۔
۸۔ تاج محمد بلڈنگ۔ میر کرم علی تالپور روڈ۔ صدر، کراچی۔

عمران احمد ۱۱ سال
جماعت ششم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، اردو، پائلٹ
بننا چاہتے ہیں، وجہ، شوق ہے۔ معرفت
عبدالغفار، کمرہ نمبر ۲۴۔ جامعہ حسینیہ بلڈنگ۔ رنس روڈ۔ کراچی

علی زبیر ۱۶ سال
جماعت دہم، کرکٹ
کھیلنا، مضمون حساب
فوجی افسر بننا چاہتے ہیں، وجہ، ملک کی خدمت
مکان نمبر ۲۱۱۹، گلی نمبر ۱۱۔ اعظم ٹاؤن سوفٹ روڈ کراچی ۴۴

ممتاز احمد قریشی ۱۲ سال
جماعت ہفتم۔ تجربات کرنا
مضمون، سائنس، سائنسدان
بننا چاہتے ہیں، وجہ، پاکستان کا نام روشن کرنا۔
گورنمنٹ ہائی اسکول مکلی، ٹھٹھہ، ضلع ٹھٹھہ

صبغت اللہ ۱۵ سال
جماعت نہم۔ آنکھ مچولی پڑھنا
مضمون، انگلش۔ انجینئر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ، وطن کی خدمت مکان نمبر
شے۔ قاضی محلہ۔ روہڑی۔ ضلع سکھر۔

عثمان جاوید ۱۲ سال
جماعت ہفتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، تاریخ، آرمی افسر
بننا چاہتے ہیں، وجہ، ملک کے دفاع کے لیے
۱۹ ۔ شالیمار ٹاؤن ۔ لاہور

انتظار احمد ناگوری ۱۵ سال
جماعت دہم قلمی دوستی
کرکٹ کھیلنا۔ سائنس
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں وجہ، قوم کی خدمت
عبدالوہاب جنرل اسٹور، شاہی بازار، ٹنڈو محمد خان ضلع حیدرآباد

ریحان حق ۱۴ سال
جماعت نہم، معلوماتی
کتب پڑھنا۔ کیمسٹری
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں۔ وجہ، ملک کی خدمت
۵-۶۳ بلاک ۲۔ پی ای سی ایچ ایس۔ الفلاح روڈ کراچی

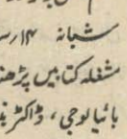

عبدالغنی ۱۵ سال
جماعت ششم، فٹبال کھیلنا
مضمون، معاشرتی علوم
انسپکٹر بننا چاہتے ہیں، وجہ، رشوت کو مٹانا
مسلم نیشنل بوائز لوئر سیکنڈری اسکول کیماڑی کراچی

فہد نفیس ۱۱ سال
جماعت ششم، کرکٹ کھیلنا
مضمون حساب، پائیلٹ
بننا چاہتے ہیں، وجہ، شہادت کا درجہ پانا چاہتے
ہیں۔ ڈی ۵۵۳/ڈھوک پراچہ، صادق آباد، راولپنڈی

لیاقت علی ۱۱ سال
جماعت سوم، کہانیاں
پڑھنا، مضمون، انگلش
ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں، وجہ، انسانی خدمت
۹/۳۴۲ بی۔ ابی سینیا، بلتستانی محلہ۔ کراچی

شبانہ ۱۴ سال، جماعت نہم،
مشغلہ کتابیں پڑھنا، پسندیدہ مضمون
بائیالوجی، ڈاکٹر بننا چاہتی ہیں، وجہ،
غریبوں کی خدمت۔ گورنمنٹ گرلز
سیکنڈری اسکول، لیاقت آباد نمبر ۴۔ کراچی

یاسر علی ۱۱ سال
جماعت پنجم، مشغلہ، پڑھنا
مضمون، اردو، سائنس
پی آئی اے انجینئر بننا چاہتے ہیں، وجہ، شوق ہے۔
اے ۱۱، ۸۱ C، گرین ٹاؤن کراچی ۴۲

مبشر علی زیدی ۱۴ سال
جماعت نہم، مطالعہ کرنا
مضمون، کیمیا، بینک
آفیسر بننا چاہتے ہیں، وجہ پیسے کا ہونا
آر - ۲۰/۶۰۰ - ایف بی ایریا۔ کراچی نمبر ۳۸

جاوید اقبال ۱۳ سال
جماعت ہفتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، انگلش، آرمی آفیسر
بننا چاہتے ہیں، وجہ، خواہش ہے۔
معرفت، سعید پان فروش، حمائتیاں چوک، بہاولپور

سید عبدالرشید ۱۳ سال
جماعت پنجم، ٹکٹ جمع
کرنا، سائنس، میڈیکل
ریپریزنٹیٹیو، وجہ، قوم کی خدمت، محمد علی
میڈیکل اسٹور، مہاجر کالونی، لائن پار، حسینی روڈ ٹنڈوالٰہیار

غلام صابر ۱۵ سال
جماعت دہم، فٹبال
کھیلنا، کراٹے سیکھنا
سائنس، پائیلٹ بننا چاہتے ہیں، وجہ، ملک کی خدمت
معرفت چوہدری طاہر محمود، مکان نمبر ۲۷، بلاک ایچ، وہاڑی

حیدر علی ۱۴ سال
جماعت نہم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، بائیالوجی، ڈاکٹر
بننا چاہتے ہیں، وجہ، عوام کی خدمت
۶/۳۳ رضویہ سوسائٹی۔ ناظم آباد۔ کراچی

غلام رسول ۱۸ سال
جماعت دہم، قلمی دوستی
مضمون اردو، وکیل بننا
چاہتے ہیں، وجہ، برائی کا خاتمہ،
حیدری الیکٹرک اسٹور۔ بھریا روڈ (سندھ)

نوید احمد ۱۴ سال
جماعت نہم، ٹکٹیں جمع کرنا
مضمون، سائنس، دین اسلام
کا محافظ بننا چاہتے ہیں وجہ، تاکہ صحابہ کرام اور پیغمبروں کے
خلاف بولنے والوں کے ٹکڑے کر سکیں۔ والد اشتیاق احمد بازار لوہاراں، جھنگ صدر

راجا دیانند شرما ۱۴ سال
جماعت نہم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، معاشرتی علوم
انجینئر بننا چاہتے ہیں، وجہ، وطن کی خدمت
پوسٹ آفس ڈیگان والا۔ میرپور خاص، تھرپارکر

ابرار سعید ۱۴ سال
جماعت ہشتم، مطالعہ کرنا
مضمون، حساب، اردو،
عالم دین بننا چاہتے ہیں، وجہ، دین کی طرف
رجحان، ۹۱/۱-۸ - کورنگی ٹاؤن، کراچی

خواجہ راشد محمود ۱۵ سال
جماعت نہم، کرکٹ کھیلنا
مضمون، پشتو، ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں، وجہ، والد صاحب ڈاکٹر ہیں۔
معرفت مکی بک ڈپو، سرکلر روڈ، ہری پور ہزارہ

ارم آفاق ۹ سال، جماعت، پنجم
مشغلہ، آنکھ مچولی پڑھنا، پسندیدہ
مضمون، اسلامیات، ڈاکٹر بننا چاہتی ہیں،
وجہ، خواہش ہے۔ ۲۴، بی ملیر
کالونی۔ برف خانہ۔ کراچی نمبر ۲۰

محمد رئیس ۱۲ سال
جماعت ہشتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون اردو، کرکٹر بننا
چاہتے ہیں، وجہ، کرکٹ کھیلنا اچھا لگتا ہے
مکان نمبر ۸ بلاک ۲۶، ایریا ون ڈی، لانڈھی نمبر ۱، کراچی

طارق احمد ۱۳ سال
جماعت ہفتم، کرکٹ کھیلنا
مضمون ریاضی، ریاضی دان
بننا چاہتے ہیں، وجہ، ریاضی بہت پسند ہے
تعمیر ملت پبلک اسکول، آبسر (تربت)، بلوچستان

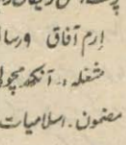

محمد حمید رحمٰن ۱۲ سال
جماعت ہفتم۔ ٹکٹیں جمع کرنا
مضمون۔ سائنس۔ پائلٹ بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ہوائی جہاز اڑانے کا شوق ہے۔
۱-۱ ڈی ون ٹاؤن شپ۔ لاہور۔ ۳۰

شیر بہادر دُرّانی ۱۶ سال
جماعت ہشتم۔ رسائل پڑھنا
مضمون۔ سائنس۔ انگلش
جج یا مجسٹریٹ بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ معذوری
خاموش کالونی۔ بکرا پیڑی نزد ملک مسجد میوا شاہ روڈ کراچی

امین محمد ۱۲ سال
جماعت ہفتم۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون۔ سائنس۔ کرکٹر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ملک کا نام روشن کرنا چاہتے ہیں۔
۲/۲۴۸۔ ریواز گارڈن۔ لاہور۔

ساجد وحید ۱۲ سال
جماعت ہفتم۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون انگلش۔ ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ۔ خدمت کرنا۔
۲۰/۷ بی۔ ون ایریا۔ لیاقت آباد کراچی۔

فہیم احمد ۱۰ سال
جماعت سوم۔ ڈاک ٹکٹ جمع کرنا
مضمون انگلش۔ ڈاکٹر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ۔ غریبوں کی مدد۔ ۲۲۰ بلاک
ای۔ لطیف آباد۔ حیدر آباد

یاسین ۱۴ سال
جماعت نہم۔ مطالعہ کرنا
مضمون حیاتیات، پائلٹ
بننا چاہتے ہیں وجہ۔ شوق اور دلچسپی ۳۰۱۔
شمع پلازہ ۲۔ ۸۔ جی الانہ روڈ۔ کھارادر کراچی

شاذر علی خان ۱۸ سال
جماعت نہم۔ قلمی دوستی
مضمون۔ مطالعہ پاکستان
پائلٹ بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ شوق ہے۔ راشن شاپ
۹۵۶ بگریا ملز۔ لانڈھی۔ کراچی نمبر ۲۲

ملک محمد امین ۱۳ سال
جماعت ہشتم۔ قلمی دوستی
مضمون ریاضی، پائلٹ بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ملک کا دفاع۔ رنگپور
بگھور تحصیل نور پور تھل۔ ضلع خوشاب۔

محمد محبوب ۱۴ سال
جماعت ہشتم کرکٹ اور مطالعہ
مضمون اُردو۔ ڈاکٹر بننا چاہتے
ہیں۔ وجہ پسندیدگی۔ مکان نمبر ۴۶ ر
ڈھوک سیداں۔ راولپنڈی۔

انعام الحق ۱۲ سال
جماعت پنجم۔ کہانیاں پڑھنا
مضمون۔ حساب، پائلٹ بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ۔ شوق ہے۔ ۷۶۔ ۱۵/۲۷۵
دستگیر۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

محمد انور الہدیٰ ۱۰ سال
جماعت پنجم۔ قلمی دوستی
مضمون اردو۔ فوجی کمانڈر
بننا چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ملک کی خدمت۔ کوارٹر ۱۰۸
قصبہ کالونی۔ منگھوپیر روڈ۔ کراچی

مشتاق احمد ۱۰ سال
جماعت پنجم۔ کرکٹ کھیلنا
مضمون انگلش۔ انجینئر بننا
چاہتے ہیں۔ وجہ۔ ملک کی خدمت۔ مکان نمبر ۱۹۶
E۔ لطیف آباد۔ حیدر آباد۔

★ اس کالم میں انٹر تک کے طلبہ و طالبات شریک ہو سکتے ہیں ★ کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا ★ خراب اور نامکمل کوپن قابلِ قبول نہ ہوں گے ★ طالبات اپنی تصاویر نہ بھیجیں۔

نام ______ عمر ______ جماعت ______
مشاغل ______ پسندیدہ مضمون ______
بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ______ وجہ ______
پتہ ______

امّی ابّو کا صفحہ

اُف توبہ! کس قدر وحشی بچّے ہیں۔ دیکھیے تو سہی کس بے دردی سے دونوں نے مل کر اس بے چارے کی گردن دبا رکھی ہے۔ اگر اس مار کھاتے ہوئے بچّے کی ماں نے دیکھ لیا نا تو ان دونوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دے گی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ان دونوں بچّوں کے والدین بھی آستین چڑھا کر بیچ میں آجائیں گے اور وہ حشر برپا ہوگا کہ خدا کی پناہ --- یہ منظر کوئی نیا نہیں --- غریب آبادیوں میں تو بچّوں کے جھگڑوں پر قتل تک ہو جاتے ہیں۔

لیکن سوچیے تو سہی۔ جب بڑے بھی بچّوں کی طرح لڑنے لگ جائیں گے تو بچّوں کو کون سمجھائے گا کہ لڑنا بھڑنا بُری بات ہے۔

یاد رکھیے۔ بچّوں کی لڑائی میں کبھی فریق نہ بنیے آپ کا بچّہ زیادتی پر ہو تو اس کی اصلاح کیجیے۔ اور دوسرے کا بچّہ غلطی کرے تو اُسے نرمی اور شفقت سے سمجھا دیجیے۔ اس کی شکایت اس کے والدین سے تلخی جھنجھلاہٹ غصّے میں نہ کیجیے۔ انھیں شائستگی سے بتائیے کہ بچّے کا یہ درشت رویّہ آگے چل کر خود اس کے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔

اور ہاں --- بچّوں کے چھوٹے موٹے جھگڑوں کو نظر انداز کرنے کی بھی عادت ڈالیے --- بچّے تو لڑتے ہی اس لیے ہیں کہ ابھی وہ بچّے ہیں۔!

ASHRAF PRODUCTS.

P.O. Box No. 3546 KARACHI. CABLE: TWO-IN-ONE

بناکا
سے دوہری حفاظت
دانتوں اور مسوڑھوں کے لئے
کیلشیم جی پی + فلورائیڈ
بناکا ٹوتھ پیسٹ
ٹاپ کوالٹی گول سرے والا
بناکا ٹوتھ برش
Binaca
TOOTHPASTE
120 g
CIBA-GEIGY
Binaca
سیبا گائیجی
CIBA-GEIGY